نفحاتِ سیرت



ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

صدر مرکزِ تحقیق فیصل آباد

ہدیۂ عقیدت طیب گروپ آف انڈسٹریز فیصل آباد

نفحاتِ سیرت

— تحریر —

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

صدر مرکزِ تحقیق فیصل آباد

— ترتیب —

محمد امجد قریشی

کتاب — نفحاتِ سیرت

تحریر — ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی
صدر مرکز تحقیق فیصل آباد

ترتیب — محمد امجد قریشی

زیرنگرانی — صاحبزادہ عطاء المصطفیٰ نوری

ناشر — البغداد پرنٹرز
جامعہ قادریہ رضویہ مصطفیٰ آباد سرگودھا روڈ فیصل آباد، پاکستان
Ph: 0092-41-8788807
Mob: 0092-300-8660128
Email: ab_printers007@yahoo.com

سرورق — عدیل الرحمٰن اطہر

کمپوزنگ — سعید احمد

اشاعت — اول 2013

ہدیہ عقیدت
طیب گروپ آف انڈسٹریز فیصل آباد

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحریر کا حسن یہ ہے کہ وہ مرقع صداقت ہو، تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ سراپا صدق شعار وہی تحریر ہوتی ہے جس کا ہر لفظ حقیقت کا عکاس ہو یہ بھی حقیقت ہے کہ سیرت رسول رحمت ﷺ سے بڑھ کر کوئی تحریر اس معیار پر پوری نہیں اُترتی ، یہاں صداقت درکار ہے کہ کائنات کے عظیم تر وجود کا تذکرہ ہے، صادق وامین ﷺ کا ذکر تقاضا کرتا ہے کہ کوئی بیان بھی راہ راست سے ہٹ کر نہ ہو اور کوئی انتساب بھی غیر یقینی نہ ہو، اس حوالے سے ہر دور اور ہر زبان میں سیرت رسول اکرم ﷺ رقم ہوتی رہی، کہیں سوانح کی قید کے ساتھ سیرت لکھی گئی تو کہیں سیرت کے تابناک پہلوؤں کو حسبِ استطاعت تحریر کیا گیا، یہ بارگاہ عظمت ورفعت ہے، اس کا حق ادا کرنے کی استطاعت نہیں، صرف حاضری دربار ہی سب کا مقصد ہے۔ میرے والد محترم ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی مدظلہ کا قلم بھی نوعمری سے ہی سیرت کے بیان کے لئے وقف رہا ہے، سینکڑوں مضامین اور بیسوؤں مقالات لکھے جن کے موضوعات بھی مختلف تھے اور تقاضے بھی متنوع تھے، والدگرامی مسلسل لکھتے رہے مگر یہ افسوس رہا کہ ان مقالات کی ترتیب وتجمیع پر توجہ نہ دی گئی اس طرح زیادہ تر مواد منتشر رہا اور نایاب بھی ہوگیا۔

میں نے کوشش کی کہ ان جواہر پاروں میں سے جس قدر بھی دستیاب ہوجائیں، اکھٹے کر دیئے جائیں کاوش اور لگن سے چند مضامین اور مقالات ترتیب دے دیئے گئے جو قارئین کے ذوق مطالعہ کے لئے حاضر ہیں، یہ مجموعہ مشتے از خروارے کے مصداق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو مزید مقالات بھی تدوین کے مراحل سے گزر کر نذر قارئین ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ پروردگار، رحمت عالمین ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے والدگرامی کو صحت وتندرستی سے نوازے تا کہ اُن کا فیضان تا دیر جاری رہے آمین

مرتب
محمد امجد قریشی

انتساب

سیرتِ رسول ﷺ سے کسبِ فیض کی
خواہش رکھنے والے ہر قاری کے نام

فہرست

فہرست

فہرست

نبوت کی ضرورت واہمیت

یہ کائنات جس کا ایک مکین انسان ہے رنگارنگ مناظر اور ان گنت مظاہر پر مشتمل ہے، عقل وشعور کی بے پناہ وسعتیں بھی صدیوں کی کاوشوں کے باوجود ان کا احاطہ نہیں کرسکیں، انسان نے ہر دور میں اپنے مبداء ومعاد کے بارے میں سوچا ہے، متعدد سوال ہر صاحب فکر کو متوجہ کرتے رہے ہیں، یہ سجی ہوئی کہکشاں کیا ہے؟ یہ کب سے اسی طرح جگمگا رہی ہے؟ اس کو پیدا کرنے والی اور پابند آداب رکھنے والی قوت کونسی ہے؟ یہ تخلیق کس کی ہے؟ اس تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ یہ عناصر کی کارفرمائی کیا ہے؟ ان عناصر کو ترتیب وترکیب کون عطا کرتا ہے؟ ان میں زندگی کیسے تڑپنے لگتی ہے؟ اس حسن ترکیب کو کون حدود آشنا رکھتا ہے؟ یہ لاتعداد صدیوں کا مربوط نظام کیسے قائم ہے؟ یہ سلسلہ ہست وبود کب سے رواں دواں ہے اور کب تک اسے برقرار رہنا ہے؟ اس تمام کائنات کا مدبر ومنتظم کون ہے؟ کس کا حکم کُن کی سطوت رکھتا ہے فیکون کا معیار کس کا ترتیب دیا ہوا ہے؟ حفیظ جالندھری کو بھی ان سوالات نے گھیرا تھا اس لئے وہ پکار اٹھا تھا۔

طلسم کن سے پیدا بزم ہست وبود ہو جانا
اشارے سے ہی موجودات کا موجود ہو جانا
عناصر کا شعور زندگی سے بہرور ہونا
لپٹ کر آب وباد وخاک وآتش کا بشر ہونا

یہ کیا تھا؟ کس لئے کس کے لئے تھا مدعا کیا تھا
یونہی تھا یا کوئی مقصد تھا آخر ماجرا کیا تھا

پھر یہ سوال کہ اس محیطِ جاوداں میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ بھی ایک عنصر ہے اور عناصر کی طرح ہی پابند، یا کیا اسے اختیار کا امتیاز حاصل ہے؟ یہ سوال بھی بار بار انسانی فکر وشعور پر دستک دیتا رہا کہ وہ مجبور ہے یا مکمل طور پر بااختیار؟ جبر وقدر کے متضاد میلانات نے انسان کو تقسیم در تقسیم کے عمل سے بھی کئی بار گزارا، عقل ودانش نے بساط بھر ان سوالوں کا جواب دیا مگر جلد ہی بے یقینی نے اعتماد کو لرزا دیا، دین ان سوالات کے جواب مہیا کرتا ہے اور فکری اضطراب سے نجات بھی دلاتا ہے۔

تاریخ دانش کا ورق ورق گواہ ہے کہ ناپائیدہ وجود کسی مستحکم فیصلے تک نہ پہنچ سکا اسکی وجہ ذرائع علم کی محدودیت بھی ہے خواہشات کی جلترنگ بھی ہے اور اساسی طور پر فکر کی نارسائی بھی ہے انسان کی ساری کائنات ان حواس کے ذریعے قائم ہوتی ہے جو اس کی تخلیق کا جوہر ہیں، حواس جنہیں عمومی طور پر پانچ سمجھا گیا ہے انسان کے شرف کے ضامن ہیں، مدرکات حواس کا علم انسانی ذہن میں ترتیب پاتا ہے اور ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے اسے عقل یا مدرکہء نفس کہا گیا ہے، عقل ایک ایسا امتیاز ہے جو انسان کو اشرف المخلوق ہونے کی نوید سناتا ہے مگر سوال پھر بھی برقرار ہے کہ کیا یہ امتیاز کفایت کرتا ہے، خود عقل پرستوں نے اسکی حتمیت تسلیم نہیں کی اس لئے کہ اس کا سارا انحصار حواس پر ہے اور حواس کی کوتاہیاں اور نارسائیاں سب پر عیاں ہیں۔ عقل میں تو پانچ حسوں کی نارسائیاں موجود ہیں تو پھر یہ کیسے مقصودِ منزل بن سکتی ہے اس

لئے تو علم وفلسفہ کے شناور حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

صلاحیتوں کا یہ جبر کیا انسان کو توحید فکر اور یکتائی خیال مہیا کرسکتا ہے؟ حواس وعقل کے سہارے حق کی تلاش کا یہ عمل صدیوں سے جاری ہے اور ہنوز روز اول ہے ہر ذی شعور کا مشاہدہ ہے کہ مادی ذہنوں سے اس سفر کا انجام ناتمام ہی رہا اور ہر تلاش کی منزل سراب ہی رہی سوچیئے ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ انسان نے سارا انحصار اس فکر اور سوچ پر کیا جو خود ناتمام ہے، بعض راہ یاب انسانوں نے عقل سے آگے بھی منزل تلاش کر لی جسے وہ وجدان کہنے لگے، وجدان کی وسعت اور قوت کار سے انکار مشکل ہے کہ اس کی برکات بار بار عیاں ہوئی ہیں وجدان عقل سے زیادہ معاون ہے کہ حقیقت تک رسائی کا اہتمام کرے بہت سے برتر مقام کے افراد اس مقدرت کے دعوے دار ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ شاید درست دعویدار ہیں مگر اس کشادہ راہ پر چلنے والے اور مضبوطی سے پیش رفت کرنے والے ایک مقام پر جا کر سرگرداں ہو جاتے ہیں کہ وہاں پرواز کی کوتاہی راہ کاٹتی ہے، اس بندش کے پیش نظر بعض خوش نصیب افراد اس سے دور جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں وہ منزل ماورای وجدان ہے کہ جہاں وجدان بھی سجدہ ریز ہو جاتا ہے اس قدر بلند ہمت بعض اوقات اسی کو آخری منزل سمجھ لیتے ہیں مگر دیدہ وروں پر اس کی بعض لغزشیں آشکار ہوتی ہیں تو وہ اس سے آگے کا سوچنے لگتے ہیں یہاں بڑے بڑے دیدہ ور کم نگہی کا شکار ہو کر سر رکھ دیتے ہیں یہی وہ مقام ہے جہاں سے نبوت کی حدود شروع ہوتی ہیں نبوت راہ یابی کی وہ توفیق ہے جو

مسلسل سفر یا ان تھک کوشش سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس منصب ومقام کو خالق نے خود تخلیق کیا ہے کہ ارحم الراحمین اپنی مخلوق بلکہ عظیم تر تخلوق کو ایسی بلندیوں پر بے توفیق نہیں چھوڑتا۔

نبوت کا لغوی معنیٰ ارتفاع ہے یعنی رفعت وسربلندی اگرچہ بعض نے نباء سے مشتق مانا ہے جس کا معنیٰ خبر دینا ہے

علامہ راغب الاصفہانی (م ۵۰۲ھ) المفردات میں لکھتے ہیں

"النبأ خبر ذو فائدة عظيمة يحصل به علم أو غلبة ظن" (المفردات)

یعنی نباء ایسی خبر کو کہتے ہیں جو عظیم فائدہ کی حامل ہو جس سے علم یا ظن غالب حاصل ہو علامہ راغب رقمطراز ہیں کہ نبوت دراصل اپنے اصطلاحی مفہوم میں اس سفارت کو کہتے ہیں جو خالق اور اصحاب عقل کے درمیان ہوتی ہے تا کہ معاش ومعاد کے حوالے سے علم عطا ہو نبی قوم کی جانب خالق کا پیغام لاتا ہے جس سے فکر و دانش کی گھتیاں سلجھائی جاتی ہیں جن کا سلجھانا انسانی حواس کے بس میں نہ ہو، حقیقت الامر یہی ہے کہ انسان اپنی برتر عقلی حیثیت کے باوجود بعض حقائق تک رسائی پانے سے قاصر رہتا ہے اس سے اسکے ہاں انتشار ذہنی جنم لیتا ہے اور وہ شرف وعظمت کے اس مقام سے گرنے لگتا ہے جس کا اسے استحقاق بخشا گیا تھا خالق اپنی اس مخلوق کو جسے اس نے خود تکریم کا تاج پہنایا تھا سافلین کی جانب لڑھکتا نہیں دیکھ سکتا یہ بنیادی نکتہ نظر انداز نہیں ہونا چاہیے کہ خالق کو اپنی مخلوق سے پیار ہے جب وہ مادی بے بسی میں رہنمائی فرماتا ہے تو روحانی منزل میں کیسے بے توفیق چھوڑ دے گا، عام مشاہدہ ہے کہ زمین کا سینہ جب تپش اور حرارت سے آگ بگولا ہو جاتا ہے اور روئیدگی کے مناظر

مٹنے لگتے ہیں اور یہ کہ جب زمین سے اُچھلتا ہوا چشمہ آب خشک ہونے لگتا ہے تو وہ رحیم وکریم خالق کس قدر دور سمندروں سے بادل اٹھاتا ہے اور دیدہ امید کو سیراب کردیتا ہے زمین کا سینہ العطش پکارنے لگے تو بقول علامہ اقبال زاد بحر اور پروردہ خورشید بادلوں کا امڈتا ہوا چشمہ کرم دستگیری کرتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ سینہ ارض کو سیراب کرنے والا خالق انسانی سینوں کو کفر وشرک کے آتش کدوں میں جھلستا ہوا چھوڑ دے، یہی احتیاج نبوت کی ضرورت کی سب سے بڑی دلیل ہے اس لئے کسی خطہ زمین کو بھی اس سے محروم نہیں رکھا گیا، ارشاد ہوا۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿٢٤﴾ (الفاطر:24)

ترجمہ: اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔

تخلیق انسان کا واقعہ جو الہامی کتابوں میں بھی روایت ہوا اور دیگر نوشتوں میں بھی موجود ہے اس کی نہایت واضح صورت وہ ہے جسے قرآن مجید نے ذکر کیا، آدم علیہ السلام کو جب زمین پر اتارا گیا تو آپ نیابت کے منصب پر فائز ہو چکے تھے اب ضرورت مادی کفالت کی تھی اس لئے صراحۃ اس کا ذکر کردیا گیا۔

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾ (البقرۃ:36)

ترجمہ: ''اور تمہارے لئے زمین میں مستقر یعنی جائے قرار بھی ہے اور قیامت تک کے لئے سامان زیست بھی''۔

قیامت تک کے لئے مادی ضرورتوں کو فراہم کرنے والا خالق روحانی، اخلاقی اور انسانی ضرورتوں کو کیسے نظر انداز کرسکتا تھا، اس نے تخلیقی مراحل سے گزارنے کے ساتھ ہی نبوت کی راہنمائی مہیا کردی تھی اور ہدایت عطا کرنے والے

انبیاء کرام علیہم السلام کا ایک سلسلہ بھی قائم فرمایا تھا اگرچہ مفادات کا اسیر اور انا پرستی کی دلدل میں غوطہ زن انسان، رہنمائی کے اس مقدس سلسلے سے روگرداں ہوتا رہا اسے اپنی محرومیت کا احساس نہ رہا وہ بھول جاتا رہا کہ اس کی فکر کس قدر رسا بھی ہو وہ عقل ودانش کے بلند تر مقام پر بھی فائز ہو بھٹکنے گمراہ ہوجانے کا خطرہ ہمیشہ موجود رہتا ہے وہ ہزار دعویٰ سرفرازی کے باوجود ان فرستادگان رب کا محتاج ہے؟ دنیا کی تاریخ کا عمیق مطالعہ واضح کررہا ہے کہ انسان کسی حالت میں بھی ہو اس کے شعور ووجدان میں نسبتِ نبوت کا خیال ہمیشہ قائم رہا ہے انبیاء کرام علیہم السلام میں سے چند ایسے ہیں جن کے نام تاریخ میں موجود ہیں بعض کے حالات زندگی بھی محفوظ رہے ہیں مگر وہ راہنمائے قوم جن کا کسی نوشتۂ الہام یا ارشادِ نبوت میں ذکر نہیں ان کے ماننے والوں میں بھی یہ جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا کہ وہ ان کو نبوت کے منصب کا حامل ثابت کردیں، کیا یہ انسانی کاوش اس بات کی دلیل نہیں کہ انسان کے دل ودماغ میں یہ خیال ضرور پیوست ہے کہ راہنمائی کا حقیقی حق حاملین نبوت کو ہی حاصل ہے یہ بالواسطہ نبوت کی ضرورت کا اعتراف ہے۔ نبی کے بارے میں یہ عقیدہ ایمان کی اساس رہا کہ وہ وجود ہر خطاء ولغزش سے معصوم ہوتا ہے اس لئے کہ ایک خطا یا ایک غلط فیصلہ اس تعلق کو مجروح کردے گا جو امتوں کو اپنے نبی سے ہونا چاہیے اور یہ معصومیت کا اختصاص انسان کو مجبور کرے گا کہ وہ ایسے راہنماؤں کو ہی اپنا ہادی بنائے اور یہ کہ ایسا ہادی ہونا چاہیے جس سے اس قسم کی نسبت قائم ہوسکے وگرنہ شک ہر اتباع کو کمزور کردے گا، یہ یقین کہ ہادی کو ایسا ہونا چاہیے اس کی دلیل ہے کہ ایسا ہادی ہونا لازم ہے، بت پرستی کے رسیا اور شرک وکفر کے علمبردار بھی اپنے کسی نہ کسی روّیے میں نبوت کی ضرورت کا

ادراک رکھتے تھے تاریخ انبیاء کا ہر واقعہ واضح کرتا ہے کہ جب بھی کسی نبی نے اعلانِ نبوت کیا کہ وہ اپنے خالق کا پیغام بر بن کر آیا ہے تو ماحول میں ایک اضطراب ضرور پیدا ہوا بظاہر ایک وجود تھا جو اعلان نبوت کر رہا تھا مگر تخت و تاج کی لرزش بتا رہی تھی کہ یہ وجود منفرد وجود ہے، معجزات کی طلب، سازشوں کے انبار اور معاشرے سے دھکیل دینے کا سارا عمل ایک خوف کا غماز ہی تو ہے،، مقابل کے بادشاہوں اور حکمرانوں سے ٹکرانے والے بھی اس قدر ہراساں نہ ہوئے جس قدر ایک وجود محترم نے انہیں ترساں کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ انسانی وجود میں نبوت کی ضرورت و اہمیت کا یقین ازل سے موجود ہے اگرچہ بعض اوقات مفادات کے گرداب اس خیال کر چھپا رکھنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔

انسان اپنی معاشرتی حس کی وجہ سے کسی نہ کسی معاشرے کا حصہ بن کر رہنا چاہتا ہے ارسطو نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جو انسان معاشرے میں رہنے کے قابل نہیں وہ یا تو حیوان ہے یا دیوتا کیونکہ

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

یہ ربط باہم فلاح کا باعث بنے گا جبکہ اس ربط کی اساس باہمی احترام پر استوار ہوگی مگر مشاہدہ یہ ہے کہ ایک وجود دوسرے کو یا تو برداشت نہیں کرتا اور اگر اس پر مجبور بھی ہو تو بھی برابری سطح پر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے، مساداتِ انسانی کی منزل کے راستے میں حیلہ گروں اور راہزنوں کے ڈیرے لگے ہوئے ہیں اس مشکل کا حل صرف تعلیمات انبیاء علیہم السلام میں پوشیدہ ہے کہ وہاں سے ہی شرف انسانی کی

ضمانت ممکن ہے کیا اقوام عالم کی انجمنیں اس شرف کی حفاظت کر سکیں؟ اگر اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز قائم ہو گیا تو

"کُلُکُم مِنْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ"

"یعنی تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے تخلیق کیے گئے تھے"

کی حقانیت کیسے واضح ہوگی۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیمات کے اسی حسن و اختصاص کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

پیش قراں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسند دیبا یکے است

یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ایک علمبردار دانش برہانی کا آئین وضابطہ تعمیر معاشرت کا محرک ہے اسی لئے کہا گیا۔

سطوت آئین پیغمبر نگر

یہ سطوت بقائے نسل انسانی اور حفاظت شرف انسانی کی ضمانت ہے اور انسانیت کو اس سطوت کی ہمہ وقت ضرورت ہے تا کہ اعتماد کی ایسی فضا قائم ہو جو ہمہ جہت اور دیرپا ہو انسان کی زندگی جن فضائل وخصائل کی حامل ہے ان کا تجزیاتی مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ہر فضلیت اور ہر انسانی وصف کسی نبی کی نبوی حیات کا مظہر ہے آج تک مورخ کسی ایسے وصف کو تلاش نہیں کر سکا جس کو ہمہ وقت پذیرائی حاصل رہی ہو اور جو سب کی نظر میں مستحسن اور لائق تقلید ہو اور اسے نبوی نسبت حاصل نہ رہی ہو، تعلیمات نبوی نے ہی تخلیق کا راز سمجھایا، خالق کی معرفت عطا کی، حیات انسانی کو

دلپذیر تعبیر عطا کی، سفر حیات کے دھندلکے اسی نور سے کافور ہوئے اور بحیثیت انسان زندہ رہنے کا شعور اس منبع فیض سے ہویدا ہوا، خصائل وشمائل کا پورا دفتر نبوی حیات سے بارآور ہوا انسان کی جملہ صلاحیتیں جو مثبت پیش قدمی کی محرک بنتی ہیں نبوت کے فیضان کرم سے ہی فیض یاب ہوئی ہیں اور اگر انسانی معاشرہ بدعملیوں اور بدکاریوں سے متنفر رہا ہے تو یہ بھی نبوت کے وجود کا اثر ہے غرضیکہ انبیاء علیہم السلام کے وجود ہی ہر درس خیر کا ذریعہ رہے ہیں اگر انسان کو صرف ایک جانور ہی بن کر زندہ نہیں رہنا ہے اور اگر اسے مقاصد حیات تک رسائی کا عزم کرنا ہے تو اسے قدم قدم پر نبوت کی قندیل ہدایت سے کسب نور کرنا ہے۔

اگر انسان کو۔

* خالق کی تلاش ہے
* اپنی تخلیق کے رموز سے آگہی درکار ہے
* مقصود حیات اور منزل مراد سے باخبر رہنا ہے
* نظم کائنات کا اہتمام کرنا ہے
* مظاہر فطرت کا قرب اوران پر دسترس کی تلاش ہے
* جسم اور روح کے ربط کو سمجھنا ہے اوران کی بالیدگیوں کی حفاظت کرنا ہے
* حقوق وفرائض کی حد بندی کو ملحوظ رکھنا ہے
* مبدأ و معاد کے مراحل میں کامیاب رہنا ہے۔

تو اسے دامن نبوت تھامنا ہوگا کہ خالق کائنات نے نظام نبوت کو اسی لئے قائم کیا ہے کہ انسان ہر دور اور ہر مرحلہ میں برکات نبوت سے بہرہ مند رہیں۔

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے رموز بے خودی میں برملا اس کا اظہار کیا فرماتے ہیں۔

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید — وز رسالت درتن ما جاں دمید
حرف بے صوت اندریں عالم بدیم — از رسالت مصرع موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوین ما — از رسالت دین ما آئین ما

پھر خصوصیت سے نبوت خیر الانام علیہ التحیۃ والسلام کا ذکر فرماتے ہیں۔

حلقہ ملت محیط افزا استے — مرکز او وادی بطحا ستے
ما ز حکم نسبت او ملتیم — اہل عالم را پیام رحمتیم

انسان کو ہر لمحہ نبوت کی راہنمائی درکار ہے کہ وہی راہنمائے حیات ہے نبی کا وجود ہی اسوۂ حسنہ ہے کہ نبوی تعلیمات ہی انسانی لغزشوں سے محفوظ ہیں اور یہ کہ نبوی حیات، حالات کی پیداوار نہیں، تاریخ گواہ ہے کہ ایک نبی کی ذات ہی پورے معاشرے میں انقلاب لانے کا سبب بنی ہے نبی حالات سے نہیں سیکھتا حالات کو راستی عطا کرتا ہے علم ودانش کے پیکر انسان کے لئے ضرور راہنما رہے مگر نبوی تعلیمات نے ہی انسانیت کا اصلی جوہر نکھارا ہے کیا عجب منظر ہے کہ نبی امی لقب ہے مگر صاحب ام الکتاب ہے۔

امی ونکتہ دان عالم

اور بقول حبیب آقانی

الذی ردّت الیہ الشمس وانشق القمر۔ کَانَ اُمِّیًّا وَلٰکن عِنْدَہٗ اُمُّ الکتاب۔

نبی اکرم ﷺ سلسلہ نبوت کے خاتم ہیں اور منصب رسالت کے تاجدار ہیں اس لئے آپ کی نبوت سلسلہ انبیاء کی معراج ہے، انسانی فلاح کا سارا اہتمام

اپنے عروج پر ہے اب صرف اور صرف ایک وجود ہے جو پیغام رسانی کی تکمیل کا نشان بھی ہے اور عروج آدم خاکی کا آخری اور لازمی وسیلہ بھی، اسی لئے اب سلسلہ نبوت ختم ہوگیا کہ نبوت آخری حد تک آگئی، اب کسی اور کی تلاش نہ ہوگی کہ دربدری ختم ہوئی ایک امام ایک راہنما ایک اسوہ اور سب سے بڑھ کر ایک نجات دہندہ اب سب کی ضرورت بھی آپ ہیں اور سب کے لئے دارین میں کامرانیوں کا ذریعہ بھی آپ ہیں علامہ مرحوم ہی سے سنتے ہیں۔

قلب مومن را کتابس قوت است — حکمتش حبل الورید ملت است
دیں فطرت از نبی آموختیم — درره حق مشعلے آفروختیم
پس خدا برما شریعت ختم کرد — بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را — او رُسل را ختم و ما اقوام را
لانبی بعدی زاحسان خدااست — پرورده ناموسِ دیں مصطفی است

پروردگار عالم کا احسان ہی تو ہے کہ اس نے مخلوقات میں سے ایک انسان کو خصوصی احسانات سے نوازا، مخلوقات کے ان گنت مظاہر خالق کی واحدنیت قیومیت اور ربوبیت پر شاہد ہیں کس طرح اس نے کائنات میں بوقلمونی اور تنوع کا ظہور فرمایا مگر سب عناصر و مظاہر کو ایک حکم کے تحت رکھا کہ جہاں نصب کردیا وہاں ہی گردش کناں رہا ان میں نہ انحراف کی صلاحیت ہے اور نہ اپنی حد بندی سے نکلنے کی گنجائش ہے اس لئے کہ ان میں قوت اختیار نہیں صلاحیت کار ہے اسی سبب وہ مواخذے یا حساب وکتاب کے سزاوار نہیں انسان کو کیونکہ اختیار عمل، اقرار وانکار، ایمان وکفر، سنورنے یا بگڑنے کی قوت دی گئی اس لئے اس کا محاسبہ بھی لازم ٹھہرا۔ احتساب کی

بندش نے انسان کو راستی کی تلاش کا شعور دیا اور اس نے بہت سے مراحل طے بھی کئے مگر اس کی بے توفیقی یہ رہی کہ اسے اپنے حوالے سے بھی مکمل باخبری حاصل نہ ہوسکی کہ کس قدر صلاحیتیں اس میں ودیعت کی گئی ہیں کون کون سا جوہر اس کی تعمیر میں رکھا گیا خودشناسی کا مسئلہ بھی اس سے بحسن خیر حل نہ ہوسکا، کبھی اس نے ہمہ شیطان ہونے کا سوچنا شروع کیا تو کبھی چند مادوں سے ترکیب پایا ہوا وجود خیال کیا اور کبھی تو اس قدر فکری افلاس کا شکار ہوا کہ بندر بننے میں کوئی قباحت محسوس نہ کرنے لگا یہ خودشناسی کا وہ خلجان ہے جو انسان کو مضطرب رکھتا رہا نبوت کا سلسلہ اس قادر وقیوم ذات نے قائم کیا جو علیم وخبیر بھی ہے اور حکیم وبصیر بھی، اسے خبر ہے کہ اس آدم زاد میں کیا کیا صلاحیت اور قوت رکھی گئی ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کس حد تک خود اعتمادی پر انحصار کرسکتا ہے اور کہاں سے اس کو خالق کی راہنمائی کی احتیاج ہے، نبوت دراصل خالقِ کائنات کی اس تدبیر کا اظہار ہے جو اس نے اپنی اشرف مخلوق کے لئے خود تیار کی اس لئے نبی بنتا نہیں مبعوث کیا جاتا ہے نبی اس علیم وحکیم رب کی رضا کو عملی طور پر نافذ کرنے کا وسیلہ ہوتا ہے اس کی اطاعت اطاعت الٰہی اور اس کا اتباع فرمان الٰہی کی ہی تعمیل کا عکس قرار پاتا ہے بندہ اپنے رب سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اس لئے وہ کبھی بھی نبوت کے واسطے سے انکار نہیں کرسکتا، بندگی کی ضرورت ہے کہ نبوت کے مقام کو سمجھا جائے اور اس کو تسلیم کرکے اطاعت شعاری کا سلیقہ اختیار کیا جائے۔

یہ سوال بھی لائق توجہ ہے کہ انسان نبوت اور نبی کی شناخت کیسے کرے تو اسی کے لئے نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے خود پروردگار نے یہ حقیقت واشگاف کردی اور ارشاد ہوا کہ اے نبی محترم ﷺ آپ فرما دیجئے کہ

فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِيۡكُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶﴾ (یونس:16)

ترجمہ: پس یقیناً میں اس سے قبل تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم عقل نہیں رکھتے

واضح کر دیا گیا کہ اعلان نبوت سے قبل لوگوں کے درمیان ایک عمر گزاری گئی ہے کیا یہ دلیل نہیں کہ اب جو دعویٰ کیا جا رہا ہے وہ اسی طرح کا سچا دعویٰ ہے جیسا کہ پہلی زندگی میں مشاہدہ کیا جا چکا ہے، اعلان نبوت کی صداقت کے لئے اعلان سے پہلے کی زندگی کو دلیل بنایا گیا اس سے ماقبل اعلان زندگی کی عظمت وسطوت کا اظہار ہو گیا زبان سے یقین دلانا کہ نبی ہوں، عقلی دلائل قائم کرنا اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے مگر کتاب زیست کا ورق ورق جو شہادت دے اس سے بڑھ کر تو کوئی شہادت نہیں، کیا کسی غیر نبی نے ایسا دعویٰ کیا، کیا ایسا اعلان ممکن بھی تھا پرائیوٹ زندگی کو ذاتی حصار کا تحفظ دے دیا جاتا ہے اس لئے بڑے سے بڑا راہنما بھی کامل نمونہ نہیں بن سکا مگر نبی تو اپنے شب وروز کو یکساں عیاں کر دیتا ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ نبی کا ہمہ تر وجود پناہ ربانی میں ہے اس لئے انسان ایسے محفوظ وجود سے ہی ہدایت کشید کر سکتا ہے، ہر وہ انسان جسے اپنی زندگی کو بہر نوع معیار انسانیت کے مطابق ڈھالنا ہے نبوت کی تعلیمات اور نبی کی ذات اس کی لازمی ضرورت ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم علم وحکمت کے میدان میں اس قدر باریاب نہ تھے جس قدر کئی اور وجود نظر آتے ہیں مگر ان کی منزلت اور عظمت سب کو خیرہ کر رہی ہے اس لئے کہ وہ مطلع ہدایت سے مستنیر ہوئے ان کے ایقان کی پختگی اور تسلیم ورضا کا استحکام ہر آنے والے کو دعوت دے رہا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہو جانا چاہتے ہو تو قاسم نعمت ﷺ کی اطاعت کو لازم کر لو یہی ان کی ضرورت تھی اور یہ ہر نسل کی ضرورت ہے ضرورت نبوت کا درست

شعور انسانی زندگی کو اس قدر عظیم تر کر دیتا ہے کہ وہاں بڑے بڑے انسان سرخمیدہ ہو جاتے ہیں اس اتباع کی اہمیت دیکھئے کہ۔ بوریا نشیں مسند نشیں ہوئے۔ آداب سے ناآشنا معلم آداب بنے۔ علم کی دولت سے محروم بستی مرکز علم بنی۔ جو خود راہ پر نہ تھے دوسروں کے راہبر بنے۔ انسانی شرف سے محروم شرف انسانیت کے نقیب کہلائے۔ جنہیں ایک قبائلی ریاست قائم کرنے کی توفیق نہ تھی عالمی ریاست قائم کرنے کے اہل قرار پائے۔ نبوت کے لزوم کو تسلیم کرنے والے غلام ہو کر بھی آقا کہلائے۔ انکار کرنے والے ابوالحکم ہو کر بھی ابوجہل بنے۔ زندگی کی حکمتوں سے بے بہرہ حیات شناسی کی خیرات بانٹنے لگے غرضیکہ ایک ایسا انقلاب آیا جس نے عظمت کا پیمانہ بدل ڈالا۔ یہ انقلاب وقتی نہ تھا اور نہ ہی اس کے اثرات لمحاتی تھے ایک دائمی انقلاب جو ہر لمحہ ظہور پذیر ہونے کے لئے تیار، شرط صرف یہ کہ انسانی دانش کے اس وجوب کو تسلیم کر لیا جائے جو ہر دور کا امام ہے اس قدر بے بدل کہ

حرف اورا ریب نے تبدیل نے

معنی اش شرمندہ تادیل نے

آج انسانیت جو باہم دست وگریباں ہے ایک مسلسل کہرام کی زد پر ہے ہر نیا دن ظلم کی نئی داستانیں سناتا ہے، ہر انسان حرص ولالچ کے گرداب میں یوں غرقاب ہے کہ کسی خیر کی توقع ناممکن دکھائی دینے لگتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کا انسان شاخ نازک پر آشیانے بنا رہا ہے اُسے خبر نہیں کہ

؎ تیری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی

اس لرزش زدہ ماحول اور اس آسیب زدہ معاشرت میں مایوسیاں جنم لے

رہی ہیں اور انسان پھر دورِ جاہلیت کی طرف جا رہا ہے ایسے بے یقین ماحول اور ایسے بداعتماد معاشرے کو اگر پھر سے راستی درکار ہے تو اسے اس لے حجازی کی طرف بڑھنا ہوگا جو اس کی ضرورت بھی ہے اور جس میں اس کی بقا کا راز بھی مضمر ہے۔

علامہ ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تجویز کردہ نسخہ ہر دور کی ضرورت ہے اور اس کی اہمیت وافادیت کا ہر زمانہ معترف ہے اس لئے آپ کے نسخہء شفا پر گفتگو کا اختتام کرتے ہیں

وان قنطت من العصیان نفس۔ فباب محمد باب الرّجاء

مایوسیوں میں گھرے ہوئے مضطرب انسان کے لئے امید کا دروازہ ایک ہی ہے اور وہ باب نبوت ہے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر بند ہو چکا ہے آیئے اس دروازے پر جبیں عقیدت خم کریں ہم ایسے سیاکاروں کی ضرورت یہی باب رحمت ہے۔

ایمان بالرسالت

اللہ تعالیٰ کا ہزار بار شکر ہے کہ اُس نے ہمیں آنحضرت ﷺ کی امت میں ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے۔ یہ احسان عظیم ہے۔ حضور علیہ السلام کی ولادت اور بعثت کائنات پر اللہ تعالیٰ کی خاص نوازش ہے خود اللہ تعالیٰ نے اس کا تذکرہ بدیں الفاظ فرمایا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا (آل عمران: 164)

بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان فرمایا جب اُن میں ایک رسول معظم ﷺ مبعوث فرمایا۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے عالم انسانیت پر آپ کی ذات کے حوالے سے چند اعتقادات ضروری ہوگئے ہیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم پر کچھ فرائض وواجبات نظری ہوں یا علمی عائد ہوتے ہیں جن کو تسلیم کرنا اور اُن کے عملی اظہار کی کوشش کرنا ایمان کی شرائط میں سے ہے۔ یہاں ایمان بالرسالت کے بارے میں چند گذارشات پیش کی جا رہی ہیں تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ نبی اکرم ﷺ پر ایمان کن کن تقاضوں پر محیط ہے۔

1 اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر نبی اور رسول مبعوث فرمائے تا کہ وہ بھٹکی ہوئی انسانیت کو جادۂ مستقیم پر لا کر وصول الی الحق کا فریضہ انجام دیں۔ انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ تعلیمات میں تبدیلی ہوتی رہی تا آنکہ وہ وقت آ گیا جب قدرت نے انسانوں پر دائمی تعلیمات کا فیضان

فرمایا۔ایمان بالرسالت میں سب سے مقدم بات یہی ہے کہ ہم حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا فرستادہ تسلیم کریں۔ شخصی احترام، ذاتی عظمت یقیناً ایمان کا تقاضا ہے لیکن اصل مطالبہ محمد بن عبداللہ کی بجائے محمد رسول اللہ پر ایمان کا ہے۔اگر ایک انسان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عظیم سے عظیم تر بھی تسلیم کر لے مگر آپ کی رسالت پر ایمان نہ لائے تو قابل التفات نہ ہوگا جیسا کہ اکثر غیر مسلم اکابر کا طریقہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو تو متعارف ہی محمد رسول اللہ یا رسول من اللہ کہہ کر کرایا ہے تاکہ کوئی ابہام نہ رہے۔

2 حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کی طرف سے مبعوث تسلیم کرنے کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ہم آپ کی تعلیمات کو احکامات الٰہیہ تسلیم کریں گے کیونکہ جب ایمان کی نوعیت یہ ہوگی کہ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم:3-4)

تو آپ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کو اللہ تعالیٰ کے حکامات ماننا پڑے گا۔ظاہر ہے کہ اسلام کی تمام تعلیمات آپ ہی نے ارشاد فرمائیں اور دنیا نے آپ کو ہی موقع محل کے مطابق احکامات نافذ کرتے دیکھا ہے مگر ان احکامات پر عمل سے قبل اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ ہم صدق دل سے یہ مانیں کہ آپ نے جو کچھ بھی فرمایا ہے، وہ منزل من اللہ ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

بلکہ ایسا تسلیم نہ کرنا نفی ایمان پر دلالت کرتا ہے۔

گرچہ قران از لب پیغمبر است

ہر کہ گوید حق نہ گفت و کافر است

آج کے اس دور میں جب کہ انسانی عقل وشعور پر اعتماد ضرورت سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے یہ خدشہ عام ہے اور مستشرقین کی تصنیفات نے یہ شبہات پھیلا دیئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کو آپ کی ذاتی حسنات کے طور پر پیش کیا جائے اور ایک انسانی کاوش قرار دیا جائے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ جب قوم ان مقدس تعلیمات کو انسانی ذہن کی پیداوار سمجھنے لگے گی تو آہستہ آہستہ یہ باور کرانے میں کوئی چیز حائل نہ رہے گی کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے اختلاف کا حق ہے خواہ وہ انسان کتنا عظیم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اسلام کے خلاف ایک سازش ہے جو مدت سے یورپ کے زرخیز دماغوں میں تیار ہو رہی ہے۔اس لئے ایمان بالرسالت کی اس شق کو پوری شدت کے ساتھ تسلیم کرنا نہایت ضروری ہے۔یہاں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا وہ واقعہ عرض کرنا مناسب ہوگا جس میں آپ فرماتے ہیں کہ میری عادت تھی کہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو کچھ سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا۔ایک مرتبہ چند احباب نے مجھے اس سے روکا اور کہا کہ اے ابن عمرو یہ بات مناسب نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر وقت ایک کیفیت میں ارشادات نہیں فرماتے آپ کبھی خوشدلی کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی کسی پر خفگی کا اظہار ہوتا ہے۔غرضیکہ ہر موقع تعلیمات کا نہیں ہوتا۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے لکھنا چھوڑ دیا ایک مرتبہ میں حضور علیہ السلام کے ہاں حاضر تھا آپ نے پوچھا اے عبداللہ تم تو لکھا کرتے تھے اب کیا بات ہے آپ نے وہ سارا واقعہ بیان فرما دیا کہ میں نے اس خوف سے لکھنا ترک کر دیا ہے کہ مبادا کوئی غیر متعلق یا غیر ضروری بات درج کر جاؤں۔ آپ ﷺ نے اس پر فرمایا اے عبداللہ رضی اللہ عنہ تم لکھا کرو۔اس منہ سے جو کچھ نکلتا ہے حق ہوتا ہے۔

(مسند ابزار جلد:6 حدیث نمبر 2470)

کیا کوئی انسان اپنی تمام عظمتوں کے باوجود یہ دعویٰ کرسکتا ہے یہ دعویٰ دلیل ہے کہ آپ کی زبان پر حق کا فرمان ہی جاری ہوتا ہے۔

3 اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی نبوت کے اعلان کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی فرمادیا کہ آپ صرف نبی اور رسول ہی نہیں آخری رسول بھی ہیں یعنی وہ سلسلہ جو حضرت آدم علیہ السلام سے انسانوں کی راہنمائی کے لئے منصوص من اللہ تھا آپ کی ذات اقدس پر اپنے اتمام کو پہنچا ہے اور آپ کی تشریف آوری کے بعد کسی اور نبی یا رسول کے آنے کا امکان نہیں ہے۔ آپ کے بعد ہر قسم کا مدعی قابل نفرین اور مستوجب سزا ہے۔ وحی والہام کا سلسلہ منقطع ہے اس لئے جو تعلیمات آپ ہر نازل ہوگئی ہیں وہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قابل حجت اور لائق عمل ہیں۔ اُن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کہ ارشاد کردہ ہیں۔

لا تبدیل لکلمات اللہ۔ (الروم: 30)

یہاں ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے کہ جب سلسلہ نبوت ختم ہو گیا تو اب وہ تعلیمات جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئیں ہیں ہمیشہ کے لئے واجب الاتباع قرار پائیں ہیں تو لامحالہ اُن تعلیمات کو انسانوں کی ہمیشہ کی ضروریات کا کفیل ہونا چاہیے اور ہر زمانے میں اور ہر مقام پر واجب الانقیاد اور قابل عمل ہونا چاہیے بالفاظ دیگر ان تعلیمات کو جامع ہونا چاہیے چنانچہ ایسا ہی ہے قرآن پاک نے تعلیمات کی جامعیت اور حتمیت پر بہت زور دیا ہے اور ان پر عمل پوری انسانیت کے لئے باعث فوز وفلاح قرار دیا ہے۔

4 تعلیمات کی جامعیت کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ صرف اور صرف ان تعلیمات کو ہی اپنے اعمال ونظریات کا پاسبان بنایا جائے یہی معیار فلاح ہیں اور یہی خوشنودی الٰہی کا

باعث ہیں۔ ان میں کسی قسم کا جک واضافہ، قطع وبرید یا کوئی پیوندکاری ممکن نہیں ہے۔ تعلیمات اسلامیہ کی موجودگی میں دوسری تمام تعلیمات لائق التفات اور قابل قبول نہیں ہیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (ال عمران: 85)

اور جو اسلام کے علاوہ دین کی پیروی کرے گا وہ ہرگز اُس سے قبول نہ کیا جائے گا۔

اب صرف ایک معیار ہے کہ

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

(الحشر: 7)

اور جو تمہیں رسول رحمت دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں رُک جاؤ۔

جن اعمال پر عمل کا حکم ہے اُن پر مضبوطی واستقامت سے عمل پیرا ہونا اور جن سے رکنے کا حکم ہے اُن سے اجتناب کرنا مومن کی پہچان ہے۔ اور اس اخذ وترک میں۔ واتقوا اللہ۔ کی قید موجود رہے گی ورنہ انّ اللہ شدید العقاب کی تبدید کا مستوجب ہوگا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

فاذا نهيتكم عن شيءٍ فاجتنبوه اِذا اَمرتكم بامرٍ فاتوا منه مااستطعتم۔ (صحیح البخاری کتاب الاعتصام)

جب میں تمہیں کسی کام سے روکوں تو اُس سے اجتناب کرو اور جب کسی کام کا تمہیں حکم دوں تو اُس کو جس قدر استطاعت ہے بجالاؤ۔

کیونکہ اتباع حضور ﷺ ہی اطاعت الٰہی ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: 80)

جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔

ایک اور مقام پر فرمایا۔

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ (ال عمران:31)

کہہ دیجئے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اطاعت کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

خود حضور ﷺ نے فرمایا۔

لا یومن احدکم حتّٰی یکون ھَوَاہُ تبعاً لما جئت بہ

(کنز العمال حدیث:1084)

تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی خواہشات میرے لائے ہوئے احکام کے تابع نہ ہو جائیں۔

ھَوَاہُ کا لفظ اشارہ کر رہا ہے کہ صرف اعمال میں ہی نہیں بلکہ قلب انسانی میں موافقت بھی موجود ہو۔ دنیا میں ہوسکتا ہے کہ ہم کسی کی اطاعت کا اظہار کریں مگر دل سے اِس انقیاد پر پریشان ہوں یا بددلی کا شکار ہوں لیکن اطاعت رسول ﷺ میں اس پریشان نظری کا کوئی مقام نہیں ہے۔ قرآن پاک نے تو یہاں تک فرمایا کہ آپ کے فیصلہ کے خلاف تمہارے دلوں میں بھی اشتباہ پیدا نہیں ہونا جائے ورنہ ساقط الایمان ہوگے اس لئے تصدیق قلب کے ساتھ آپ کی تعلیمات کو اپنے لئے ذریعہ نجات تسلیم کرنا فلاح و کامرانی کی شرط اول ہے۔

خلاف پیمبر کسے راہ گزید

کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

یہاں اس ابہام کا ازالہ کر دینا ضروری ہے کہ مومن کی زندگی ثنویت کا شکار

نہیں ہوسکتی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مختلف انسانی کاوشوں سے حسب ضرورت استفادہ کر کے ایک ملغوبہ تیار کرلے اور اُسے اپنے لئے راہ نجات مان لے۔ اسلام میں ایسا نہیں ہوسکتا اس میں چرچ کا حصہ "چرچ کو اور قیصر کا حصہ قیصر کو" کی دوئی کا کوئی مقام نہیں ہے یہاں سب کچھ اللہ کا ہے اور سب کچھ تعلیمات اسلامیہ کے زیر نگیں ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ حضور تورات کو پڑھتا ہوں تو اُس میں بہت سی اچھی باتیں ملتی ہیں کیا میں اُن سے چند حسنات کا انتخاب کرلوں۔ فرمایا کیا تم بھی یہود و نصاریٰ کی سی پریشان خیالی کا شکار ہونا چاہتے ہو یاد رکھو تم تو تورات کی بات کرتے ہو میں صاحب تورات کے بارے میں بھی یہی کہوں گا۔ کہ

لو کان موسیٰ حیا بین اظہرکم ما حل لہ الا ایتبعنی

(مسند احمد و شعب الایمان)

کہ اگر آج صاحب تورات جناب موسیٰ علیہ السلام بھی موجود ہوتے تو پیغمبر و رسول ہونے کا باوصف وہ بھی میری تعلیمات پر ہی عمل کرتے۔ غور فرمائیے تورات منزل بن اللہ کتاب ہے جس کے بارے میں خود قرآن نے کہا کہ

فِیۡهَا هُدًی وَّنُوۡرٌ (المائدہ:44)

اُس میں ہدایت و نورانیت موجود ہونے کے باوجود اس ہدایت و راہنمائی کو آنحضرت ﷺ کی تعلیمات نے منسوخ کر دیا اور آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم صحابی اور عقل و دانش کے اس پیکر جلال کو اس کے مطالعہ سے منع فرما دیتے ہیں حالانکہ

ایمان عمرؓ میں یہ تعلیمات خلل اندازی نہ کرسکتی تھیں۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اسلام مسلمان سے کیا مطالبہ کرتا ہے۔ آج ان تعلیمات کو چھوڑ کر کسی اور تعلیمات سے رابطہ کا سلسلہ کیا منشائے حضور ﷺ کے خلاف نہ ہوگا۔ کیا ان ارشادات کی موجودگی ہمیں حق دیتی ہے کہ ہم اپنے روز وشب سنوارنے کے لئے کاسہ گدائی لئے دیگر تعلیمات کے سامنے سراپا نیاز بنے رہیں اور کسی سرخ وسفید کتاب کے متلاشی ہوں۔ یہ ذہنی کج روی ہے اور اسلام کی واضح تعلیمات سے انحراف ہے یہ دانستہ یا نادانستہ تعلیمات اسلامی کو مجروح کرنے کی بھیانک سازش قرار پائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے۔

5 ان گزارشات سے یہ واضح ہوگیا کہ اسلام ہی ذریعہ نجات ہے اور اسکے سوا کوئی ذریعہ موجود نہیں جو فلاح دنیوی ونجات اخروی کا سبب بن سکے۔ یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے جو جدید لادینی نظریات کی یلغار سے اکثر متبعین کے دلوں میں بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ تعلیمات اسلامیہ کے دو پہلو ہیں۔ نظری تعلیمات اور عملی تعلیمات، جس طرح نظریات میں کسی اور نظریہ کی پیوندکاری نظریات کا شرک ہے اسی طرح عملی دنیا میں اعمال میں غیر اسلامی معیار اعمال کی ناصالحیت کی دلیل، اسلامی نقطہ نظر سے عمل کا مدار نیت ہے اور نیت بغیر ایمان متحقق نہیں ہوتی۔ ایمان موجود نہ ہو تو عمل صالح وقوع پذیر نہیں ہوسکتا۔ غیر مسلموں کے اعمال ظاہری طور پر خواہ کتنے پسندیدہ کیوں نہ ہوں اجر وثواب کے لئے بلکہ عمل صالح کی ذیل میں آنے کے لئے ایمان کے محتاج ہیں۔ بلا ایمان عمل (جو بظاہر نیک اعمال کی صف میں شامل ہوں) اعمال صالحہ کا بہروپ ہے اگرچہ کتنا کامیاب ہی کیوں نہ ہو۔ ان کا روپ

ایمان ہے۔ کہ ایک مرتبہ حاتم طائی کی بیٹی سفانہ قید ہوکر اپنے قبیلے کے دیگر افراد کے ساتھ دربار نبوی ﷺ میں حاضر ہوئی تو آپ سے رہائی کا مطالبہ کیا اور کہنے لگی کہ میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں اور حاتم وہ انسان تھا جو غریبوں کا ہمدرد تھا، قیدیوں کو رہائی دلانے والا اور ہر مصیبت زدہ کے دکھ درد میں شریک ہونے والا تھا۔ اس پر ہادی اعظم ﷺ نے فرمایا بے شک تمہارا باپ مکارم اخلاق کو پسند کرتا تھا لیکن

لو کان ابوك مسلماً لترحمنا علیه (تاریخ دمشق حرف الحاء)

اگر تمہارا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کی بخشش کی دعا کرتے۔ حضور رحمت عالم ﷺ نے اُسے اپنی دعائے رحمت سے محروم فرمادیا کیونکہ وہ مسلمان نہ تھا اور واضح طور پر اس غلطی فہمی کا ازالہ کردیا تا کہ اعمال کے ظاہری پن سے نظریہ کی عظمت کو ٹھیس نہ لگ جائے۔

6 اس سلسلے میں آخری گزارش یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ فرستادہ الٰہی ہیں آپ کی تعلیمات احکامات الیہ ہیں۔ تعلیمات جامع ہیں اور غیر متبدل ہیں اور ان تعلیمات کے سوا نجات کا اور کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے اور اعمال کا دارومدار ان تعلیمات پر ہے تو کیوں نہ ہم ان تعلیمات کو اپنے لئے حرز جان بنائیں۔ کیوں نہ ہم نظریات کے فساد سے اپنا دامن بچائیں اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں۔ جب ہم ایمان کے دعویٰ دار ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہماری گفتگو میں ایمان کی جھلک نہیں ہوتی اور ہمارے اعمال میں نظریہ کا پرتو نہیں ہوتا۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ہر غلط عقیدے کے باوجود مسلمان اور ہر بدعملی کے باوجود عشق ومحبت کے دعویٰ دار ہیں۔ محبت کا تقاضا ہے تسلیم ورضا اور عشق کی غذا محبوب کا اتباع ہے علامہ اقبال نے کیا خوب کہا تھا۔

عاشقی محکم شو از تقلید یار   تا کمند تو شود یزداں شکار

اور اگر ایسا نہیں ہے تو

از مقام او اگر دور استی   از میان معشر مانیستی

آخر میں جناب مجدد الف ثانی کا یہ ارشاد۔ فرماتے ہیں۔

فعلیکم بمتا بعتہٖ ومتابعة خلفاء الراشدین علیه وعلیهم الصلاة والسلام وایاکم ومخالفة شریعتہٖ قولاً وعملاً واعتقاداً۔ فان الاولیٰ یُمنٌ وبَرَکَةٌ والثانیة شُومٌ وھَلَکَةٌ۔ (مکتوبات)

یعنی اتباع رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اتباع خلفاء راشدین کو لازم پکڑو اور خبردار ان کی تعلیمات کی مخالفت نہ ہونے پائے قولی عملی اور اعتقادی طور پر۔ کیونکہ پہلی حالت یمن و برکت والی ہے اور دوسری حالت بد قسمتی اور ہلاکت والی رہے۔

عقیدۂ ختم نبوت

خالق کائنات کے وجودِ واجب کی احدیت، صفات کی وحدانیت اور مظاہر کی بوقلمونی میں یکتائی کا احساس انسانی فطرت میں موجود ہے اسی لئے کہا گیا کہ عقیدۂ توحید، نظریاتی مبحث سے کہیں زیادہ وارداتی حقیقت ہے، علامہ ابن خلدون نے کہا تھا: ''توحید کے بارے میں فقط ایمان یا تصدیق معتبر نہیں کمال توحید یہ ہے کہ نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوجائے جس سے وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات، صفات اور افعال میں یکتا جان لے (مقدمہ ابن خلدون)''۔ اس وحدت کا احساس ہر کہیں ہے حتی کہ

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید
واحدہٗ لاشریک لا گوید

مگر اس کا ادراک ہر ایک کے بس میں نہیں کہ دلِ وجود کو چیرنے والی نگاہ سب کا مقدر نہیں البتہ توہمات کا الجھاؤ عام ہے اس الجھاؤ نے ابلیس کو خودسر بنایا کہ وہ تسلیم ورضا کی منزلت کا شعور نہ پاسکا، اسی الجھاؤ نے انسان کو در، در کا سوالی بنایا کہ وہ بت تراشتا رہا اور صنم کدے آباد کرتا رہا۔ کبھی تسلیم کرنا فریب بنا تو کبھی انکار کرنا، یہ اس لئے ہوا کہ خالق کے حکم کے سامنے اپنی انا کے بت توڑنے کا حوصلہ نہ مل سکا اس فریب سے نکلنے اور اس پست خیالی سے بچانے کے لئے الہامی راہنمائی دستگیری کرتی رہی، انسانی زندگی کے طویل سفر میں متعدد ایسے وجود نظر آتے ہیں جو اس

انحطاطِ فکر کا ازالہ کرتے رہے، یہ وہ عبقری صفات وجود تھے جنھوں نے انسانیت کے خدوخال سوارنے کا فریضہ انجام دیا، یہی منتخب افراد انسانیت کے قافلہ سالار اور شعور وآگہی کے نقیب تھے، انبیاء کرام علیھم السلام کی مقدس جماعت انہی فرستادگانِ حق سے عبارت ہے اور حضور اکرم ﷺ اسی قافلہء رشد کے آخری پیغام پر ہیں۔

نبی محترم ﷺ سلسلہء نبوت کے خاتم ہیں کہ آپ کی بعثت اُن تعلیمات کا آخری حوالہ ہے جو موقع محل کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، ہر الہامی راہنمائی کے بنیادی عناصر ایک سے تھے کہ یہ مناسبت اور صلاحیت کے تفاوت کے باوصف ایک ہی ذات کے عطا کردہ تھے، رسول معظم ﷺ کا پیغام ان الہامی تعلیمات کا نقطہء عروج بھی ہے اور آخری حوالہ بھی کہ نعمت تمام ہوئی، دین مکمل ہوا اور آپ کا لایا ہوا دین، رضاءِ خالق کا حامل ٹھہرا، اب کسی اور نوشتہ ہدایت کی ضرورت نہ رہی کہ یہ ہدایت ہمہ جہت بھی ہے اور بے لاگ بھی، انسانیت کو اپنے سفر حیات میں ایسا راہنما میسر آگیا جس کا اُسوہ کامل بھی ہے اور حُسن وجمال کا مرقع بھی، وہ وجودِ محترم جو معاند شہر مکہ کی پرخار راہوں سے بھی آشنا ہے اور لامکاں کے ہمہ آفتاب راستوں سے بھی آگاہ ہے، اسی وجود مکرم نے انسانی شعور کو آگہی، روابط کو سلیقہ اور روش روش کو قرینہ عطا کیا ہے، عقائد کی راستی، سیرت کی استواری اور معاشرت کی خوش آدائیگی اُسی وجود معظم کی خیرات ہے قرآن حکیم جو خالق اکبر کا کلام ہے اور نبی آفاق ﷺ جو ربّ العالمین کے حبیب ہیں، نے خیال ولفظ کی بھی تطہیر کی اور عمل وکردار کی بھی، اسی لئے کسی اور راہنما اور کسی اور نوشتہ کی ضرورت باقی نہ رہی، اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

نوعِ انسان را پیام آخریں
حامل او رحمت للعالمیں

اس لئے یہ اعلان کرنا پڑا کہ

پس خدا باما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق ازما محفل ایام را
او رُسل را ختم و ما اقوام را

یہی وجہ تھی کہ نبی خاتم ﷺ نے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو جب تورات پڑھتے دیکھا تو باوجود اسکے کہ تورات الہامی کتاب ہے اور اس میں ہدایت ونور کی موجودگی کا خود قرآن مجید نے اعتراف کیا ہے، فرمایا۔

"لَوْ كَانَ مُوسٰى كَانَ حَيًّا بين اظهر كم ماحلّ له اِلَّا اَنْ يَتَّبِعَنِىْ

(مسند احمد)

"کہ تورات کی بات نہیں صاحب تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس عالم میں ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے سوا کوئی صورت میسر نہ آتی"

انسان خالق ارض وسماء کی حکمتوں سے آگاہی نہیں پاتا تو فریب نفس کا شکار ہوجاتا ہے اور اگر اُسے حالات کی ذرا کشادگی نصیب ہوجاتی ہے تو ذاتی فیصلوں کو الہامی احکام کا بدل سمجھنے لگتا ہے تاریخ انبیاء گواہ ہے کہ برگزیدہ اور لائق احترام شخصیت اور معاشرتی فلاح کا ضامن وجود بھی اُن لوگوں کی نظروں میں نہ جچا جو اپنی ریشمی عباؤں میں تکبر ونخوت کی نمائندگی کررہے تھے، نبی اللہ تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا انتخاب ہوتا ہے مگر بدطینت افراد اس انتخاب پر معترض ہوتے رہے، کبھی خاندانی وجاہت کا حوالہ دیتے تو کبھی زرومال کی کثرت پر ناز کرتے، اُن کا خیال تھا کہ نبی اُن کا

انتخاب ہونا چاہیے، اس طرح وہ نبی کے وجود ہی سے انکار نہ کرتے تھے خالق کی قدرت سے بھی انکاری تھے، اسی پر تو ارشاد ہوا کہ نبوت شرف ہے اور رضائے خالق کا اظہار ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ (الانعام 124)

"اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ اپنے عطا کردہ منصب رسالت کو کہاں دے دے"

اللہ تعالیٰ کے برحق انبیاء سے انکار کا ایک بدرویہ یہ تھا کہ جب وہ اپنے منتخب افراد کو رسالت سے نواز رہا ہے تو کفر کیا گیا اور دوسرا بدترین رویہ وہ سامنے آیا کہ جس کو وہ اس منصب کے لئے چن نہیں رہا وہ اپنی ڈھٹائی سے اس منصب پر قبضہ کرنے کا اعلان کرتا رہا، دونوں صورتیں، رب کائنات کی قدرت، حکمت اور سلطانیت سے بغاوت ہیں، نبی اکرم ﷺ سے پہلے لوگ انکار نبوت کے مرتکب ہوئے تو عذاب نازل ہوا، آپ کے بعد بعض بدفطرت ادعائے نبوت کے مجرم ہوئے تو ملتِ اسلامیہ کو ان کی سرکوبی کا حکم دیا گیا کہ یہ صرف دعویٰ نہیں خالق کی قدرت سے بغاوت اور عصمت نبوت کے خلاف سازش ہے اور کوئی معاشرہ، نظریات سے انحراف اور اتحاد و یکجہتی کے خلاف سازش کو برداشت نہیں کرتا یہ آئین اسلام کی خلاف ورزی بھی ہے اور سماجی اضطراب کا شاخسانہ بھی، رسول اکرم ﷺ نے ہر وہ در بند کر دیا جہاں سے یہ فتنہ برپا ہو سکتا تھا حتیٰکہ صحابہ کرام علیھم الرضوان کی عظمتوں کے بیان میں بھی اس احتیاط کا اظہار فرمایا۔

یہ یاد رہنا چاہیے کہ اسلامی تعلیمات میں ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی عظمت و رفعت پر بار بار زور دیا گیا ہے اور یہ بھی کہ محبت کو اساس اسلام قرار دیا گیا

ہے متعدد احادیث و فرامین اس پر شاہد ہیں، نبوت کا تصور محبت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کہ

"اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ" (الاحزاب:6)

"نبی اکرم ﷺ مومنوں سے اُن کی جان سے زیادہ قریب ہیں"

قربت کا یہ تصور شراکت برداشت نہیں کرتا محبت جذبہ صادق ہوتی ہے اور صداقت دوئی پسند نہیں، توحید مست ہے، حبیب کبریا ﷺ کی محبت ایسی یکسوئی چاہتی ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو، یہی وہ جذبہ ایمان و اخلاص تھا جس نے کسی لمحہ بھی کسی اور کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کیا، کسی مدعی نبوت سے نہ دلیل مانگی اور نہ اُس کے اعمال و افعال کو وجہ پسند و ناپسند بنایا، تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب بھی کسی بدباطن نے ایسی جسارت کی امت کا غیض و غضب مچلنے لگا حتی کہ اس حوالے سے مناظرہ بازی بھی نہ ہوئی کہ عقیدہ ختم نبوت کسی وضاحت و دلیل کا محتاج نہ تھا۔

دلائل طلب کرنا تو درست یا غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرنا ہے اور اگر مدعی، علم جدلیت میں ماہر ہے تو عقیدہ پر شک کا گمان ابھرے گا جو وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کرنے کے مترادف ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں راہنمائی کا سامان رسول اکرم ﷺ کی حیات ظاہرہ ہی میں کر دیا تھا، اَسود عنسی نے مفادات کا کھیل کھیلا اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد نبوت کا دعویٰ کر دیا مگر مومنانہ جذبوں کے حامل مومنِ صادق کے ایک وار ہی سے ڈھیر ہو گیا، رسول اکرم ﷺ کو اس واقعہ کی خبر مل گئی، یہ عمل، مملکتِ اسلامیہ کے آئین تحفظ سے ٹکراتا تو ضرور باز پرس ہوتی، ایسا نہ ہونا دلیل ہے کہ اس عمل کو نبی اکرم ﷺ کی رضا حاصل تھی، بعض علماء کے نزدیک تو یہ بھی روایت موجود ہے کہ اس قتل کا خود نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا تو بینِ نبوت

دعویٰ نبوت کی صورت میں سامنے آیا تو آپ کا عمل اور رویہ آشکار ہو گیا۔

نبی اکرم ﷺ کے سامنے بنی حنفیہ کے افراد نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تھا مگر ذرا مہلت پاتے ہی ان کے سردار قبیلہ نے دعویٰ نبوت کر دیا، مقصد اسود عنسی کی طرح حصول دولت ہی تھا کہ یہ سب جاہ پسندی کے مظاہر تھے، دربارِ رسالت میں لکھا کہ میں نبی ہوں اس لئے جزیرہ نمائے عرب کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے اور آدھا علاقہ اُسے دیا جائے، نبی اکرم ﷺ نے جواب لکھا۔

"مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى مُسَيْلَمَةَ الْكَذَّابِ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ"

(ضیاء النبی جلد 6 ص 676)

''محمد رسول اللہ ﷺ کا خط مسیلمہ کذاب کی طرف، سلامتی اس پر ہو جو ہدایت کی اتباع کرے اما بعد، بے شک زمین اللہ تعالیٰ کی ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا وارث بناتا ہے اور نیک انجام متقین کے لئے ہے''۔

اس خط سے واضح ہوا کہ حضور اکرم ﷺ نے مسیلمہ کے خط موصول ہونے پر دعویٰ کی صداقت یا عدم صداقت پر کوئی دلیل طلب کئے بغیر کذّاب تحریر فرما دیا، یہی اسوہ رسول ﷺ ہے، اس نے علاقہ طلب کیا تھا تو آپ نے سیاسی مصلحت کو بھی اہمیت نہ دیتے ہوئے فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے زمین کا قبضہ عطا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ قرآن مجید میں موجود ہے کہ

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء:105)

''کہ زمین کا وارث میں اپنے صالح بندوں کو بناتا ہوں''

یاد رہے اگر نبی کریم ﷺ اسے کوئی قطعہ زمین دے دیتے تو یہ عطاء الٰہی ہی قرار پاتا کہ نبی محترم ﷺ قاسم ہیں، اس سے، معلوم ہوا کہ آپ نے اُسے نبی تو کجا عبد صالح بھی تسلیم نہیں کیا اور متقین کی نیک انجامی کا ذکر فرما کر اُس کے انجام بد کی بھی خبر دے دی، اس سے دو واہموں کا ازالہ ہوا، ایک یہ کہ مدّعی نبوت اپنی تمام تر ظاہری عبادات کے باوجود صالح نہیں اور یہ جو بعض روشن خیالوں کو صالحیت کا اشتباہ ہونے لگتا ہے وہ دین کی تعلیمات سے کھلا انحراف ہے دوسرے یہ کہ اگر کوئی بدفطرت زمین پر قابض ہو جائے تو اسے رضاء الٰہی کا اظہار نہ سمجھا چاہیے یہ غاصبانہ قبضہ ہے اور صریحاً بغاوت ہے معلوم ہوا کہ نبی رحمت ﷺ نے ادعائے نبوت کے کسی اظہار یا بروز کو تسلیم نہیں کیا اور برملا اپنا مرسلانہ ردّعمل ظاہر کر دیا اور پوری قوت سے فتنہ کو دبا دیا، مسیلمہ کے خلاف بھی ایسا ہی رویہ اپنایا جانا تھا جو اسود کے ساتھ تھا مگر آپ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور آنے والی نسلوں کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نمونہ قائم کرنے کا موقعہ مرحمت فرما گئے، عہد صدیقی میں قدم قدم پر فتنوں نے سر اٹھایا ایسے نازک مواقع پر مصلحتیں دامن تھام لیتی ہیں مگر ایمان صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی استقامت دیکھئے ایک لمحہ بھی تاخیر نہ ہوئی، عاشق حبیب کردار نے اپنے عشق پر آنچ نہ آنے دی اور پرخلوص محبت شعار نے کسی مدّمقابل یا مثیل کو برداشت نہ کیا، مسیلمہ کے خلاف جنگ میں کثیر صحابہ کرام شہید ہوئے حتیٰکہ حفاظ قرآن مجید کی بڑی تعداد جام شہادت نوش کر گئی مگر رفیق غار رضی اللہ عنہ نے ثابت کر دیا کہ میں حفاظ قرآن تو شہید کرا سکتا ہوں، عصمتِ رسالت کی حفاظت سے غافل نہیں ہو سکتا، یہ اسوہ صدیقی ہر گام پر راہنما ہے کہ باطل موقعہ کی تلاش میں رہتا ہے اُس کی دسیسہ کاری ہر لمحہ جاری ہے جس طرح

نگاہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس ملوف فتنے کو بھانپنے میں ذرہ برابر غلطی نہ کھائی اور اُن کا یقین کسی مرحلہ پر بھی مصلحت کوشی کا شکار نہ ہوا، اسی طرح امت مسلمہ کو ہر دور میں تحفظِ رسالت کا فریضہ انجام دینا ہے، مدّعیانِ نبوت کی نمازیں، اُن کے دینی رویّے کسی مداہنت یا تشکیک کا باعث نہ بنیں کہ روایت موجود ہے کہ مسیلمہ کے لشکر سے آذانوں کی آوازیں آتی تھیں اور اشھدانّ محمدًا رسول اللہ کی شہادت کا بھی اعلان ہوتا تھا۔

چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی کی آویزش ہر دور میں جاری رہی ہے، مسیلمہ کذّاب سے اس تاریخ ظلمت کی ابتداء ہوئی، طلیحہ اسدی اور اسود عنسی اس کے ابتدائی ابواب ہیں بہاءاللہ اور محمد علی باب اس کی درمیانی کڑیاں ہیں اور مرزا غلام احمد قادیانی اس قافلہءِ شب کا آخری مگر خطرناک کردار ہے جس نے اپنی ریشہ دوانیوں سے اپنے تمام پیش روؤں کو شہِ مات دی ہے۔ قادیانیت بظاہر تو ایک عصری فتنے کا نام ہے مگر درحقیقت یہ ایک استعارہ ہے باطل قوتوں کے اُس بروز کا جو بار بار ملّت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی سعی کرتا رہا ہے، زمان ومکان کے حوالے سے ہر فتنے کا الگ نام ہے مگر شیطنت کا بھیانک چہرہ ہمیشہ ایک سا رہا ہے۔

انیسویں صدی کا آخر ہماری تاریخ ملّی کا پرآشوب دور ہے، مسلمانوں کی سیاسی قوت ختم ہوچکی ہے، غلامی کے سائے گہرے ہیں، قوم پر سکتے کا عالم ہے مگر دشمن ہے کہ مطمئن نہیں، وہ خوف زدہ ہے کہ اس خاکستر سے چنگاری نہ سلگ اُٹھے اس لئے سازشوں کا جال بُنا جارہا ہے، ضمیر فروشوں کی تلاش ہورہی ہے مرزا غلام احمد کا انتخاب گہری سوچ کا نتیجہ تھا۔ خاندانی روایات کا جائزہ اور ذاتی اوصاف وعادات کا

تجزیہ کیا گیا اور پورے غور وخوض کے بعد اعتماد کے قابل گردانا گیا، مناظروں سے الہام اور پھر دعویٰ نبوت تک کے درمیانی فاصلے بڑی مہارت اور چابکدستی سے متعین کئے گئے تھے، یہ حقیقت ہے کہ دعویٰ کسی وقتی ہیجان یا ذہنی خبط کا مظہر نہیں ایک سوچی سمجھی سازش تھی، خارجی قوت کی کارفرمائی نمایاں ہے، وہ خارجی قوت جو صاحب قوت بھی ہے اور دین اسلام کے احیاء کے تصور سے خائف بھی۔ اس تناظر میں جب جہاد کی تردید کے فتاویٰ پر نظر پڑتی ہے تو مرزا قادیانی کا دعویٰ ”His master,s voice“ معلوم ہوتا ہے اور جب تردید جہاد کے ساتھ ساتھ تائیدِ انگریز کے ایسے حوالے بھی مل جائیں کہ ”ہم نے سرکارِ انگریزی کی راہ میں اپنا خون دینے سے بھی گریز نہیں کیا“۔ تو سازش کے تمام کردار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ برصغیر پاک وہند کا دانش ور کہلانے والا طبقہ قادیانی گروہ کی دسیسہ کاریوں سے غافل رہا اور عصمتِ رسالت جیسے بنیادی عقیدہ پر مسلسل مداہنت کا اسیر رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے بڑے دین دار گھرانوں میں قادیانی نقب سازوں نے نقب لگائی، ربوہ کا قبرستان آج بھی ملّت کے ضمیر پر تازیانہ ہے کہ وہاں کس قدر محترم شخصیات کے متعلقین اس لئے دفن ہوگئے کہ وہ شیطانی چہروں کی پہچان نہ کرسکے۔ یہ ایک طویل داستان ہے کہ کون کون اس دام تزدیر کا نخچیر ہوا، اور کس کس کو کفر ثابت کرنے میں منطقی استدلال نے روکے رکھا، یقین کرلیجئے کہ محبتِ رسول ﷺ میں ضعف آجائے تو ایسے فتنوں کو راہ ملا کرتی ہے، سرسید احمد خان کا نام تاریخ پاکستان کے حوالے سے اور اردو ادب کی اصلاحی کوششوں کے تناظر میں بڑا نمایاں ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ اُن کے ہاں بھی اسی قسم کی عدم توجہی موجود ہے، انگریز کی جانب قدرے جھکاؤ

کاالزام درست نہ بھی ہو مگر یہ ضرور ہے کہ محبت رسول ﷺ اور عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں اُن کا رویہ قابل رشک نہیں ہے مولانا میر حسن کے نام سرسید احمد خان کے خط کا ایک اقتباس سماعت فرمایئے جبکہ مولانا نے اُن سے مرزا غلام احمد کے بارے میں استفسار فرمایا تھا لکھا "مرزا غلام احمد کے کیوں لوگ پیچھے پڑے ہیں، اگر ان کے نزدیک ان کو الہام ہوتا ہے، بہتر ہمیں اس سے کیا فائدہ؟ نہ ہمارے دین کے کام کا ہے نہ دنیا کے اُن کے الہام اُن کو مبارک رہیں۔۔۔۔ اگر نہیں ہوتا اور صرف اُن کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے، وہ جو ہوں سو ہوں، اپنے لئے ہیں میں سنتا ہوں کے آدمی نیک بخت اور نمازی پرہیز گار ہیں یہی امر اُن کی فروگذاشت کو کافی ہے۔

ہوسکتا ہے بعض دعاوی سرسید تک نہ پہنچے ہوں مگر اس قدر بنیادی مسائل کو یوں نظر انداز کرنا بھی تو مناسب نہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے بعد ہر مدعی نبوت کاذب ہے اُس کے خلاف پوری توانائیاں خرچ کرنے کی ضرورت ہے، اس میں کسی قسم کی قیل وقال کی گنجائش نہیں، کیا جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے افہام وتفہیم کی راہ اپنائی؟ کسی قسم کی سودابازی ہوئی یا کسی مصلحت کی خاطر صرف نظر کیا گیا؟ فتنے کو کمزور سمجھنا اور ایسے شاطروں کو نظر انداز کرنا فتنے کو نشوونما کا موقع فراہم کرنا ہے، سوچتا ہوں کہ اگر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کسی مداہنت، مصلحت یا رواداری کا شکار ہو جاتے تو آج ہماری کیا حالت ہوتی، مداہنت کے رویوں نے قادیانی فتنے کو ہوا دی ہے، بدی کو جوان ہوتے دیکھتے رہنا نیکی کا خون کرنا ہے کہ بدی کی قوت نیکی کے ضعف کی دلیل ہوتی ہے، یہ سازش جب تیار کی جارہی تھی، اگر اُس وقت قوم کی پوری قوت اس کے

مقابلے کے لئے بروئے کار لائی جاتی تو بعد میں لاکھوں جانوں کا نذرانہ نہ دینا پڑتا۔

آج بھی اگر اس کا احساس پیدا ہوجائے اور ہم اپنی صف بندی کرنے میں کسی نظریاتی فریب کا شکار نہ ہوجائیں تو راہ نجات اب بھی پکار رہی ہے۔ یاد رہے بنیادی عقائد کے بارے میں فیصلے دوٹوک، واضح اور جرأت مندانہ ہونے چاہیں۔ محبت رسول ﷺ کے چراغ روشن کیجئے کہ اسی میں تحفظ ملت اور صیانت عقیدہ کا راز مضمر ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ختم المرسلین ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے نظروں کو راستی دلوں کو مرکز محبت اور اعمال کو پابند آداب بنانے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

اسلامی نظام میں قیادت و نیابت کا تصور

انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے، اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی اجتماع کا حصہ بن کر رہے اسے انسان کی معاشرتی حس کہا جاتا ہے، ارسطو نے کہا تھا کہ جو انسان معاشرے میں رہنے کے قابل نہیں وہ یا تو حیوان ہے یا دیوتا۔ علمائے لغت کہتے ہیں کہ انسان کا لفظ اُنس سے مشتق ہے یعنی انسان وہ مخلوق ہے جو ایک دوسرے سے مانوسیت کے جذبات رکھتی ہے بعض لغوی اسے نسیان سے نسبت دیتے ہیں، یہ نسبت بھی اُس کے ماقبل مفہوم کا بالفاظ دیگر اظہار ہے اُنس ہمیشہ نسیان پر منتج ہوتا ہے، انسان کا کردار انہیں دو انتہاؤں کے درمیان ہے وہ کہیں مانوسیت میں غلو کرتا ہے تو کہیں نسیان یعنی نظر انداز کرنے میں مبالغے سے کام لیتا ہے۔ اپنے ماحول سے اُس کا رابطہ بھی انہیں بنیادوں پر قائم ہے اور یہی انتہائیں اُس کے کردار کو جانچنے کے حوالے ہیں۔ ایک سے وارفتگی کا تعلق اور دوسرے سے برآفروختگی کا معاملہ اُسے بسا اوقات انتہا پسند بنادیتا ہے، ایسے میں معاشرہ اُس کی حدبندی کرتا ہے، سفر حیات کو سلیقہ شعاری سے جاری رکھنے کے لئے معاشرہ چند حدود متعین کردیتا ہے، یہی حدبندیاں قوانین معاشرہ کہلاتی ہیں۔ یہ قوانین کسی قوم یا خطے کی اجارہ داری نہیں بلکہ انسانی زندگی کے لامتناہی سفر کے دوران میں پیش آمدہ مسائل اور اُن کے حل کے لئے کی جانے والی انسانی کاوشوں کی باہمی آویزش سے متعین ہوتے ہیں اور جب کوئی قوم ان منتشر اور غیر مدون قواعد کو فطرت انسانی کے حوالے اور ماحول کی ضرورت

کے مطابق مجتمع کرلیتی ہے تو انہیں تاریخی سند حاصل ہوجاتی ہے۔

انسانی رابطوں میں ایک اہم رابطہ راعی اور رعایا کا ہے جو محدود مفہوم سے لے کر قومی اجتماعی زندگی کے وسیع تر تناظر میں موجود ہے۔ انفرادی صلاحیت، ماحول کی سازگاری اور وقت کی درست شناخت بعض انسانوں کو اپنے ہم جنسوں پر سبقت لے جانے کا موقع فراہم کردیتے ہیں، کسی کو آگے بڑھنے کا موقع ملا تو کسی کو اتباع پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ تقسیم کس قدر غیر مطلوب کیوں نہ ہو ہر دور میں موجود رہی ہے، ہر دو فریقین کے درمیان نفرت کی خلیج حائل ہوجائے تو حیاتِ انسانی بے یقینی کا شکار ہوجاتی ہے اور معاشرہ ہمہ وقت کسی طوفان کا ہدف رہتا ہے، اس لئے ارباب حکم اور اصحاب تدبیر نے اس تفاوت کو کم کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے تاکہ قرب بڑھے اور مانوسیت کے جذبات فروغ پائیں ان کوششوں میں تجربے نے اصلاح کی نشاندہی کی اور انسان ان رابطوں کی تہذیب و تنقیح میں مشغول رہا۔

اسلام دین فطرت ہے، اس لئے اسلام نے فطرتِ انسانی کے تمام گوشوں میں اصلاح کا بیڑا اُٹھایا ہے اسلام زندگی کو ایک اکائی قرار دیتا ہے اسے متعدد خانوں میں منقسم نہیں ہونے دیتا، انسانی شخصیت ایک مربوط طرز عمل اور ایک منضبط طریقِ کار ہی سے جلا پاتی ہے اس لئے مستقل اور بے لاگ قوانین مستقل اور بے لاگ تبھی ہوں گے جبکہ قانون دہندہ اُن تمام عوامل سے باخبر ہوگا جو ایسے ماحول میں کارفرما ہیں جس کے لئے قانون مرتب کیا جارہا ہے وگرنہ بے علمی بے ترتیبی کو جنم دے گی۔ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی قوانین اُس ذات کے تفویض کردہ ہیں جو خالقِ کائنات ہونے کے ناطے علیم وخبیر بھی ہے اور سمیع وبصیر بھی اس لئے خواہشات نفس کا کوئی

داعیہ یا محرکاتِ عمل کا کوئی زاویہ اُس کی نظر سے اوجھل نہیں ہے، معاشرتی قوانین کے ضمن میں ایک اور بنیادی بات یہ ہے کہ معاشرے کی تشکیل میں کارفرما عوامل کو پیشِ نظر رکھا جائے تو تاریخ عالم کا طائرانہ جائزہ واضح کرتا ہے کہ دنیا کے بیشتر معاشروں کی تدوین میں نسلی قرب، جغرافیائی وحدت اور رنگ وروپ کی ہم رنگی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلام ان مصنوعی رابطوں کو اہمیت نہیں دیتا، عربی وعجمی کے فرق کی نفی، گورے اور کالے کے امتیاز سے انکار اور نسل برتری کے عفریت سے نفرت اسلام کی تعلیمات کے مبادیات میں سے ہے، اسلام انسان کے ذہنی افق کو بلند تر لے جانے کا داعی ہے، باپ کی نسبت بھائی سے مانوسیت کو جنم دیتی ہے مگر مرکزِ نظر دادا کیوں نہ بنایا جائے تا کہ چچازاد بھی ویسی ہی مانوسیت کے حامل ہو جائیں، ہاں اس سے بھی بڑھ کر دادا کا باپ قابل توجہ کیوں نہیں، جوں جوں نظر دور رس ہوتی جائے گی نسلِ انسانی کی کثرت داخل محبت ہوتی جائے گی اور اگر پوری نسل انسانی اتنی بلند نظر ہو جائے کہ ابوالبشر علیہ السلام کو اپنی شناخت کا ذریعہ بنالے تو تمام دنیا محبت کی مہک سے عطر بیز ہو جائے گی۔

اسلامی معاشرہ تو ایک منفرد معاشرہ ہے کہ اس میں انسانوں کا باہمی تعلق اُن کے خالق کے حوالے سے مستحکم ہوتا ہے۔ یہ تصور پختہ ہو جائے تو پوری نسل انسانی مساوی حقوق کی حامل قرار پاتی ہے۔ انسان بحیثیت انسان سب برابر ہیں اور یہ ایسا لاینفک وصف ہے جسے کسی حالت میں بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ ان مساوی مرتبے کے حاملین میں مابہ الامتیاز اُن کا ذاتی کردار ہے جسے اصطلاحِ شریعت میں تقویٰ کہتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک ذاتی کردار ہی وہ پیمانہ ہے جس سے شرافت وعظمت ماپی

جاتی ہے۔ انسانی شخصیت میں جس قدر خیر کا پہلو نمایاں ہوگا اُسی قدر وہ محترم قرار پائے گا۔ یہ بلندی کردار، انسانی مساوات کی ضد نہیں اُس کے حسن کی ضامن ہے۔ اسلام کسی فوق البشر کو تسلیم نہیں کرتا وہ تو خیر البشر کی عظمت کا قائل ہے یہی خیر البشر انسانیت کا امام اور مقتداء ہے اور اسی کے اتباع کا درس دے کر اسلام انسانوں میں خیر کے عناصر ودیعت کرنے کا داعی ہے۔

''قیادت ونیابت'' بظاہر دو مختلف المعنی کلمات ہیں مگر حقیقتاً ایک ہی منصب کے دو رُخ ہیں، قیادت مصدر ہے جسکے لغوی مفہوم میں ''راہنمائی وراہبری'' کا تصور پایا جاتا ہے مگر یہ ایسی راہنمائی ہے جس میں مقصد متعین ہو اور راستے کے حفاظتی مصالح پیش نظر ہوں، قائد وہ ہے جو درست سمت میں راہنمائی کرسکے اور بحفاظت منزل تک لے جائے، منزل واضح نہ ہو تو راہنمائی کیسی؟ راستے کی مشکلات کا ادراک نہ ہو تو راہبری کس کام کی؟ اس لغوی مفہوم سے قائد کے اوصاف کا تعین ہوتا ہے کہ وہ راہنمائی کا اہل ہو منزل آشنا ہو، ہمہ جہت باخبر اور قومی بہبود کا درد رکھنے والا ہو، خواہشات نفسانی کا عمل دخل قائدانہ صلاحیت کو داغدار اور صفت قیادت کو غیر محمود بنادیتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں ایسا قائد کون ہوسکے گا، اس سوال کے جواب کے لئے اسلامی معاشرے کی منزل کا تعین ضروری ہے، قرآنی تعلیمات کے مطابق ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے، منزل رضاء الٰہی ہے اور ساری تگ ودو اسکے حصول کے لئے ہے اس لئے رضا جوئی کے تمام مظاہر سے آشنائی ضروری ہے، قائد اُن تمام اوصاف کا حامل ہونا چاہیے جو اُسے سفرِ حیات میں بھٹکنے نہ دیں اور منزل کو اوجھل نہ ہونے دیں، اسلام اس کے لئے اتباع رسالت کی قید

لگا تا ہے تا کہ انسانِ کامل کی زندگی اور خیر البشر کا اُسوۂ زندگی کی تاریکیوں میں اُس کے لئے مینارۂ نور ثابت ہو، ضروری ہے کہ قائد کا دل مشکوٰۃ نبوت سے مستنیر اور اُس کی زندگی اسوۂ حسنہ کی کرم بخشی سے مستفیض ہو، اسے ہی اسلامی نظام معاشرت کی اصطلاح میں نیابت کہتے ہیں۔ اسلامی نظام حکومت میں قوم کا سربراہ رسول اللہ ﷺ کا نائب ہوتا ہے بلکہ اس کی قیادت اسی نیابت سے متحقق ہوتی ہے۔ قوم اور قومی تعلقات کے حوالے سے وہ قائد ہے تو منزل اور منزل آشنا ہونے کی نسبت سے وہ نائب ہے۔
اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اسلامی معاشرے میں کوئی قائد علی الاطلاق قائد نہیں ہوتا بلکہ قیادت اتباع رسالت کی پابند ہوتی ہے۔ مشہور مسلمان مفکر سیاست الماوردی نے کہا تھا کہ خلافت تو دراصل خِلَافَةٌ عَنْ صَاحِبِ الشَّرْعِ فِي حَرَاسَةِ الدِّيْنِ وَسِيَاسَةِ الدُّنْيَا بِهٖ یعنی خلافت تو صاحب شریعت حضرت محمد ﷺ کی نیابت ہے دین کی حفاظت اور معاملات دنیا کی ادائیگی کے لئے، اسی کی طرف حضرت ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا کہ ''خلافت برائے تصدی اقامت دین محمدی'' یہ نیابت آنحضرت ﷺ ہے واضح رہے کہ اصطلاح میں خلافت نیابت کے معنی میں ہے اگرچہ لغوی اعتبار سے پیچھے آنے یا پیچھے رہنے کے معنی آتے ہیں قرآن مجید میں ہے۔

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرہ: 30)

کہ آدم کو میں زمین میں خلیفہ بنانے لگا ہوں

یا فرمایا۔

يٰدَاوٗدُ إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ (ص: 26)

اے داؤد علیہ السلام ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔

ان آیات میں خلف بمعنی بعد میں آنے کا مفہوم نہیں کیونکہ حی و قیوم ذاتِ ایزدی کا خلف اس معنیٰ میں متصور نہیں۔ خلیفہ درحقیقت ایک امین ہے جو احکاماتِ اسلامیہ کو احکامات دہندہ کی منشاء و رضا کے مطابق جاری کرتا ہے اور اس نفاذ میں ایک اعلیٰ معیار یعنی اسوہ رسول ﷺ اُس کے پیش نظر رہتا ہے یعنی وہ رضائے الٰہی کا عملی نفاد باتباع رسالت کرتا ہے وہ کسی شکل میں بھی خودسر یا خودنگر نہیں ہوتا اور نہ اپنی تنفیذی حیثیت سے تجاوز کی کوشش کرتا ہے، یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ دنیاوی نظام ہائے سیاست میں حکومت ایک مستقل کیفیت کا نام ہے جو اپنے مرکز اقتدار میں ہمہ مستقل اور مسلسل رہتی ہے یہ غیر متبدل ہے ہاں وہ جماعت بدلتی رہتی ہے جس کے ہاتھ میں وقتی یا زمانی طور پر حکومت آجاتی ہے، یہ دائمی اقتدار کا نظریہ اسلامی نظم حکومت میں بنیادی پتھر ہے اور قرآن اسے سلطان کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے یہی وہ سلطان ہے جس کے بغیر تمام تگ ودو کارلا حاصل ہے۔ انسان کی حاکمیت اسی نظریہ ''سلطانیت'' کے عملی اظہار کا نام ہے اور اس کا بھرپور اور قابل اتباع اظہار ذات نبوت میں ہوا ہے، ذات رسالت پناہ ﷺ کی مطاع اور مقتدا حیثیت دراصل سلطانیت خالق کی حرکی اور محسوس صورت ہے۔ اس بلندی مقام کے باوجود کوئی نبی علی الاطلاق حکومت کا دعویٰ نہیں کرتا تو پھر غیر نبی کو یہ دعویٰ کیسے زیب دے سکتا ہے، نبی سریر آرائے حکومت ہو یا کوئی اُمتی مقصد تو خالق کی رضا کو بروئے عمل لانا ہے۔
جس منزل پر پہنچنا مقصود ہو اُسی قسم کی راہنمائی درکار ہوتی ہے، ایٹمی خودکفالت ہدف ہے تو راہنما ایسا ہونا چاہیے جو ایٹمی توانائی کے حصول کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو جسے راستے کا درست ادراک نہ ہو وہ راہبر کیسے بن سکے گا۔ یہ فیصلے

قومیں پہلے کرلیتی ہیں کہ اُن کی منزل کیا ہے پھر وہ اس منزل کو قریب لانے کے لئے ایسا راہنما تلاش کرتی ہیں جو راستے کی مشکلات سے آگاہ بھی ہو اور منزل تک جانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو، اسلامی معاشرے کی منزل دنیاوی کامرانی بھی ہے اور اخروی نجات بھی اس لئے صرف ایسے افراد قیادت کے اہل قرار پائیں گے۔ جو حسناتِ دنیا کو حاصل کرنے کا حوصلہ اور شعور بھی رکھتے ہوں اور آخرت کی منزل میں سرخروئی کے آداب بھی سمجھتے ہوں۔ یہ معیار کڑا بھی ہے اور مشکل الحصول بھی کیونکہ اُسے ظل اللہ کے فرائض ادا کرنا ہیں اور اُسے مالک الامر کے ارشاد کے مطابق اولی الامر بننا ہے علمائے اسلام نے قائدین کے انتخاب کے لئے سخت معیار مقرر کئے ہیں چند ایک کا تذکرہ حقیقت حال کی وضاحت کے لئے کافی رہے گا۔

سب سے پہلی شرط مسلمان ہونا ہے۔ قرآن مجید نے اولی الامر منکم ارشاد فرمایا کہ اولی الامر کے لئے مسلمانوں میں سے ہونا ضروری قرار دیا ہے اور یہ بدیہی طور پر ضروری بھی تھا کیونکہ مسلم معاشرے کی قیادت ایک غیر مسلم کیسے انجام دے سکتا تھا جو خود منزل آشنا نہیں وہ راہنمائی کیسے کرے گا۔

دوسری شرط متقی ہونا ہے۔ تقویٰ دراصل مختلف داعیات کے درمیان راہ راست کے انتخاب کو کہتے ہیں، تقویٰ کا مرکز دل ہے، تقویٰ قلبی رجحانات و میلانات کی تنقیح کرتا ہے اور منہ زور جذبات کو پابند شریعت اور حیوانی خواہشات کو تہذیب کی جلا بخشتا ہے جس سے شخصیت نکھرتی ہے اور اخذ و ترک کے زاویے درست ہوتے ہیں، قیادت کے ساتھ سطوت کی پیوستگی خطرے کا لازم ہوتی ہے مگر تقویٰ اس میں شائستگی کا جوہر پیدا کرتا ہے۔

تیسری شرط عادل ہونا ہے تاکہ حقوق کی ادائیگی اور فرائض کی بجا آوری میں پہل کرے قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ (النساء:58)

اور جب تم لوگوں کے درمیان حاکم بنائے جاؤ تو فیصلے عدل سے کرو۔

عدل حکومت کا وہ وصف ہے جس کے بغیر حکومت کا معنوی تشخص مجروح ہوتا ہے کیونکہ حکومت کا لغوی مفہوم فیصلے کی قوت ہی ہے، انسانی زندگی بوقلموں ہے اس میں قدم قدم پر قوتِ فیصلہ کا امتحان ہوتا ہے ایک غلط فیصلہ انسانی زندگی میں برسوں اور قومی زندگی میں صدیوں پر اثر انداز ہوجاتا ہے، فیصلے کی درستی یا نادرستی پر قومی عروج و زوال کا انحصار ہوتا ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ یہ قوت فیصلہ ایسے شخص کو سونپ دی جائے جو اس کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، عدل قوت فیصلہ کی درستی اور قوتِ حاکمہ کی تہذیب کا نام ہے اس کے بغیر نظم معاشرت تباہ ہوجاتا ہے۔

ان اوصاف ثلاثہ کے علاوہ منزل آشنا ہونا، صاحب علم ہونا، صحیح العقل اور کامل الخلق ہونا بلکہ کئی اور اوصاف کا حامل ہونا جو ماحول کی مطابقت سے ضروری یا زمانی یا مکانی مناسبت سے اہم قرار پائیں، قرآن مجید نے متعدد مقامات پر ایسے اوصاف کا اشارہ دیا ہے مثلاً جناب طالوت کی حکمرانی کے ذکر میں اُن اعتراضات کو بیان فرمایا جو اہل دنیا عموماً کیا کرتے ہیں۔

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۔ (البقرہ:247)

کہنے لگے یہ ہم پر حکمران کیسے ہوا حالانکہ ہم اس سے زیادہ حق رکھتے تھے اسے تو مال کی کثرت بھی عطا نہیں ہوئی فرمایا بے شک اللہ نے طالوت کو تم سب سے منتخب کرلیا ہے اور اُسے علم اور جسم میں زیادتی عطا فرمائی ہے۔ معترضین قیادت کے لئے اُنہیں صفات کا ذکر کر رہے ہیں جو ایک دنیا دار کی نظر میں محبوب ہوتی ہیں، بڑے گروپ کا نمائندہ ہونا اور صاحب ثروت ہونا، یعنی جس کے ساتھ سروں کی تعداد زیادہ نظر آئے یا جس کا دامن دولت سے بھرا ہوا ہو، ہی صاحب فضیلت اور وہی صاحب اقتدار، اللہ تعالیٰ نے ان غیر حقیقی معاییر کو رد فرمایا اور فرمایا کہ یہ اللہ کا انتخاب ہے اس لئے کہ یہ علم کی دولت اور جسمانی قوت کا حامل ہے، سلیم العقل ہونے کے ساتھ سلیم الجسم بھی ہے اور ان دو صلاحیتوں کا اجتماع قیادت کی اہلیت بن رہا ہے۔

انتخاب کی یہ کڑی شرائط اس لئے ہیں کہ فرائض بڑے کٹھن ہیں، ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ انفرادی امانت کا بوجھ بڑے بڑے باہمت افراد کو خیانت کا مرتکب بنا دیتا ہے۔ قومی قیادت تو ایک عظیم امانت ہے جس میں ایک جانب حقوق اللہ کی حفاظت اور شارع علیہ السلام کے اسوۂ کی نگہداشت کا مسئلہ درپیش ہے تو دوسری جانب پوری ملت کے ہر ہر فرد کے حقوق کی امانتیں ہیں جنہیں صرف واپس ہی نہیں لوٹانا ان میں عدل کی حکمرانی بھی قائم کرنا ہے۔ ذمہ داریوں کا یہ بوجھ تو بڑے بڑے باہمت انسانوں کو لرزہ براندام کر دیتا ہے اور جوانی کے ایام میں ہی بڑھاپا جھانکنے لگتا ہے ایسے میں اقتدار کی ہوس کس قدر کوتاہ نظری ہے، یہ تو قعر دریا میں غوطہ زن ہونے کا عمل ہے، یہ مراعات یافتگی نہیں ایک چیلنج ہے جس کے بوجھ سے زمین و آسمان اور پہاڑوں کی بے پناہ وسعتیں بھی لرز اٹھی تھیں طلب قیادت مستحسن نہیں کہ یہ اپنے

آپ کو امتحان میں ڈالنے کا نام ہے، یہ حق قوم کو ملنا چاہیے کہ وہ اپنی قیادت کے لئے سیرت و کردار کے حوالے سے صالحین کے گروہ میں سے بہتر افراد چنے مگر یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ انتخاب قیادت کے لئے مشورے بھی باصلاحیت افراد سے ہونے چاہییں ہم روزمرہ زندگی میں مشورہ طلب کرتے وقت صاحب مشورہ کی حیثیت کا تعین ضرور کر لیتے ہیں تو پھر قوم کے مجموعی مفاد کے فیصلے کو ایسے لوگوں کے مشورے کا پابند کیوں بنایا جائے جو یہ صلاحیت نہ رکھتے ہوں، یہ تو ممکن نہیں کہ مشورے کے ہدف کے مطابق ہم شوریٰ کے ارکان کا انتخاب نہ کریں، تعمیراتی مسائل کے حل کے لئے مشورہ ماہر تعمیرات سے ہی ہونا چاہیے اور مریض کی بہبود کا مشورہ کسی اچھے ڈاکٹر سے کرنا چاہیے یہ کیسے ممکن ہے کہ مرض کی تشخیص کے لئے ہم ایک انجینئر کو مشورے کی زحمت دیں، اس کا علم مسلم اور اُس کی قابلیت تسلیم مگر اُس کا میدان متعین ہے، اسی طرح جب قومی زندگی کا مجموعی مفاد پیش نظر ہو تو مشورہ ایسے افراد سے ہونا چاہیے جو قومی مفاد سے آشنا ہوں، قومی سلامتی کا مشورہ کسی غدار وطن سے اور شہری سلامت روی کا مشورہ کسی گرہ کٹ سے نہیں ہوسکتا، اسلام ارباب حل وعقد کے اوصاف کی نشاندہی کرتا ہے، کسی مسئلہ میں مشورہ انسان کے دل کی شہادت ہے یہ کسی کذب پسند سے طلب نہیں کیا جاسکتا۔

قیادت کا انتخاب ارباب دانش، اصحابِ علم اور صاحبِ تقویٰ انسانوں کے ذریعے سرانجام پانا چاہیے تاکہ جو قیادت ابھرے وہ قومی مفاد کے لئے دلی تڑپ رکھتی ہو، قیادت کے فرائض کا تعین نیابت کے لاحقے نے کر دیا ہے، قائد کو نیابتِ رسالت ﷺ کے حوالے سے وہ فرائض انجام دینے ہیں جو ذاتِ رسالت ﷺ نے اُس کے ذمے لگائے ہیں۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر7)

جو رسول ﷺ تمہیں عطا کریں لے لو اور جس سے روکیں رک جاؤ، کا ارشاد اخذ و ترک کے معیار مقرر کر رہا ہے، بعثت رسول ﷺ کا مقصد دین حق ہے۔

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (الفتح:28)

یعنی اُسے تمام ادیان پر غالب کرنا ہے، حدود ملکی کے اندر دین حق کی سربلندی کے اعلان کے لئے پیروی حق کا درس دینا اور انکار کرنے یا منحرف ہونے والوں کا بزور محاسبہ کرنا، بیرونی دنیا میں اسلام کے تغلب کے لئے کوشاں رہنا اسلامی سربراہ ریاست کا فریضہ ہے۔ قائدین کے فرائض میں مشورہ طلبی بھی ہے اگرچہ وہ مشورے کی بے پناہ قوت کے حامل کے طور پر سربراہ ہے مگر اُس کا فرض ہے کہ اہم امور میں باصلاحیت افراد سے مسلسل رابطہ رکھے، قوم سے حاصل کردہ اعتماد کو من مانی کرنے کا ذریعہ نہ بنائے بلکہ جنہوں نے اُسے یہ مقام شرف عطا کیا ہے اُن کی صائب رائے کا ہر لمحہ متلاشی رہے کیونکہ امت مسلمہ کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ یہ مجموعی رائے میں گمراہی کی مرتکب نہیں ہوتی بلکہ اسے تائید ایزدی حاصل ہوتی ہے۔

الغرض اسلامی نظام حکومت میں قوم کی سربراہی ایک فریضہ ہے جس کے لئے اہل افراد کا چناؤ ہونا چاہیے اور یہ چناؤ ایسے افراد کے ہاتھوں انجام پائے جو اس چناؤ کی صلاحیت رکھتے ہوں، اسلام میں قیادت ذمہ داری کی بجا آوری کا منصب ہے جسکی حدود نیابت رسول ﷺ کے حوالے سے متعین ہوتی ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ مقرر ہوئے تو آپ نے خلیفہ رسول اللہ ﷺ کا لقب اختیار کیا تا کہ راہ عمل کی نشاندہی ہو جائے خلیفۃ اللہ تو نسل آدم علیہ السلام کا ہر فرد ہے اس لئے ہر ایک کو اپنی زندگی

میں نیابت الٰہیہ کا فرض انجام دینا ہے مگر یہ قیادت نیابت رسول ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ رسول اللہ کے بجائے امیر المومنین کہلانا پسند کیا تو یہ بھی اُسی حقیقت کی ترجمانی تھی کہ خلیفہ الرسول مومنوں کا امیر ہوتا ہے۔ مومنوں کی امارت کا حق صرف اور صرف اس وجہ سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ خلیفۃ الرسول کے منصب پر فائز ہے۔ قوم کے حوالے سے وہ امیر المومنین اور منزل کے حوالے سے وہ خلیفہ الرسول ہے۔ ملت اسلامیہ کا قائد انہیں دو طرفہ حد بندیوں میں رہتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔

اللہ کرے کہ ہم اسلامی نظام حکومت کے اس تصور کی برکات محسوس کریں اور اپنی راہ حیات اسی کے حوالے سے متعین کریں۔ آمین

حضور رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

معاشرتی مصلح

انسانی زندگی کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ انسان کی بھلائی و خیر خواہی کا ہمیشہ سے اہتمام رہا ہے انبیاء کرام علیہم السلام کے کارنامے اس حوالے سے نمایاں ہیں یہ وہ چند نفوسِ قدسیہ ہیں جنہوں نے حیات و ممات کے تصور میں انقلاب آفرین پیغام کے ذریعے بنیادی تبدیلیاں کیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قافلہ رشد و ہدایت کے آخری نقیب ہیں جن کے وجود میں اصلاحِ قوم اور تہذیب ملت کا منصب اپنے عروج کو پہنچا اور انسانی شعور کو معراج حاصل ہوئی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلسلہ انبیاء کے خاتم ہیں کہ آپ کی آمد نوعِ انسانی کے لئے اُن تعلیمات کا حرفِ آخر ہے جو موقع و محل کی مناسبت سے خالقِ کائنات کی طرف سے نازل کی جاتی رہی ہیں۔ ہر الہامی تعلیم بنیادی عناصر کے حوالے سے یکساں ہے کہ یہ مناسبت اور صلاحیت کے تفاوت کے باوصف ایک ہی ذات کی عطا کردہ ہے مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطا کردہ تعلیمات الہامی تعلیمات کا نقطہ عروج ہیں یہ آخری اور حتمی راہنمائی ہے جس کے بعد انسان کو کسی اور ہدایت نامے یا نوشتہ الہام کی ضرورت نہ رہی اس لئے کہ یہ ہمہ جہت اور بے لاگ ہیں انسانیت اپنے معراج کے سفر پر تھی اور اُس کا امام شعورِ انسان کو آگہی، باہمی روابط کو سلیقہ اور احترام انسانیت کو قرینہ عطا کرنے والا وجود خود محترم تھا اور احترام آدمی کا پیغام بر۔ اس احترام باہمی نے انسانی معاشرت

میں یگانگت، اُنس اور محبت کی نمو کی تھی جس سے انسانی معاشرہ گہوارہ امن بن گیا تھا۔

معاشرتی اصلاح کی خشت اول فکر و نظر کی تطہیر اور ہمہ جہتی انقلاب ہے یہ بجا کہ انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمیشہ سے سرگرم عمل ہے اور اس سلسلے میں بعض مقتدر وجود زیادہ فعال نظر آتے ہیں مگر ایک حقیقت جس سے انکار ممکن نہیں یہ ہے کہ ان تمام مساعی کا مقصود جزوی اصلاح اور وقتی انقلاب رہا۔ کہیں سیاسی اصلاح مطلوب رہی تو کہیں معاشی انقلاب، کوئی اخلاقی انقلاب کے لئے کوشاں رہا تو کوئی مادی سربلندی کے لئے سرگرم عمل رہا، مکمل انسانی اور مجموعی انسانی معاشرہ بہت کم توجہ لے سکا کہ وہ وقتی اصلاح کے دام کا اسیر رہا۔

سیاسی انقلاب از سرتا پا وقتی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ سلطنتیں بدلتی ہیں صاحبانِ اقتدار کے چہرے تبدیل ہوتے ہیں۔ تخت سے تختہ یا اس کے برعکس ایک شیطانی کھیل جاری رہتا ہے۔ مگر انسانی سماج اُسی بے بسی کا شکار رہتا ہے جس سے نجات کی نوید سنا کر اُسے استعمال کیا جاتا ہے، انسانی معاشرت کے حوالے سے یہ انقلاب بے کار، ضرر رساں اور فساد کا باعث ہوتا ہے، حاکم بدلنے سے قوم کی تقدیر تو نہیں بدلتی، مادی انقلاب اپنے جلو میں انسان کے لئے آسائشوں کی نوید لاتا ہے جو اکثر انسانوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے اور وہ اندھے پن کا شکار ہو کر اس سراب کو حقیقت سمجھنے لگتے ہیں۔ صنعتی انقلاب اسی کی ایک صورت ہے۔ آج کا انسان اس انقلاب کا نخچیر ہے بظاہر یہ تگ و دو انسان کی فلاح اور معاشرتی و معاشی اصلاح کے لئے ہے مگر اس حسین چہرے کے ورے زبردستوں کی سطوت اور زیردستوں کی مظلومیت ہے، سماجی انصاف کے نام پر انقلاب کا سرخ سویرا اس دور کے انسان کو

نظروں سے اوجھل نہیں، چہروں کی سرخی پرچموں پر منتقل ہوگئی ہے مگر انسانیت کا مدقوق چہرہ نظر آنے لگا ہے۔ مساوات نسل انسانی کے نام پر اور اصلاح فرد اور معاشرہ کے حوالے سے بڑے بڑے چارٹر تیار ہوئے مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ جمہور کی طاقت کا راگ اس دور کا مرغوب ترانہ ہے لیکن جمہور کی بے بسی کا اہتمام ہو رہا ہے۔ انسان مجبور سے مجبور تر ہوتا گیا اور معاشرہ بد سے بدترین حالات سے دوچار ہوا۔ ہمہ جہتی گرسنگی نے معاشرہ کو گھیر رکھا ہے۔ ضرورت یہی ہے کہ طبیب انسانیت کے در پر حاضری دی جائے اور اُس نسخہ کیمیا سے معاشرتی بگاڑ کا علاج ہو جو کائنات کی فلاح اور معاشرتی اصلاح کا ضامن ہے۔

مصلح انسانیت حضرت محمد ﷺ کا پیغام نسخہ شفاء ہے، یہ ہر دور کے لئے اصلاح کا کفیل اور فلاح کا ذریعہ ہے۔ اس کے اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں کیونکہ اس میں روح کی جلا اور جسم کا وقار ہے۔ اصلاح کا یہ پیغام ضمیر سے ابتداء کرتا ہے۔ اندر کی دنیا میں حرکت لاتا ہے۔ اس لئے کہ اس دارالخلافہ کو پہلے سر ہونا چاہیے، حدیث مبارک میں دل کے سنورنے یا بگڑنے پر پورے جسد انسانی کی اصلاح یا بگاڑ کو موقوف ٹھہرایا گیا ہے۔ نبی رحمت ﷺ کا اصلاحی پروگرام دل سے ابتداء کرتا ہے اس لئے اس اصلاح کا طریقِ عمل اور اندازِ نفوذ ہی مختلف ہے۔ دل نظریات کا مسکن اور معتقدات کا مرکز ہے اور جب نظریات و معتقدات میں اصلاح کا عمل جاری ہو جائے تو عملی انقلاب ظہور پذیر ہوتا ہے۔ نظریات و معتقدات کا پہلا عکس خالق اور مخلوق کے تعلقات کی نوعیت میں نمایاں ہوتا ہے۔ خالق کی پہچان اور اُس کی صفات کا ادراک اس انقلاب کا نقطہ آغاز ہے۔ عبادات اس تعلق کی مظہر ہیں

ہر دور کا انسان عبادت کے کسی تصور سے آشنا رہا ہے۔ کبھی پتھر معبود بنے تو کبھی شجر، کبھی مانوسیت نے جذبوں کا روپ دھارا تو کبھی خوف نے انسانی گردن کو خمیدہ ہونے پر مجبور کیا۔ اسلام نے محبت و خوف کی اس ثنویت کا راز فاش کیا اور عبادت کی ارفع صورت واضح کی جو فطرتِ انسانی کا اقتضاء اور انسان کے داخل کا داعیہ ہے۔ باور کرایا گیا کہ مخلوق کا معبود صرف خالق ہی ہے، عبادت کے اس انقلاب آفرین تصور نے سماجی رویے بدل ڈالے، ان میں باہمی وقار اور اعتماد پیدا ہوا۔ عبادت مخصوص اشکال کا نام نہ رہا عمومی رویہ بنی۔ خالق پر ایمان صرف نظریاتی حد تک محدود نہ رہا بلکہ ایک حرکی قوت بن گیا جس سے وحدتِ نسلِ انسانی کے شعور کی آبیاری ہوئی۔ اس وحدتِ فکر نے وحدتِ عمل کی نمو کی، عمل مدار شرف بنا اور اس کی سطوت ہر کہیں قائم ہوئی۔

وَاَنۡ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم:39)

کہ انسان کے لئے سوائے اُس کے کچھ نہیں جس کے لئے اُس نے محنت کی۔

کا فرمان عمل کی بارگاہ میں سب کو برابر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے کہ یہی معیار عظمت ہے اور یہی ذریعہ نجات۔

حضور اکرم ﷺ نے تطہیر فکر کا عظیم کارنامہ انجام دیا جس سے انقلابی شعور نے جنم لیا، دین تسلیم و رضا کا نام اور قوت عقلیہ سے برتر یقین کا مظہر بنا، آپ نے عقل کی عظمت اور اس کے وجود کی مرکزیت پر زور دیا یہاں تک کہ دین عقل کا مترادف قرار پایا۔ دین عقل ہے اس لئے بے عقلی دین نہیں، اسلامی تعلیمات کا کوئی رُخ حکمت سے خالی نہیں اور کوئی مطالبہ بے سوچے سمجھے نہیں۔ معتقدات و نظریات میں عقل کی حیثیت کا تعین اسلامی انقلاب کا امتیازی وصف ہے، یہ فکر و عمل کی اصلاح

ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ علم کی تلاش مسلمان امت کی شناخت اور اسلامی معاشرے کا اساسی مقصود قرار پائی، علم زیور نہ رہا ایک فرض بنا، یہ مخصوص لوگوں کی انفرادیت کا نشان نہ رہا سب کے لئے وجہ افتخار بنا، اسے خاندان، ذات اور وقت ومنصب کی تنگ ناؤں سے آزاد کر دیا گیا یہ جنس فروخت نہ رہا ہر ایک کا حق سمجھا گیا، ہر فرد معاشرہ کے لئے مہد سے لحد تک علم کا حاصل کرنا فرض ہوا اور اس کی تعلیم کا اہتمام ہوا، یہ علمی انقلاب اور فکری اصلاح آقائے رحمت ﷺ کے وجود سے ممکن ہوا۔

فلسفہ اخلاق کی ہزار ہا تعبیریں تاریخ عالم کے سینے میں محفوظ ہیں۔ نبی آخر الزمان ﷺ کے نظام فکر وعمل میں اخلاقیات کی انقلابی تعبیر سامنے آئی اور اُن سب مغالطوں کی اصلاح ہوئی جو انسانی رویوں میں فساد کا ذریعہ تھے، انسان کو ہمہ تن پاک اور ہمہ جہت طاہر گردانا گیا، آپ کی تعلیمات میں انسان نہ بے عمل ہے نہ گناہ کی پیداوار بلکہ فطرتِ انسانی معصوم اور بے داغ ہے، وہ کسی سابقہ گناہ کی پاداش میں زمین پر نہیں اتارا گیا اور نہ ہی اس کے دامنِ اعمال میں پہلوں کے گناہ کا ترکہ موجود ہے۔ وہ جو کچھ ہے اپنے دست وبازو کے سہارے ہے اور زمین پر ہے، سلیم الفطرتی کو اساس آدمیت قرار دینا نظریہ اخلاق کا انقلاب ہے، اس کا یہ اثر ہوا کہ انسان نفرت کی دلدل سے نکلا اور خلوص ومحبت کا پیکر بنا، اس متوازن فکر نے انسانی قوتوں کا جلا بخشی اور انسان کا اپنے وجود پر اعتماد پیدا ہوا۔

انسان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اپنے گرد باطل نظریات اور غیر مستحکم خیالات کی دیوار کھڑی کر لیتا ہے اور ریشم کے کیڑے کی طرح اپنی ذات کے گرداب کا اسیر ہو جاتا ہے جس سے اُس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو دھچکا لگتا ہے اور وہ شرفِ انسانی

سے گرنے اور ذلتوں کے پاتال کی جانب اُترنے لگتا ہے۔ یہ وہ گراوٹ ہے جہاں انسان المدد المدد پکارنے لگتا ہے، جو نظریہ اس بے بسی میں انسان کا مددگار بنے گا وہی اُس کی نجات کا کفیل ہوگا۔ انسان قدیم زمانے سے ہی نسلی، گروہی، طبقاتی اور جغرافیائی حد بندیوں کا اسیر رہا ہے۔ اس تقسیم میں زمینی حوالہ ہی معتبر رہا مگر آنحضرت ﷺ نے اس مصنوعی تقسیم کا ہر در بند کر دیا۔

مصلح انسانیت ﷺ نے بلند تر سوچ کی طرف دعوت دی۔ خالق ایک ہے تو پھر مخلوق دو کیوں! مقصود نظر اور محبوب نگاہ ایک ہے تو یکرنگی کا ظہور لازم ہے، اس تصور نے معاشرتی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا، تفاخر کی بنا ہی نہ رہی تو فخر ومباحات کیسے، قیادت کا تصور بدلا، برتری کا زعم نیابت کے احساس ذمہ داری میں بدل گیا اور بات بات پر حقوق کا مطالبہ کرنے والا فرائض کی بجا آوری پر توجہ دینے لگا، اس سے محنت کی سروری قائم ہوئی، محنت ذریعہ شرف بنی تو حاکم ومحکوم، آجر واجیر، آقا وغلام کا تصور بے وقعت ہو گیا، معاشی ناہمواری قابل مذمت قرار دی گئی اور استیصال کا راستہ روکنے کا حکم دیا گیا۔ ہوس گیری اور ھل من مزید کا شیطانی عمل رکا اور معاشی فکر میں ایک ہنگام بپا ہوا۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر وعمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین

زمیں اور زمین سے حاصل ہونے والی تمام نعمتیں انسانیت کی مشترک میراث ہیں اس لئے کہ خالق نے

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ (القصص:6)

یعنی زمین میں بسنے کو سب کا برابر حق قرار دیا ہے ارشاد ہوا۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ (الحجر:20)

اور ہم نے زمین ہی میں تمہاری معیشت کے سامان رکھ دیئے ہیں۔ تلاش رزق میں سب شریک ہو جاؤ کہ یہ تلاش اللہ کا فضل ہے ہاں تجاوز عن الحد قابل گرفت ہے۔ اس اصلاحِ فکر سے معاشرے میں محنت کی عظمت بھی پیدا ہوئی اور ایک دوسرے کے لئے جذبہ محبت بھی بیدار ہوا، معاشرہ متعاون، ہمدرد اور محسن بنا اور معاشرت میں اعتماد کی فضا قائم ہوئی اور جنگ وجدال غیر محبوب ٹھہری۔ قبائلی نفرتیں اور علاقائی دشمنیاں غیر محمود اور مذموم قرار پائیں وگرنہ اُس دور کا معاشرہ نفرتوں کی آگ میں جل رہا تھا۔ خواہشات بے لگام ہوچکی نہیں اور حرص نے ہر انسان کو بھیڑیا بنا دیا تھا۔ انسان انسان کا دشمن ہو رہا تھا ایسے میں تاجدارِ عرب وعجم ﷺ نے الفت، محبت اور یگانگت کا پیغام دیا اور تالیفِ قلب کا سامان کیا، قرآن مجید نے اس انقلاب آخرین اقدام کی یوں شہادت دی۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (ال عمران 103)

اور تم اللہ کی نعمت یاد کرو جو تم پر ہوئی جبکہ تم دشمن تھے پس اُس نے تمہارے دلوں کے اندر الفت پیدا کی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کے یہ اساسی پہلو تھے جن سے نظریاتی اصلاح ہوئی اور انسانی رویے بدلے، آپ نے ان نظریات کو عمل کا قالب بھی عطا کیا اور معاشرتی اصلاح کا ایک بے لاگ مگر بھر پور پروگرام بھی پیش کیا۔ اس اصلاحی پروگرام

کا دائرہ اثر بہت وسیع اور نہایت جامع ہے جس کا احاطہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے پھر بھی چند اساسی ہدایات اور بنیادی اقدام یہ ہیں۔

انسان کا وجود محترم ہے اس لئے اس کی حفاظت لازم ہے اور ہر فرد معاشرہ اس حفاظت میں شریک ہونے کا مکلف ہے، قتل اس تحفظ کی نفی ہے اس لئے یہ بہر صورت حرام ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ۖ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ۚ (المائدہ 32)

جس نے کسی جان کو بغیر کسی جان کے بدلے یا زمین میں فساد کی خاطر قتل کر دیا تو گویا کہ اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا۔ اور جس نے اُسے زندہ رکھا تو گویا اُس نے ساری انسانیت کو زندہ رکھا۔

یہ تو قتل کی ظاہری شکل ہے، معنوی قتل جو کسی پر سنگ زنی کر کے بہتان لگا کر غیبت کر کے کیا جاتا ہے اُسے قذف، قرار دیا گیا اور حد قذف، نافذ کر کے شخصیت کشی کا راستہ روکا گیا، غیبت اخلاقی کمزوری بھی ہے اور معاشرتی لعنت بھی، یہ کسی کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھانے کا نام ہے اس لئے ارشاد ہوا۔

وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ (الحجرات 12)

اور تجسس نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے تم سب اسے ناپسند کرو گے۔

غیبت کو درندگی سے مشابہ قرار دے کر اس کے بھیانک پن کو واضح کر دیا گیا۔

معاشی بے چینی بسا اوقات حیوانیت پر اُکساتی ہے جیسا کہ جاہلی معاشروں میں ہوا کہ غربت کے خوف سے اولاد کا قتل ہونے لگا، یہ جرم اس لئے ہوا کہ تقسیم دولت کا نظام ناکارہ تھا اور خود سر انسان اپنے آپ کو رزق کے چشموں کا حاکم کہنے لگا تھا حالانکہ رزق سب کا حق ہے جیسا کہ ارشاد ہوا۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الزخرف 32)

"ہم نے انسانوں کے درمیان اُن کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا" یہ تقسیم معیشت عدل کی بنیاد پر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ہبوط ارض کے موقع پر ہی یہ اصول سمجھا دیا گیا تھا کہ زمین ٹھکانہ ہوگا اور قیامت کے لئے متاع حیات اسی سے حاصل ہوگا، جلب زر کے لئے تمام غیر محمود طریقے ممنوع قرار دیئے گئے اور انفاق کے غیر مستحسن انداز کی نفی کی گئی جس سے گردشِ دولت کا قانون استخراج ہوا اور معاشی ناہمواری دور ہوئی، دولت کا ایک جگہ جمع ہو جانا معاشرتی بگاڑ کا سبب بنتا ہے اس سے معاشرتی زندگی میں بدچلنی کا تعفن پیدا ہوتا ہے اس لئے اس پر سخت ضابطے نافذ کئے گئے اور یوں سماجی اصلاح کی راہ ہموار ہوئی۔ انسانی روابط میں عدم استحکام لاتعداد معاشرتی برائیوں کا باعث بنتا ہے۔ اس لئے اس کے سدباب کا اہتمام کیا گیا، انسان خاندان کا فرد ہے۔ خاندان معاشرہ کا حصہ ہے اس لئے ہر خاندان کو معاشرتی بہبود کا مکلف بنایا گیا۔ ذوالرحم یعنی رشتہ دار سماجی روابط کی اہم کڑی ہیں۔ ہمسایے مکانی قرب کا حق رکھتے ہیں ۔ رشتہ دار شراکت کا جبکہ دیگر افراد معاشرہ انسانی تعلق کا، اس طرح پوری نسل انسانی مشترک رشتوں میں منسلک ہو کر ایک وحدت بن جاتی ہے اور انسان خالق کے حضور اطاعت شعار فرد کی حیثیت سے حاضر ہو جاتا ہے۔ معاشرتی استحکام کے لئے باہمی اعتماد ضروری ہے اور یہ تبھی

ممکن ہے جبکہ ہر فرد معاشرہ کو اس کا جائز مقام حاصل ہو، باہمی مشاورت سے فضا خوشگوار ہوتی ہے اور قانون کی حکمرانی سے جینے کا حوصلہ ملتا ہے تعلقات کی ہر نوعِ لائق التفات ہے مگر انسانی تعلق ہر حال میں معتبر ہے، اس کو سرافرازی حاصل ہونا چاہیے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ:38)

اور آپس کے معاملات مشورے سے ہونے چاہیں۔

میں عزتِ نفس کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور مجموعی مفاد کا بھی، ہر انسان مکلف ہے مگر ایک حد تک، استطاعت سے بڑھ کر مطالبہ نہ چاہیے اور کم تر کو نظر انداز نہ کیا جانے چاہیے، ہر انسان معاشرتی بندھنوں میں ایک حد تک آزاد ہے اور اس سے آگے مجبور بھی۔ برائی ہر معاشرے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے مگر اس کو سکہ رائج الوقت نہیں بننا چاہیے۔ نیکیاں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

برائی بدکرداری کی شکل میں بھی ہوتی ہے اور غیر مناسب رویوں کے روپ میں بھی، ان سب حالتوں میں نیکی کی سطوت سب سے بڑا محافظ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے بدی سے نفرت کا درس دیا مگر بروں کو اپنانے کی تلقین کی کہ یہی اصلاح کی صورت ہے۔

غرضیکہ حضور اکرم ﷺ نے اصلاح معاشرہ کا نہایت جامع، بہت ہی ارفع اور بہر صورت بے لاگ طریقہ عمل نافذ کیا جس کے اثرات بہت جلد نمایاں ہوئے اور جس کی برکات ہر معاشرے میں محسوس کی جانے لگیں، یہ اصلاحی چارٹر ہر دور کے لئے ہے اور ہر انسان کے لئے ہے۔ جب بھی اور جہاں کہیں بھی اس کو نافذ کیا جائے گا اس کے اثرات پورے معاشرے کو فیض یاب کریں گے، ضرورت نفاذ کی ہے، اپنانے کی ہے۔ اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی ہے آج کا انسان پھر سے جاہلی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ معاشرتی اصلاح کا یہ چارٹر کسی قوت نافذہ کا منتظر ہے۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے کہ اسی میں سب کا بھلا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کی عالمگیریت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مبعوث کیے گئے رسولانِ گرامی کے خاتم بن کر تشریف لائے، اس طرح وہ سلسلہ ہدایت جو الہام ووحی کے یقین کے ساتھ تخلیق آدم علیہ السلام سے ہی شروع ہوا اپنی معراج کو پہنچا۔ یہ اُس خالقِ رحیم وکریم کی بے پایاں رحمت کا اظہار تھا کہ انسان اول کو ہی نبوت کی سرافرازی عطا کر دی گئی اور مقصد تخلیق کے مطابق زندگی گزارنے کا سلیقہ واضح کر دیا گیا۔ قافلۂ انسانیت نسل در نسل کے تسلسل سے پھیلتا چلا گیا اور خلیفہ ارضی اس سرزمین پر مہیا کی گئی برکات کو سمیٹنے لگا، تعداد اور صلاحیت فزوں ہوتی گئی تو ہدایت کے پیغام بھی وسعت پذیر ہوتے گئے، انبیاء کرام اور رسولانِ عظام علیہم السلام ہدایت کے داعی اور صبغۃ اللہ کے پیکر بن کر حیات انسانی کو منور کرتے گئے، کوئی لمحہ اور کوئی خطہء زمین ایسا نہ رہا جہاں آداب شناسی کی تعلیم نہ پہنچی ہو، یہ ہمہ جہت راہبری مسلسل جاری رہی، جب بھی تلاش رزق، حصولِ منفعت اور خواہش اقتدار نے نسل انسانی کو لرزایا وہاں ہی پیغام ہدایت کا کوئی حامل تشریف لایا اس طرح ہر تخریب کو تعمیر کی راستی اور ہر کجی کو عمل کی سلامتی کا درس ملتا رہا۔ یہ سلسلہ رشد اگرچہ مسلسل جاری رہا مگر ہر پیغام بر کا ہدف اور مقصود زمان ومکان کی حد بندیوں میں محصور رہا، یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان روشنیوں کا اپنا حدود اربعہ تھا اور ان سے نور پانے والوں کی اپنی محدودیت تھی یہ دراصل آفاقیت کے ابتدائی پڑاؤ تھے جہاں ایسی تربیت مہیا کی جا رہی تھی جو انسانی فکر کو اس عالمگیریت کے لئے

تیار کر سکے جو مقصدِ تخلیق بھی ہے اور حاصل زیست بھی۔

قرآن مجید جو ھدیً للناس کے عظیم تر مقصود کے لئے مکمل، ہمہ جہت اور لافانی دعوت ہے نے ماقبل رسولان گرامی کے تذکرے میں اس اساسی نقطہ کو ہمیشہ واضح کیا تا کہ کوئی قاری رسالت ونبوت کے تسلسل اور ختم نبوت کی کاملیت سے صرفِ نظر نہ کر سکے، انبیاء سابقین علیہم السلام کی تبلیغی مساعی کا ذکر قرآن مجید کا ایک وسیع تر موضوع ہے، اگر بنظر تعمق قصص انبیاء کرام علیہم السلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سابقہ پیغامات اور موجودہ پیغام کا امتیاز کیا ہے قرآن مجید نے منشورِ ہدایت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے پیغام کی وحدت کا ذکر کیا تو مخاطب اقوام کی حد بندی پر بھی واضح اشارات دیئے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اپنے مشن کی عظمت اور پیغام کی وسعت کے حوالے سے ایک قوم کے بانی کہلائے آپ کو خطاب یہ تھا۔

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ (طٰہٰ:24)

ترجمہ: فرعون کی طرف جایئے کہ وہ بڑا سرکش ہوا ہے۔

یہی مشن تھا جس کی تکمیل کا آپ نے خود بھی اعلان فرما دیا۔

وَقَالَ مُوۡسٰى يٰفِرۡعَوۡنُ اِنِّىۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۴﴾

(الاعراف:104)

ترجمہ: اور فرمایا موسیٰ علیہ السلام نے، اے فرعون میں رب العالمین کا رسول ہوں۔

یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ یہ بنی اسرائیل ہی تھے جو دامنِ نبوت سے وابستگی کا شرف پا رہے تھے اس لئے سمندر سے پار اترنا ان کا مقدر بنا تھا فرمایا گیا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ۔ (یونس 90)

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار اُتار دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوا تو برملا کہا گیا۔

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ (ال عمران 49)

ترجمہ: اور آپ بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے۔

اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ ہوا کہ کبھی نسبت کسی قوم کی طرف کردی گئی تو کبھی کسی علاقے، بستی یا شہر کی طرف، یہ نسبتیں واضح کر رہی ہیں کہ ان فرستادگانِ الٰہی کا مقصود متعین تھا جو نسلی حد بندی میں محصور تھا یا علاقائی چوگردہ میں بند کیا گیا تھا۔

حد بندیوں کے ان اشارات کے بعد نبی آخر الزمان علیہ التحیۃ والثناء کا ذکر پڑھئے تو قرآن مجید کی ہر آیت اور ہر اشارہ الم نشرح کر رہا ہے کہ اب نبی کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آفاقیت اور پیغام کی عالمگیرت اور سرمدیت کا ذکر ہے۔ چند حوالے شمار کیجئے۔ ارشاد ہوا۔

قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ (الاعراف:158)

ترجمہ: فرمادیجئے کہ اے سب انسانو میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔

پھر فرمایا۔

وَاَرْسَلْنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا (النساء:79)

ترجمہ: اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا۔

ارشاد ہوا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا (السباء:28)

ترجمہ: اور ہم نے تو آپ کو سب انسانوں کے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا

کر بھیجا ہے۔ اور فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء:107)

ترجمہ: اور ہم نے تو آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔

ان آیات نے اس خصوصی منزلت کو واضح کر دیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری انسانیت کے لئے رسول ہیں کبھی جمیعاً کہہ کر سب کا احاطہ کیا تو کبھی کَآفَّۃً کہہ کر ہمہ گیریت کو بے غبار کیا تو کبھی عالمین فرما کر اور ال کا استغراق داخل کر کے تمام جہانوں بلکہ ہر ہر جہان کے ہر ہر ذرے اور ہر ہر جزو کو شامل فرما دیا اس سے نبوت ورسالت کی آفاقیت واضح ہو گئی۔

اب یہ سوال کہ یہ ہمہ گیریت منصب نبوت کا وصف ہے یا یہ پیغام کی عالمگیریت کے لئے دلیل ہے تو آیئے چند حوالے پیش نظر رکھتے ہیں، فرمایا گیا کہ قرآن مجید جو پیغام رسالت کا متن ہے۔

اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (ص:87)

ترجمہ: یہ تو تمام جہانوں کے لئے ذکر ہے۔

سورہ القلم میں

وَمَا ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (القلم:53)

کہ یہ عالمین کے لئے نصیحت ہے

اسی طرح کا اعلان سورہ الانعام میں بھی ہوا۔ پھر اس ذکر کی ہمہ گیریت کے عملی پہلو کا یوں تذکرہ ہوا۔

وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (النحل:89)

ترجمہ: اور ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی جو ہر شئی کا کھلا بیان ہے۔

سورہ النحل میں نزولِ ذکر کا مقصود بیان ہوا۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ (النحل:44)

کہ آپ لوگوں کے لئے اس کو بیان کردیں۔ یہ سوال کہ کیا اس پیغام ہدایت اور اس دینِ کامل کو ایک سلسلہ رشد سمجھا جائے اور دیگر موجود ادیان کو بھی اس کا ہم سفر گردان لیا جائے تو اس کی وضاحت یوں فرما دی گئی۔

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٩﴾ (الصف:9)

ترجمہ: وہ پروردگار جس نے اپنا رسول ہدایت کے ساتھ اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ رسول اس دین کو تمام ادیان پر غالب کردے اگرچہ مشرک ناپسند کریں۔

پیغام کو صرف ایک اضافی یا معاون طریقہ زندگی نہیں بننا ہے بلکہ اُس کو اپنی حقانیت اور ہمہ گیری کی وجہ سے سب پر غالب آنا ہے، یہ ارشاد ربانی پیغام کی عالمگیرت کا حتمی اعلان ہے کہ اب کسی اور طریق حیات کی گنجائش نہیں رہی۔ یہ اعلان قیامت تک کے لئے ہے اس لئے دین اسلام کو ہر دور اور ہر منزل پر برتر رہنا ہے اور اپنی سرمدیت کا وجود ثابت کرنا ہے۔ کیونکہ یہ پیغام ہر نسل اور ہر علاقے کی ضرورت ہے اس لئے اسے بہر طور اصل حالت میں برقرار رہنا ہے، یہی ضرورت بقا اس کو پناہ ربانی عطا کرتی ہے۔ اور لفظاً اور معناً زندہ رہنے کی عظمت عطا کرتی ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿٩﴾ (الحجر:9)

ترجمہ: بیشک ہم ہی نے یہ ذکر نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کے لئے حفاظت کرنے والے ہیں۔

پیغام کی بقا اس کی ابدیت کی دلیل ہے اور اس کا محفوظ رہنا اس کی ہمہ گیر افادیت وضرورت کی حتمیت ہے اس لئے واضح کر دیا گیا کہ اس پیغام پر عمل کرنے والو کبھی اس ذہنی کجروی کا شکار نہ ہو کہ اگر یہ باقی نہ رہے تو کیا ہوگا۔ یقین رکھو کہ اسے بہر حال اور ہر طور باقی رہنا ہے اور اصل حالت میں رہنا ہے کہ یہ صحیفہ وقت کی تنگ نائے کا اسیر نہیں ہے بلکہ ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما کا مصداق ہے اس لئے یہ بے مثل ہے کہ متوازی ہدایت یا ہمسری کا دعویٰ ہدایت کے لزوم سے ہی انکار نہیں ہوتا اس کی عظمت سے بھی انحراف ہوتا ہے اس لئے بار بار فرمایا گیا اس پیغام آخرین کی دائمی حیثیت پر شک ہے تو دس نہیں پانچ بلکہ ایک ہی سورت بنا لاؤ کہ آخر عربی کا کلام ہے اس کے حروفِ ہجاء زبان کے باہر سے تو نہیں لئے گئے اس کے کلمات کی ساخت اور کلمات کی ترکیب میں بھی کوئی نیا اصول وضع نہیں کیا گیا سوچو تو سہی سب کچھ تمہارے مروج انداز سے لیا گیا مگر پھر بھی مثل نہ لاسکو تو اعتراف کر لو کہ یہ پیغام الٰہی ہے دائمی ہے عالمگیر ہے اور بے مثل ہے۔

اس اعتراف پر رک کر سوچیے کہ آخر اس کتاب کو یہ امتیاز کیوں ملا، یہ تنزیل ہے تو پہلی کتابیں بھی نازل کی گئی ہیں اس میں ہدایت ہے تو ہدایت ونور کا اعلان تو پہلی کتابوں کے لئے بھی ہوا تھا یہ بھی سوچیے کہ مثل لانے کا چیلنج بھی تو اسی قران نے دیا ہے سابقہ الہامی کتب معتبر اور مقدس تھیں مگر اعلان کی حد تک بھی کسی نے یہ انداز نہیں اپنایا، کیا یہ دلیل نہیں کہ ان کا زمانہ اور عہد مقرر تھا اسی لئے ہر دور اور ہر عہد کو یہ

دعوت نہیں دی گئی، قرآنی پیغام چونکہ عالمگیر تھا اسی لئے اس کے متبادل، اس کے مماثل اور اس کے ہمسر کی ہر طرح تردید کی گئی اور یہ تردید صدیوں کے تعامل سے اپنا نقش جما چکی ہے۔ خالقِ کائنات کا یہ اعلان کہ اس کتاب مقدس کا وہ خود محافظ ہے اس کی عالمگیریت کی ضمانت ہے کہ دائمی پیغام کی حفاظت نہ کی گئی تو دوام کا نقش دھندلا جائے گا۔ یہ دوام اس نبوت کی آفاقیت کا بھی اعلان ہے کہ ہر دور کے نبی کا ہدایت کا نوشتہ بحفاظت رہنا چاہیے۔

قرآن مجید کی ہدایت کا یہ رخ اُس عالمگیریت کا نشان ہے کہ اس ہدایت کے مشتملات تمام نوع بشر کی ہر کیفیت، ہر ضرورت اور ہر دور اور ہر عہد کے لئے کفایت کرتے ہیں۔ انسانی زندگی مادہ اور روح سے عبارت ہے۔ مادی زندگی کے اپنے تقاضے ہیں اور روح کے اپنے، ہدایت کا وہی نوشتہ پوری نسل انسانی کے لئے باعث شرف ہوگا جو دونوں تقاضوں کو مکمل اور مربوط راہنمائی مہیا کرے۔

تاریخ انسانی گواہ ہے کہ انسان نے اپنی ہدایت اور فلاح کے کئی چارٹر تیار کئے اور عملی طور پر ان کو بروئے کار بھی لایا۔ کوئی تو وجود میں آتے ہیں اپنی افادیت کھو بیٹھے تو کوئی چند روز یا چند سال انسانی نظریات کو گرویدہ بناتے رہے مگر جلد ہی ان کی بے ثباتی نمایاں ہونے لگی۔ ذہنی انتشار، عملی خلفشار انسان کو بے توفیق بناتا رہا مگر نبی اکرم ﷺ کا پیغام ہدایت عرب کے بدوی ماحول میں بھی انسان سازی کا اُجلا پیمانہ بنا اور دنیا کے مہذب و متمدن علاقوں میں بھی جسم و روح کی روئیدگی کا ذریعہ رہا۔ صدیاں گزرتی گئیں پیغام نبوی نو بہ نو رتوں اور تازہ بہ تازہ شادابیوں کے ساتھ نسلِ انسانی کا راہنما رہا اس پیغام نے انسان کی فکری راہنمائی کی۔ غور و فکر کو تازگی،

عقل و شعور کو تجسس اور فہم و فراست کو توانائی مہیا کی تو جسم کو شادابی، حواس کو شائستگی اور رویوں کو متانت عطا کی، عصبیت و تعصب کے عفریت سے رہائی دلا کر وقار انسانی بحال کیا، آقا و غلام کا امتیاز ہٹا کر احسن تقویم کی نمود کی، معاشرتی بے اعتدالیوں کو کلکم من آدم و آدم من تراب کی اساس عطا کر کے شرفِ آدمیت کا بول بالا کیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ نسلی امتیازات نے کسی کو فرعون بنا دیا تو کوئی بے بسی کی تصویر بن کر باجگزار ٹھہرا برہمن اور شودر کا قصہ تو ہمارے قریب ہے یہ معاشرتی دراڑ اس قدر وسیع ہوگئی تھی کہ شودر انسان ہوتے ہوئے بھی ناپاک قرار پایا اس قدر ملیچھ کہ ہاتھ تو کجا، وید کا سننا بھی اسی کے لئے جرم، بے خبری میں بلا ارادہ وید کا کلمہ شودر کی شنوائی کی حد میں آ گیا تو رگِ اوتار بھڑک گئی۔ سیسہ پگھلا کر کانوں میں ڈال دیا گیا، کسی قدر تنگ نظری تھی کہ سماعتوں کی معصومیت بھی جرم تھی۔ مگر نبی کریم ﷺ کا پیغام گلی گلی، محلہ محلہ سنایا جا رہا ہے سننے پر پابندی نہ وصول کرنے پر، جو پائے پڑھے اور جو چاہتے چھاپ لے۔ پیغام ہر انسان کے ضمیر پر دستک دینے لگا اور صدیوں سے دے رہا ہے کیا یہ رویہ عالمگیریت کے حامل پیغام کے سوا کوئی اپنا سکتا ہے؟

پیغام کی تعلیمات کا حرف حرف دعوتِ فکر دے رہا ہے، اعمال کے احکام جاری تو ہوئے مگر ہر انسان کی بساط کو پیشِ نظر رکھا گیا تا کہ انسانی زندگی کا کوئی لمحہ بھی پیغام کے رابطے سے باہر نہ رہ جائے۔ صرف کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا حکم ہوتا تو کھڑے ہونے کی استطاعت نہ پانے والا محروم رہ جاتا مگر ایسا نہیں ہوا ہر حالت اور ہر کیفیت حتیٰ کہ موسمی حالات اور جغرافیائی عوامل کو ملحوظ رکھا گیا، پیغام کی تبلیغ اس کے عمومی رخ کو واضح کرتی ہے تو جبر و اکراہ کی ممانعت انسانی اختیار کے احترام کا ثبوت

مہیا کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ نبی اکرم ﷺ کے پیغام کی دعوت تمام نوع انسانی کے لئے ہے اس میں کسی کا استثناء نہیں اور یہ دعوت لمحاتی یا وقتی نہیں ہر دور کے لئے ہے، سوچئے اگر یہ پیغام دائمی ہے عالمگیر ہے اور نو بنو ہے تو پھر آج کے مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہے؟ کیا تعلیمات کی اشاعت ان پر فرض نہیں؟ کیا احکام باطلہ کی عقلی دلائل سے اصلاح امت پر واجب نہیں؟ کیا تعلیمات کو کردار وسیرت کی استواری درکار نہیں؟ آج مسلمان امت پر تنگ نظری، توہم پرستی اور عدم برداشت کے الزام کس روش کی نشاندہی کررہے ہیں؟ کیا نظریات میں اس طرح انقلاب آیا کرتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو اپنے دور کی سب سے بڑی اور مستحکم حکومت اس پر کاربند ہوتی؟ اسلام ایسی اطاعت کو قبول نہیں کرتا جس میں قلبی انقیاد شامل نہ ہو، اسی لئے تو گردنیں جھکانے سے زیادہ اعتبار دلوں کی تسخیر کا رہا۔ آیئے کردار کی قوت سیرت کی روشنی، اخلاق کے حسن اور اعمال کی صالحیت سے نبی اکرم ﷺ کے پیغام کی عالمگیریت کے لئے مخلصانہ کوشش کریں تا کہ گردش زمانہ ایک بار پھر قرون اولی کے دور ہمایوں سے تسخیر ہو سکے

آمین۔

تعلیمات نبوی ﷺ اور عالمگیر تہذیب کا تصور

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید نے ایک اساسی حقیقت کا برملا اظہار کیا ہے یہ کہ رسولان گرامی، خواہ کسی دور، وقت، قوم یا علاقہ میں تشریف لائیں اُن کی منزلت کا اعتراف لازم ہے اور یہ کہ سب برگزیدہ وجود ہیں اور سب بنیادی مشترک تعلیم کی ترسیخ کے لئے تشریف لائے تھے۔ ہاں یہ ضرور واضح کیا گیا کہ سب کا دائرہ کار مقرر تھا، اگر ان محترم رسولان گرامی میں سے کوئی ایک قوم کا نجات دہندہ بن کر آیا تو دوسرا کسی اور قوم یا علاقے کے لئے راہبر وراہنما قرار پایا مثلاً اس تحدید کا ذکر قرآن مجید نے یوں کیا کہ:

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا (الاعراف:65)

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا (الاعراف:73)

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا (هود:84)

یا کسی خودسری کی اصلاح کی تحدید کے ساتھ:

اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (طٰہٰ:24)

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ (آل عمران:49)

یہ پیغامات واضح کررہے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام مخصوص ماحول، محدود علاقے اور نام زد کی گئی قوم کی راہنمائی اور تربیت کے مکلف بنائے گئے تھے، اہداف

کی حد بندی، نبوی اصلاح اور الہامی تہذیب کی عالمگیریت کا ذریعہ نہ بن سکتی تھی کہ انسانی تہذیب کو مختلف انواع واطراف کا پابند بنایا گیا تھا، یہ شرف کہ عالمگیر تہذیب وتمدن وجود میں آئے صرف اور صرف نبی آخر الزمان ﷺ کا امتیاز رہا کہ آپ ﷺ کی بعثت انسانی گروہوں اور طبقوں کے لئے محدود نہ تھی بلکہ اس کو ہمہ گیری کے شرف کا حامل قرار دیا گیا تھا، ارشاد رب کائنات ہے:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف:185)

واضح کر دیا گیا کہ آپ ﷺ کو اپنی رسالت کا اعلان ہی اس ہمہ گیریت کے حوالے سے کرنا ہے کہ نسلِ انسانی کا کوئی مظہر بھی کیوں نہ ہو سب کو ایک ہی دائرہ ہدایت کا پابند رہنا ہے۔ اس میں نہ کسی قوم کا تعین ہوا نہ کسی خاندان کا، نہ ہی کسی علاقے کی تحدید ہوئی اور نہ زمانے کی محدودیت کی جو بھی انسان ہے اُس کی ہدایت کی کفالت نبی آفاق ﷺ کے وجود سے ہے، ایک مرکز ہدایت، نسلِ انسانی کے تنوع میں وحدت کی تعمیر کر رہا ہے جس سے انسانی تمدن یک رنگ اور انسانی تہذیب آفاقی مظہر قرار پاتی ہے۔ یہ تو مقصدِ بعثت تھا جس کی نشاندہی ہر ہر عمل سے ہوئی۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء:107)

سے حیطۂ رحمت ہی وسیع نہیں ہوا، انسانی گروہوں کو تعلق نبوت کی سرافرازی کی وحدت بھی نصیب ہوئی کہ معاشرت کے سب مظاہر کے لئے ایک ہی نسبت کی استواری لازم قرار پائی، پوری انسانیت کے لئے یکساں مرکزِ رحمت نے عالمگیریت کو فروغ دیا، ایک ہی راہنما ہے تو ایک ہی مصدرِ رحمت ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تہذیب انسانی کے تمام رجحانات یکسو ہو گئے۔ وہ صحیفہ ہدایت جس نے انسان کو

بحیثیت انسان جینے کا سلیقہ بخشا وہ بھی وحدتِ پیغام کا علمبردار رہا کہ:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (القلم:52)

تہذیب کا کلمہ جہاں انسانی رویوں کا مظہر ہے وہاں اس میں غیر ضروری یا غیر مستحسن جوانب کی تراش کا مفہوم بھی شامل ہے۔ ایک درخت جو زمین کے سینے پر سر بلندی کا استعارہ بنتا ہے، کبھی قوتِ نمو کے اُستا خیزی سے غیر محدود صورت بھی اختیار کر لیتا ہے ایک ماہر باغبان کا فرض ہوتا ہے کہ توانائیوں کو بے ترتیبی کے مظاہر میں ضائع نہ ہونے دے اس لئے وہ بعض شاخوں کو کاٹ دیتا ہے اسی کو عرب تہذیب کہتے تھے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہوتا ہے کہ بیکار شاخیں سر بلندی کے جوہر کو بے توفیق بنا دیتی ہیں۔ اسی طرح انسانی نشوونما بعض اوقات غیر محدود رویوں کی دست بُرد سے رُک جاتی ہے بلکہ ناپید ہو جاتی ہے یہی موقعہ ہوتا ہے کہ راہنمائی عطا کرنے والے وجود یا ادارے لائقِ نفرت رویوں کو بیکار شاخ سمجھ کر کاٹ دیں، یہی تہذیبی عمل ہے جو دو متوازی رویوں کا متقاضی ہے نشوونما کے لئے معاون اعمال اور توانائیوں کے ضیاع کو روکنے کے لئے عمل جراحت۔ رسولان گرامی، ان دونوں مقاصد کے حصول کے لئے راہبری مہیا کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے حدود آشنائی کا یہی درس پوری انسانیت کو دیا تاکہ چمنستان دہر کا سارا حسن برقرار رہے۔ بشیر ونذیر ہونا اس عالمگیر تہذیب کے قیام کا بنیادی جوہر ہے۔

نبوی تعلیمات کا صدیوں کا تناظر واضح کر رہا ہے کہ انسانی اصلاح وفلاح کی ضمانت اسی میں ہے۔ پیغام کی حرمت اس کا تقدس اور اس کا غیر محرّف رہنا اس عالمگیریت کا نشان ہے یہ اعلان کہ خالق خود اس نوشتۂ ہدایت کا محافظ ہے، صرف

ایک اعزاز نہیں بلکہ یہ پیغام ہے کہ اگر حفاظت نہ ہوئی تو دوام کا نقش دھندلا جائے گا، یہ دوام تعلیمات کی آفاقیت کا نشان ہے۔تاریخ انسانی گواہ ہے کہ انسان نے اپنی عالمگیر تہذیبی اختصاص کو بچانے کے لئے کئی چارٹر تیار کئے مگر کوئی تو بنتے ہی بے توفیقی کی دلدل میں اترنے لگے تو کوئی ٹمٹماتے ستارے کی طرح محدود روشنی عطا کر کے تاریکیوں کی نذر ہو گیا مگر نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات عرب کے بدوی ماحول میں بھی انسان سازی اور انسانی تہذیب کے لئے رہنما رہیں تو دنیا کی مہذب ومتمدن قوموں کے لئے بھی ہیں یہ انسانی تاریخ کی حقیقت ہے کہ انسان کی خود ساختہ تعلیمات نے بڑے فرعون پیدا کئے جو تہذیبوں کو ہی نہیں قوموں کو بھی کھا گئے، ان پر خود غلط رویوں نے انسان کو برہمن اور شودر کے پاٹوں میں کچل ڈالا۔نبوی تعلیمات کا حسن دیکھئے کہ آپ ﷺ کا لایا ہوا بے مثل پیغام گلی گلی پڑھتا جارہا ہے۔انسانی تہذیب کا کفیل پیغام انسانوں سے دور کیسے رکھا جاسکتا تھا۔اس نے تو ہر انسان کے ضمیر پر دستک دینا ہے اور صدیوں سے یہ دستک دے رہا ہے یہ رویہ عالمگیریت کا اعلان بھی ہے اور نسلِ انسانی کی اُجلی تہذیب کا علمبردار بھی۔

آج مسلمان ملت صرف مادی ذرائع کے اعتبار سے ہی تہی دامن نہیں، تہذیبی رویوں میں بھی تنگ نظری کا شکار ہے، عالمگیر معاشرت کے داعی دین کے علمبردار اس قدر تنگ نظر ہو گئے ہیں کہ غیروں کو پیغام محبت اور درس تہذیب تو دور کی بات ہے اپنوں کے لئے بھی نشانِ جبر بن گئے ہیں سب کو دامن رحمت میں لپیٹنے والے نبی ﷺ کی رحمت عالمینی کا ہر تقاضا فراموش ہو گیا ہے۔جو صاحب قوت واختیار ہوتے ہوئے بھی بد سے بدترین دشمن کو برداشت کرتے رہے کہ اگر کانٹے بچھانے

والوں کے ردعمل میں کانٹے ہی بچھائے جائیں تو دنیا ہمہ اطراف خارستان بن جاتی جس کی ایک صورت ہماری کج روی سے پیدا ہوتی جارہی ہے۔

آیئے نبی اکرم ﷺ کی عالمگیر نبوت کا پیغام گھر گھر پہنچائیں اور اس آباد دنیا کو مزید شاداب بنائیں، یاد رکھئے فرائض منصبی کی کوتاہی مایوس ہی نہیں کرتی فساد بھی برپا کرتی ہے۔ساغر صدیقی نے کہا تھا:

تاحدِّ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں
پھولوں کے نگہبان سے کچھ بھول ہوئی ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کے روشنی میں علاقائی، نسلی، طبقاتی اور لسانی تعصبات کا حل

انسانی وجود کا وہ جوہر جو اُس کی پہنچان بھی ہے اور اُس کے وجود کا اقتضاد بھی اُس کی معاشرتی حس ہے۔ انسان کا انسان پن کسی معاشرے یا سماج ہی میں نمو پاتا ہے، یہ اس قدر بنیادی حقیقت ہے کہ اس کے بغیر انسان، انسانی صفات سے بہرہ مند نہیں ہوتا، ارسطو نے کہا تھا کہ جو انسان معاشرے میں رہنے کے قابل نہیں وہ یا تو حیوان ہے یا دیوتا۔ ارسطو کی مراد یہ ہے کہ وہ یا تو انسان کے مرتبہ سے گر کر حیوان ہو گیا ہے یا کوئی ماورائی وجود ہے۔ یہ مادرائیت کا تصور اُس دور میں عام تھا اور دیوتا اس تصور کے مظہر تھے۔ علماء لغت کا کہنا ہے کہ انسان کا کلمہ یا تو اُنس سے ہے یا نسیان سے، دراصل اُنس، انسانی وجود کا اساسی حوالہ ہے جس کے لئے معاشرتی ترکیب ناگزیر ہے، نسیان شدتِ اُنس کا ایک برعکس مظہر ہے۔ اس لئے یہ بھی سماجی تصور کا حامل ہے۔ مانوسیت کا یہ جذبہ انسانی تخلیق میں ازل سے ہی ودیعت ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً۔ (النساء:1)

ترجمہ: اے انسانو، اپنے اُس پروردگار سے ڈرتے رہو جس نے تمہیں ایک نفس

سے پیدا کیا اور اُس سے ہی اُس کا جوڑا پیدا فرمایا اور اُن دونوں سے کثیر تعداد میں مرد اور عورتوں کو پھیلا دیا۔

مزید ارشاد ہوا۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا۔ (الاعراف:189)

ترجمہ: وہ ذاتِ خالق جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا فرمایا اور اُس سے اُس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اُس کی جانب سے سکون پائے۔

اسی حقیقت کا بیان سورہ الزمر میں بھی ہوا۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (الزمر:6)

ترجمہ: اس خالق نے تمہیں ایک نفس سے پیدا فرمایا پھر اُس نے اُس سے اُس کا جوڑا بنایا۔

ایک اور تفصیلی ارشاد۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ۔ (الانعام:98)

ترجمہ: وہی خالق ہے جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا فرمایا۔ پھر ایک ٹھہرنے کا مقام اور ایک امانت رکھنے کا مقام بنایا ہے بیشک ہم نے آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا اُس قوم کے لئے جو سمجھ رکھنے والی ہے۔

ان ارشادات سے واضح ہوا کہ نسلِ انسانی کا سلسلہ ایک نفس سے جاری ہوا خالق جو واحد و یکتا ہے اُس نے ایک نفس کی تخلیق کی جس سے نسل در نسل انسانی قافلہ

روان دواں ہوا، زوج یعنی جوڑا ایک سے ہی پیدا کیا گیا پھر مرد وعورت کا ایک وسیع تر سلسلہ پھیلتا گیا، ان آیات سے چند اساسی نقاط واضح ہو گئے مثلاً۔

خالق واحد ہے اور سب مخلوق اسی واحد کی تخلیق ہے۔

نسلِ انسانی کا سارا سلسلہ ایک وجود سے جاری ہوا۔

زوج کی تخلیق کا مقصد تسکین وطمانیت ہے۔

یہ سلسلہ تخلیق اصحاب فکر ودانش کے لئے دعوتِ فکر ہے۔

اور یہ کہ اس دعوت کے تمام پہلو واضح ہیں۔ کہیں بھی الجھاؤ نہیں۔ اس حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے اپنے خطبہ حج میں مزید تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ، كُلُّكُمْ لِاٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔ (مسند احمد۔ خطبہ حجۃ الوداع)

ترجمہ: اے لوگو، بلاشبہ تمہارا رب ایک ہے اور بلاشبہ تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہو آدم (علیہ السلام) مٹی سے بنائے گئے۔

قرآنی ارشادات اور فرامین نبوی کا تقاضا یہ ہے کہ

وحدت نسلِ انسانی پر یقین رکھا جائے۔

اور اس یقین کو روبہ عمل لا کر وحدت انسانیت کی فضا قائم کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے تخریبی عوامل ہیں جو وحدتِ نسلِ انسانی کے تصور کو داغدار کرتے ہیں اور خالق کے برملا اعلان کے باوجود باہمی آویزش بار بار کیوں سر اٹھاتی ہے؟ چند ایسے عوامل کی نشاندہی کی جارہی ہے جو اس تصور وحدت پر شب خون مارتے ہیں:

1۔ نسلی تعصّبات:

یہ وہ منفی رجحانات ہیں جو ہر دور میں تقسیم در تقسیم کے ذمہ دار رہے ہیں۔ خاندان کی برتر حیثیت، نسبتوں کا غرور اور آباء واجداد پر بے جا فخر، یہ سب اس مہلک میلان ورجحان کے مختلف حوالے ہیں، حیرت ہے کہ اس خود پسندی کا اظہار اس وقت بھی ہوا جبکہ تخلیق آدم کی ابتداء ہورہی تھی۔ قرآن مجید نے اس کا واضح ذکر کیا، تخلیق کا اولین مرحلہ تھا کہ فرشتوں کو ایک وجود جو عناصر سے ترکیب پارہا تھا پر اپنے تحفظات کے اظہار کا موقعہ ملا:

اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ (البقرہ:30)

میں زمین میں ایک نائب بنانے لگا ہوں۔

کی خبر پر فرشتے عرض کرنے لگے۔

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ (البقرہ:30)

آپ زمین میں ایسے کو بنانے لگے ہیں جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔

فرشتوں نے صرف اس تحفظ کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ یہ بھی عرض کیا۔

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔ (البقرہ:30)

اور ہم ہیں کہ تیری حمد کی تسبیح کرتے ہیں اور تیرے لئے پاکیزگی بھی بیان کرتے ہیں۔

فرشتے یہ سمجھ کر کہ تخلیق کا مقصد ایسی مخلوق ہی ہے جو خالق کی حمد وتقدیس بیان کرے اور وہ خود یہ فرض بخوبی نبھا رہے ہیں اس لئے نائب بنانے کی ضرورت

کیا ہے؟ جبکہ یہ تخلیق کیا جانے والا فساد کرنے والا اور خون ریزی کرنے والا ہوگا تو وہ یہ منصب کیسے نبھائے گا۔ یہ تحفظ ایک استخراج کی بنیاد پر تھا جو بن ایۃ ارتکابِ عمل سے پہلے ہوا۔ اس پیش قدمی حملہ کے باوجود خالق نے ناراضی کا اظہار نہ فرمایا صرف یہ فرمایا۔

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ:30)

میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

واضح کر دیا گیا کہ تخلیقِ خلیفہ کے مقاصد اور مدعا کو تم نہیں جانتے ہو اس لئے سوال اٹھا رہے ہو، حیرت ہے اس قدر بڑا حملہ ہوا مگر نہ عتاب ہوا نہ سرزش بلکہ صرف عدمِ علم کا ذکر کر کے خاموش کرا دیا گیا۔ لیکن جب وہ مرحلہ آیا کہ اعتراف عظمت کا اعلان کیا جائے تو شیطان معترض ہوا حکم ملا کہ سجدہ کرو تو فرشتوں نے سجدہ کر دیا اگرچہ انہوں نے سوال اٹھایا تھا مگر نافرمان نہ تھے ہاں شیطان سجدہ گزاروں میں سے نہ تھا، حکم عدولی کی وضاحت طلب کی گئی۔ ارشاد ہوا۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ۔ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ۔ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۔ (الاعراف:11۔12)

ترجمہ: کہا خالقِ کائنات نے، تجھے کس نے روکا ہے کہ تو سجدہ کرے جبکہ میں نے تجھے حکم دیا کہنے لگا میں اس سے برتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔

ابلیس کا سجدہ سے انکار اس لئے تھا کہ وہ اپنی برتری کا زعم رکھتا تھا یہ تو حقیقت تھی کہ وہ آگ سے پیدا کیا گیا تھا اور آدم علیہ السلام مٹی سے، آگ اُس کی تخلیقی بنیاد تھی اور مٹی آدم علیہ السلام کی، واقعہ تو یقینی طور پر یہی تھا اور اسی کو اُس نے انکار کی

اساس بنایا تھا مگر بھول گیا کہ تخلیق کا عمل تو خالق کا ہے وہ کہاں سے اور کس عنصر سے تخلیق کرے یہ تو اُس کی رضا ہے یہ حملہ خالق کی تخلیق پر تھا اس لئے شدت سے رد کر دیا گیا اور ابلیس اسی بنا پر راندۂ درگاہ ٹھہرا۔ معلوم ہوا نسلی برتری کا وہ عفریت جو آج کل ہر ملک، شہر، بستی اور کوچہ بازار میں برہنہ ناچ رہا ہے اسی شیطانی روش کا آئینہ دار ہے کہ شیطان نے روزِ اول ہی اس نسلی تفاوت اور گروہ بندی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اس نسلی خمار نے شیطان کی پیروی میں کس کس کو ورغلایا اور کس قدر عدم مساوات کا اضطراب پیدا کیا، عصرِ حاضر کا انسان اس کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ امتیازات کا یہ فتنہ شیطانی فتنہ ہے خالق جن وبشر نے اس کو ابتداء ہی میں رد کیا بلکہ اس کے پرچارک کو سزا بھی دی، نبی اکرم ﷺ نے بھی اسلامی معاشرت کے قیام کے ساتھ ہی ایسی فتنہ پرور روش پر شدید ضرب لگائی اور انسانی گروہ کو اس انسان دشمن رویے سے سختی سے روکا، نبی رحمت ﷺ نے برملا فرمایا۔

مَنْ قُتِلَ تَحْتَ رَايَةٍ عُمِّيَّةٍ يَدْعُوْ عَصَبِيَّةً اَوْ يَنْتَصِرُ عَصَبِيَّةً فَقِتْلَةٌ جَاهِلِيَّةٌ۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارہ باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین)

ترجمہ: جو اندھی عصبیت کے پرچم کے تحت قتل ہوا۔ وہ عصبیتِ قومی کی بنیاد پر دعوت دیتا تھا یا اسی عصبیت کی خاطر مدد کرتا ہے تو اُس کا قتل جاہلی طریق پر ہے۔

2۔ رنگ وروپ کا افتخار:

انسانی معاشروں میں برتری کا خبط رنگ وروپ کے امتیازات سے بھی جنم لیتا ہے۔ گورے کالے کی آویزش بلکہ تصادم کے کئی گھاؤ تاریخ انسانی میں اس قدر گہرے ہیں کہ عقل وشعور کا تریاق بھی ان کو مندمل نہیں کر سکا، حبشی غلاموں کی

حالتِ زار، ریڈ انڈین کا اندوہناک اضطراب، آریاؤں کے ہاتھوں کول، دراوڑ کا استیصال، معلوم تاریخ کا وہ سیاہ باب ہے کہ روشن خیالی اور وسیع النظری کا کوئی دعویٰ بھی اس کا جواز نہیں بن سکا، یہ تو دینِ اسلام کا پیغام سلامتی ہے اور یہ رحمت عالمین ﷺ کا مشفقانہ اور مربیانہ کردار ہے کہ جس نے ایک مقتدر حاکم اور خلیفہ وقت کو جو ہر دورِ حکمرانی کے لئے راہبر و راہنما قرار دیا گیا ہے ایک حبشی غلام کو سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کہہ کر خطاب کرنے کا ذوق عطا فرمایا، احمر و اسود کو ایک صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونے کا حوصلہ اور سلیقہ عطا کیا۔ شاہِ حبش نجاشی کی وفات پر فاصلوں کی خلیج کے باوجود اصحاب کو جن میں قریش کے وہ افراد بھی تھے جو نورِ نبوت سے مستفید ہونے سے قبل انصارِ مدینہ کو بھی ہمسر نہ گردانتے تھے، صف در صف کھڑے کر کے نجاشی کی نیک روش کو نبوی استحسان کا مستحق ٹھہرایا اور اور رنگ و روپ کی خلیج کو بھی اپنے اسوہ سے پاٹ ڈالا۔ اور خاندانی تفاخر اور رنگ روپ کے امتیازات کا خاتمہ کر دیا۔

3۔ علاقائی اور طبقاتی تعصبات:

اللہ تعالیٰ نے ہبوطِ آدم علیہ السلام کے انقلابی لمحہ پر ہی یہ اعلان فرما دیا تھا کہ زمین ساری نسل آدم کے لئے مستقر بھی ہوگی اور اس زمین کے اندر پوشیدہ نعمتیں قیامت تک کے لئے متاع یعنی سامانِ زیست بھی ہوں گی، لابدی تھا کہ نسل انسانی کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ زمین کے مختلف گوشے آباد ہوتے جائیں، مہیا کردہ وسعت کا تقاضا تھا کہ انسان کسی گھٹن کا شکار نہ ہو اور نہ ہی وہ کسی دوسرے کے لئے راستہ مسدود کرے یہ ایک سہولت تھی مگر پست خیالی نے اس سہولت کو وجہ تفاخر بنا لیا اور علاقائی حوالوں سے نسلِ انسانی تقسیم ہونے لگی، یہ عرب ہے اور وہ غیر عرب، یہ امریکی

ہے اور وہ افغانی، یہ ہندی اور وہ جاپانی، حد بندی کی یہ تنگ نائے انسان کو تقسیم کرتی گئی جس سے خود غرضی اور نفرت جنم لینے لگی اور بالآخر یہ باہمی مغایرت نسلی افتراق اور علاقائی تقسیم کا سبب بنی، تاریخ کے سینے میں قتل و غارت گری کی ان گنت اندوہناک داستانیں اسی کج فہمی کا شاخسانہ ہیں، مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی اور انسانی فلاح کا ہمہ جہت پیغام لانے والی اولین ریاست کے خدوخال پر ایک طائرانہ نظر ہی یہ حقیقت عیاں کر دے گی کہ ایک مثالی انسانی معاشرہ کیسے تشکیل پاتا ہے۔ قرشی سردار جو طبقاتی سرافرازیوں کے اس قدر گرویدہ تھے کہ کسی کو ہمسر ہی نہ گردانتے تھے کہ ہر غیر موالی تو ہو سکتا تھا عربی نہیں، اُن کے برابر، ہاں بالکل برابر کر دیا گیا رومی، فارسی اور حبشی یوں کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہوئے کہ وحدتِ نسل انسانی کی ایک کہکشاں سجی ہوئی معلوم ہوتی ہے، یہ انقلاب اس لئے بالفعل برپا ہوا کہ رحمت عالمین ﷺ سب کے سامنے ہی نہیں مستقبل کے لئے بھی پوری وضاحت بلکہ بے لاگ وضاحت سے یہ فرما رہے تھے۔

كُلُّكُمْ لِآدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ. إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقٰكُمْ.
لَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ إِلَّا بِالتَّقْوٰى. (مسند احمد خطبہ حجۃ الوداع)

ترجمہ: تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے تھے۔ بے شک تم میں معزز تر وہ ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک، جو تم میں زیادہ متقی ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ سے۔ معلوم ہوا اسلام نے عربی و عجمی کی برتری کے ہر علاقائی و طبقاتی تفاوت کو ختم کر دیا۔ تقویٰ وجہ شرف ہے اور تقویٰ شعار عرب کا رہنے والا بھی ہو سکتا ہے اور عجم کا رہنے والا بھی، اللہ اللہ کس قوت و شدت سے علاقی و طبقاتی تعصبات کو پامال کر ڈالا۔ تاریخ اسلام اس واضح فرمان کے اثرات اور ثمرات سے بھری پڑی ہے۔

۴۔ لسانی تعصّبات:

زبان جو اظہار کا ایک ذریعہ تھی کہ اسی سے ترابط کا سلسلہ مستحکم ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے انسانی انحطاط کے ساتھ وجہ افتخار و افتراق بن گئی۔ نسلِ انسانی پہلی تو حالات، حوائج اور جوگردہ میں قدرتی مظاہر کی تعبیر نے مختلف گروہوں میں لسانی تفاوت پیدا کر دیا، یہ تفاوت اظہار کے تقاضوں کی بنا پر تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہی تفاوت ذریعہ فخر بنا حتیٰ کہ اس کی بنا پر تصادم کی کئی راہیں تلاش کر لی گئیں۔ اسلامی تعلیمات کا اول ماخذ عربی زبان میں تھا اس لئے اس کی تعلیم و تدریس، صحیفہ ہدایت تک رسائی کے لئے لازم ٹھہری تھی، اسی بنا پر متداول زبانوں میں عربی ہی مسلم امت اور علماء کی توجہ کا مرکز رہی مگر تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اس امتیازی حیثیت کے باوجود کوئی دوسری زبان نفرت کا ہدف نہ بنی، فارسی زبان جو اُس دور اول ہی میں مقابل کھڑی تھی۔ معاند زبان قرار نہ پائی بلکہ اشاعتِ دین کے لئے موثر ذریعہ سمجھی گئی۔ زبان نشرِ خیر کا ذریعہ رہے تو محترم ہے اور انسان کوئی زبان بولتا ہو قابلِ احترام ہے بشرطیکہ اُس سے تقویٰ کی نمو ہو رہی ہو۔ بد قسمتی سے اس ذریعہ اظہار کو معیارِ شرف بنا لیا گیا اور اس کی بنیاد پر انسانیت کی تقسیم ہوئی اور محبت و نفرت کے جذبات پروان چڑھے، لسانی برتری کا عفریت عدم برداشت کا محرک بنا، ملک اس بنیاد پر تقسیم ہوئے اور قومیں اس اساس پر ترتیب پانے لگیں، اسلام زبان کو صرف ذریعہ اظہار و ربط سمجھتا ہے اسلئے سب زبانوں میں اپنی تعلیمات کو فروغ دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ قرآن و حدیث کے مختلف زبانوں میں تراجم، ترجمانی کا تنوع اور اسلامی فکر کی وضاحتوں میں السنہ کثیرہ کا استعمال، اسلامی رویے کو واضح کرتا ہے اور اسلام کے میلان کے روشن پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔

ان عوامل کے علاوہ امارت و مفلسی، وسائل کی کثرت اور کمیابی، انسانی فکر کی رسائی و نارسائی مراکز عقیدت و محبت میں تفاوت اور دیوتاؤں کی کثرت نے بھی انسانوں کو تقسیم کیا ہے۔ تفاوت و افتراق کے یہ بت ہر دور میں نئے سے نئے روپ میں تراشے گئے اور تراشے جا رہے ہیں، جمعیت اقوام ان تصورات کی کارفرائی کا ہمیشہ سے شکار رہی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ امتیازات کے سارے رُخ ہر دور میں موجود رہے ہیں، اسلام ان کی موجودگی سے انکار نہیں کرتا یہ تسلیم ہے کہ نسل کے امتیازات مٹانا انسانی سماج میں ممکن نہیں، تخلیق کا عمل نسل در نسل ہی جاری رہے گا مگر اس کو وجہ شرف نہیں بننا چاہیے کہ اس طرح فاصلے بڑھیں گے اور معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو جائے گا۔ رنگ و روپ کا فرق بھی مٹایا نہ جا سکے گا، علاقائی و طبقاتی تنگ نائے بھی ہزار نقل مکانی اور ہزار حسی روابط کے باوجود اثر دکھاتی رہے گی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ عوامل کبھی بھی وحدتِ نسل انسانی کی تعبیر نہیں بن سکتے۔ اسلام جو وحدتِ نسل انسانی کا داعی ہے ان عوامل کو وقتی شناخت یا انتظامی مصلحت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا بلکہ اسلام اس فکر کا مبلغ ہے جو پوری نسلِ انسانی کو وحدت کے حصار میں رکھے اور برابر مواقع فراہم کرے۔ اسلام کا یہ رویہ فکری انقلاب کا پیغام بھی ہے اور مساوی مواقع کی فراہمی کا ذریعہ بھی، اسلام کے مسلکِ وحدت میں عرب آئے یا عجم، گورا آئے یا کالا، فصیح اللسان آئے یا ژولیدہ بیان، کسی ملک کا شہری آئے یا کسی خطے کا باسی، سب کو قبول کیا جاتا ہے، ایک معبود کا حوالہ عبدیت کی اکائی کا ذریعہ ہے۔

تخریب و افتراق کے ان عوامل کی نفی کر کے اسلامی تعلیمات نے وحدتِ نسل انسانی کا راستہ آسان کر دیا اب ضرورت تھی کہ "وحدت" کے حصول کی

منزل تک جانے کے لئے محفوظ طریق کا روضع کیا جاتا، یہ محفوظ طریق کا رابتدأ ہم خیالوں اور مقصدیت کے اساسی شناوروں سے شروع کیا جاسکتا ہے اس لئے نبی اکرم ﷺ نے اسی خشت اول سے تعمیر انسانیت کے مشن کا آغاز کیا جس جس نے اس وحدت کے سفر پر ساتھ چلنے کا عہد کیا ہے پہلے اس کی فرضی شناخت کو بدلا، ہم خیال جب توحید آشنائی کے خوگر ہو جائیں تو دشوار گزار مراحل کو عبور کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسلئے نبی رحمت ﷺ کے پیغام کے ذریعے وحدت نسلِ انسانی کی ابتداء وحدتِ اہل ایمان و توحید سے ہی ہوئی کہ وحدت سے آشنا ہی وحدت کا درس دے سکتا ہے۔ وحدتِ مسلم کے لئے قرآن مجید اور ارشادات رسول اکرم ﷺ کی روشنی میں یہ مرحلہ کیسے طے ہوا آیئے ایک نظر اس پر بھی ڈال لیں۔ ارشاد ربانی بڑا واضح ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۔

(الحجرات:13)

ترجمہ: اے انسانو، بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف گروہ اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم سب سے معزز تر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں زیادہ تقویٰ شعار ہے، بے شک اللہ تعالیٰ بہت جاننے والا بہت خبر رکھنے والا ہے۔

گروہ، قبیلے صرف شناخت کے لئے ہیں تاکہ ہر طرف پھیلی ہوئی انسانی نسلوں کا تعارف ہو سکے، یہ تقسیم وجہ شرف نہیں کہ وجہ شرف صرف تقویٰ ہے اور یہ تقویٰ ذریعہ نمائش نہیں کہ اس کا اعلان کیا جائے کہ جس کے لئے یہ تقویٰ ہے وہ علیم بھی

ہے اور خبیر بھی، واضح طور پر تقویٰ شعاری کی نمائش کو رد کر دیا گیا کہ تقویٰ لوگوں پر برتری جتانے کا ذریعہ نہیں آداب بندگی کا تقاضا ہے۔

اہلِ ایمان کو باہمی پیوستگی کے لئے بار بار ترغیب دی گئی ارشاد ہوا کہ

''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، وہ اُس پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اُسے بے سہارا چھوڑتا ہے اور نہ اُس کی تحقیر کرتا ہے۔ (صحیح مسلم کتاب البر، باب تحریم المسلم وخذلہ)

تو کبھی وحدتِ امت کے لئے حسی مثال دیتے ہوئے واضح کیا گیا۔

''مومن دوسرے مومن کے لئے یوں ہے جیسے ایک مضبوط دیوار کہ (ہر پتھر) ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے، پھر آپ ﷺ اپنی انگلیوں کو ایک دوسری میں ڈال کر مضبوط جال بنایا۔ (صحیح بخاری باب نصر المظلوم)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں قرب وحدت کے عملی مظاہر کا بھی ذکر کیا گیا۔

''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے وہ نہ تو اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اُسے (بے سہارا) چھوڑتا ہے، اور جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت میں (مددگار یا ساتھی) ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اُس کی حاجت میں اُس (کا مددگار) ہوگا اور جس نے کسی مسلمان کی کوئی مصیبت دور کر دی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُس کے مصائب میں مصیبت دور کر دے گا اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ (صحیح البخاری باب لایظلم المسلم المسلم ولا یسلمہ)

اس ارشاد میں اخوت کا حکم بھی دیا گیا اور اخوت کے ضروری تقاضوں کی نشاندہی بھی کر دی گئ، حاجت مندی میں حاجت روائی، مصیبتوں میں مصیبت سے

رہائی اور خطاؤں کی پردہ پوشی، یہ انسانی زندگی کے عمومی مصائب ہیں ان سب میں معاونت، معاشرتی ضرورت بھی ہے اور نجات وکامرانی کی نوید بھی۔ تعلقاتِ باہمی میں ہمدردی وغم خواری، راہ حیات کو آسان کر دیتی ہے اس لئے فرمایا گیا۔

''تو مومنوں کو آپس میں رحم کرنے میں، آپس کے پیار میں اور آپس کی عنایات میں ایک جسم کی طرح پائے گا کہ اگر ایک عضو کو شکایت لاحق ہو تو اُس کا سارا جسم بیدار رہ کر، بتلائے درد ہو کر اُس کے لئے دعائیں کرتا ہے۔

(صحیح البخاری باب رحمۃ اللہ والبھائم)

جسم کے کسی عضو کا درد سارے جسم کو مضطرب کرتا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ ایک انگلی کو چوٹ لگے تو باقی جسم اپنی راحتوں میں مگن رہے، یہی حالت ملت کی ہے، درد کہیں اٹھے پوری ملت چیخ اٹھتی ہے۔ اس مشترک درد کی نفی تب ہوتی ہے جب بے تعلقی، بے رغبتی، باہمی حسد، ایک دوسرے پر غضب ظاہر ہوتا ہے اور یہ ذاتی مفادات کا گرداب پوری ملت کو زہرناک بناتا ہے اس لئے حکماً ارشاد ہوا۔

لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا۔

ترجمہ: آپس میں ناراضیاں نہ کرو، آپس میں حسد نہ کرو، ایک دوسرے کے پیچھے سازشیں نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کے بندے ہو کر بھائی بھائی بن جاؤ۔ (صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ)

بغض، حسد اور پسِ پشت سازش، وہ اخلاقی ناسور ہیں جو وحدتِ انسانیت میں دراڑیں ڈالتے ہیں۔ یہ وہ نفسیاتی الجھاؤ ہیں جو نفرت کو فروغ دیتے ہیں اور شخصیتوں کو مجروح کرتے ہیں، دنیا کے نقشہ پر ایک ناقدانہ نظر واضح کر دے گی۔ کہ فساد کے جراثیم، افتراق کے فتنے اور جدال کی تحریکیں کیسے جنم لیتی ہیں خصوصاً

مسلم معاشرے کا شیرازہ کیسے بکھرا ہے اور یہ کہ اس منتشر شیرازے کی پیوستگی کیسے ممکن ہے اتحاد کا تصور جب تک اخوت کے جذبوں سے سرشار نہ ہوگا کسی فلاح کی صورت گری نہ ہوگی۔

قرآن مجید نے حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا ہے اور ہر قسم کے تفرقہ سے بچنے کا ارشاد فرمایا ہے اور جاہلی معاشرہ میں باہمی عداوت کو آگ شعار معاشرہ کہا ہے اور امت مسلم میں ڈھل جانے کو اپنی نعمت قرار دیا ہے۔

(سورہ آل عمران:13 کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے)

اتحاد کے اس درس کے بعد ایک ایسی امت کی صورت میں ڈھلنے کا حکم دیا گیا جو مبلغ خیر اور داعی حسنات ہوا اور یہ کہ وہ امت ہر بدی اور برائی سے روکنے والی ہو کہ کامیابی ایسی امت کے افراد کے لئے مقدر ہے، فرقہ بندی سے اجتناب کا محرک ایسی وابستگی ہے جو سرشتۂ اتحاد سے مکمل متصل ہو، یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ یہ پیغام وحدت تصوراتی اور خیالاتی نوعیت کا نہیں بلکہ اس کو بڑی قوت سے بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور لایا جا چکا ہے، کس قدر ریزہ ریزہ تھا وہ انسانی لبادہ جو جاہلی انسان نے اوڑھ رکھا تھا وہ انسان بکھرا ہی نہ تھا ٹوٹ گیا تھا، وہ اس قدر بے توفیق ہو گیا تھا کہ دوزخ کے کنارے جا نکلا تھا وہ کون سا پیغام تھا اور کون سی تحریک تھی جس نے ان ٹوٹے ہوئے رشتوں کو استواری بخشی تھی؟ وہ کون تھا جس نے نجات کی راہ دکھائی تھی کیا تاریخ کا یہ روشن صحیفہ نظر نواز نہیں؟ کیا حقائق ہویدا نہیں؟ کیا راستی کا یہ سفر گواہ نہیں کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو کس نے جوڑنے کا اہتمام کیا تھا؟ یہ تو وہ حقیقت ہے جس کا غیروں کو بھی اعتراف ہے۔

کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا

جگن ناتھ آزاد کو اعتراف ہے کہ

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا۔

تاریخ کا یہ درخشندہ لمحہ جب محمود وایاز ایک صف میں کھڑے نظر آنے لگے اور خون کے پیاسے ایک دوسرے کی بلائیں لینے لگے بغیر کسی کی محنت اور کاوش کے نصیب نہ ہوا تھا، یہ تو کرم تھا نبی آفاق ﷺ کا کہ جس نے شعور انسانیت کو اجاگر کیا وگرنہ صدیوں کی دوریاں کیسے سمٹ آتیں۔ اس کے لئے تو زمین کی ساری دولت بھی قربان کر دی جاتی تو بھی یہ لمحہ الفت نصیب نہ ہوتا، قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کا خود تذکرہ کیا۔ (دیکھیے سورہ ال عمران:63)

پیغام الفت ومحبت کے اثرات کا ذکر ہوا تو اُن کاوشوں اور ریشہ دوانیوں کا رد بھی ہوا جو اس منزل اتحاد تک رسائی کی راہ میں حائل رہی ہیں اور اب تک ہیں۔ ارشاد ہوا۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۔ وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔ (ال عمران:105)

ترجمہ: اور تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو بٹ گئے اور انہوں نے اپنے پاس روشن نشانیاں آنے کے بعد اختلاف کیا اور وہی ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اسلام کا تصور وحدت، اطاعت شعاری اور فرماں برداری سے ترتیب پاتا ہے، جو اپنے خالق کا نہیں بنتا وہ اُس کی مخلوق کا کیسے بنے گا؟ اہل کتاب کو جب

دعوتِ عام دی گئی تو اس بنیادی شرط کا واضح تذکرہ ہوا، ارشاد ہوا۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔ (ال عمران:64)

ترجمہ: کہہ دیجئے، اے اہل کتاب اُس کلمہ کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے اور نہ ہی اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک بنائیں اور نہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا ایک دوسرے کو رب بنائیں گے پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو کہہ دیجئے کہ گواہی دیتے رہو کہ بلاشبہ ہم مسلمان ہیں۔

واضح کر دیا گیا کہ اتحاد واتفاق پوری نسل انسانی کا مقصود ہو یا ملت اسلامیہ کے افراد کے درمیان یہ یک جہتی مطلوب ہو اس کے لئے بنیادی اساس تو نظریاتی اتحاد ہے کہ دراصل یہی ہم خیالی، نسل انسانی کے اتحاد کی کفالت کر سکتی ہے یہ اساس ہے بین المذاہب اور بین الممالک تعاون کی، مسلم ملت تو اس مشترک اساس کو اُسی روز تسلیم کر لیتی ہے جب وہ اسلام کو اپنا دین قرار دیتی ہے، کلمہ توحید کا اعلان دراصل یک رنگی کا اعتراف ہے۔ اِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ۔ نسل آدم کو قربت کا پیغام ہے کہ یہ زمینی اور مادی حوالہ ہے۔ اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ۔ آفاقیت ویکتائی کا مژدۂ جانفزا ہے نظریات کی وحدت، زمینی والے سے ہو یا آفاقی حوالے سے، رویوں کی مماثلت اور اھداف کی یکتائی کا اعلان ہوتا ہے۔ رب واحد کو تسلیم کرنے والوں کو اتحاد کی اعلیٰ منزلات نصیب ہوتی ہے اور اس سربلندی کے اہل ثابت نہ ہونے والوں کو ایک جدامجد کا حوالہ زمینی وحدت عطا کرتا ہے، نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ ظاہرہ میں ہر دو قسم کے

اتحاد کو پذیرائی بخش کر آنے والی نسلوں کے لئے راہ ہموار کردی تھی۔ انصارِ مدینہ کے ساتھ مہاجرین کا تعلق اخوت کی بنیاد پر قائم ہوا یہ اپنوں کا اتحاد تھا اور یہود کے ساتھ میثاق غیروں کے ساتھ آبرومندانہ زندگی کا پیمان تھا، ثابت کردیا کہ اپنے ہوں یا بیگانے اس سرزمین پر بسنے کے محسن انداز کیا ہو سکتے ہیں مکہ والوں کے ساتھ صلح حدیبیہ اس عزم کی شہادت ہے کہ بظاہر اپنے خلاف بھی فیصلے کرنے پڑیں تو حکمت اور بقائے باہمی کا تقاضا ہے کہ کر لینے چاہیں۔

قرآن مجید میں بقائے نسلِ انسانی کے ضوابط کو کسی ابہام اور اختصار کے بغیر بیان کیا تو خود نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات بلکہ عملی اقدامات نے وحدتِ نسل انسانی کے تصور کو روشن تر کردیا۔

یَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَاَنِّسُوا وَلَا تُنَفِّرُوا۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی)

یعنی تم سہولت پیدا کرنا۔ تنگیاں نہ کرنا۔ بشارتیں دینا، نفرت نہ کرنا۔

یہ پیغام محبت زمانہ امن کا نہیں، حالت جنگ کا ہے کہ قتال کے لئے روانہ ہونے والے لشکروں کو دیا جاتا رہا ہے یہ شفقت بھرے جملے رحمت تمام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے تابدار حوالے ہیں یہی وہ پیغام رحمت تھا جس نے علاقائی، طبقاتی اور نسلی تعصّبات کی شکار قوم کو بنیان مرصوص بنادیا اور پھر یہ ابدی پیغام ہر انسان کے لئے بحیثیت انسان زندہ رہنے کا مژدہ بنا، خطبہ حجۃ الوداع کے پرنور کلمات کا حرف حرف بقائے باہمی اور تحفظ نسلِ انسانی کا ایسا منشور ہے جو ہر دور میں نکہتیں بانٹتا رہے گا۔

سیرتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں
نظامِ امن وعدل

رحمت عالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلسلہ انبیاء کے خاتم ہیں آپ کی آمد قافلہ احسان کا حرف آخر ہے اور ان تعلیمات کا نقطہ عروج ہے جو موقع محل اور ضرورت کی مناسبت سے نازل ہوتی رہیں۔ یوں تو ہر الہامی تعلیم اپنے بنیادی عناصر کے حوالے سے یکساں تھی کہ مناسبت اور صلاحیت کے تفاوت کے باوصف اس کا مرکز ایک تھا مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وساطت سے رشد وہدایت کا یہ سلسلہ اپنی انتہاء کو پا رہا تھا۔ انسانیت اپنے معراج کے سفر پر تھی اور اب اُسے ایسا امام مل گیا تھا جو مسند نشین عرش بھی تھا اور لامکان کا راہی بھی وقت آ گیا تھا کہ انسانیت کو وقار، انسان کو منزلت اور ابن آدم کو شرفِ آدمیت حاصل ہو، تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہوا، انسان کی نظریاتی راہنمائی، عملی راہبری اور اخلاقی دستگیری کا مرحلہ محسنِ کائنات، رحمت عالمین اور پناہ گاہ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر قیادت طے ہوا۔ اور یوں دنیا گہوارہ امن وعدل بنی۔

تاریخ عالم کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ انسان ہمیشہ سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔ ہر پیش رفت کا ہدف انسان کی بھلائی ہی قرار پائی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر وبیشتر مساعی کا مقصود جزوی فلاح رہا، نسلی امتیازات، جغرافیائی حد بندی، معاشرتی تشخص اور معاشی برتری انسان کی سوچ اور تعمیر کے رُخ کو محصور کرتی رہی،

مکمل انسان، مجموعی نسل آدم اور کامل انسانی معاشرہ بہت کم توجہ کا محور رہا۔ اس کا نتیجہ یہ رہا کہ انسان جزئی امن اور لمحاتی سکون سے آگے نہ بڑھ سکا۔

انسان کی بدقسمتی یہ ہے کہ اُس کی جاہ پسندی اور خودنمائی اُسے شیطانی راہ پر ڈالتی ہے تو حیوانی خواہشات بیدار ہونے لگتی ہیں، کبھی نسل کا محدود تصور تفاخر کا احساس دلاتا ہے تو کبھی رنگ وروپ کی ظاہر پرستی اعلیٰ وادنیٰ کی تقسیم میں مبتلا کرتی ہے، حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل اولادِ آدم اسی طبقاتی کشمکش کا شکار تھی قبائلی نفرتیں روز کا معمول تھیں، یہ باہمی چپقلش صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود نہ تھی، پوری دنیا عداوت کی آگ میں جل رہی تھی، خواہشات بے لگام تھیں اور حرص نے انتقام کی راہ دکھائی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان محارب اقوام کو انسانی شرف کی حقیقت سے آشنا کیا۔ عظمت کے حقیقی راز سمجھائے اور نفرت کی بنیادوں کو تہہ وبالا کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا۔

مَتٰی اسْتَعْبَدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا۔

(محض الصواب فی فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ یوسف بن حسن المبرد)

تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے۔ حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنم دیا تھا، ان رویوں نے سیرت وکردار اور فکر وعمل میں انقلاب برپا کیا۔ انسان محترم ٹھہرا اور ایک دوسرے کے احترام کا سلیقہ حاصل ہوا جس سے انسانی معاشرے میں اُنس ویگانگت کی نمو ہوئی اور دنیا گہوارہ امن وسکون بنی۔

امن لغوی طور پر وہ کیفیت ہے جس میں غیر فطری ہیجانات کا اثر نہیں ہوتا، یہ حالت سکون ہے کہ اس میں ناگہانی اضطراب کا خوف نہیں رہتا۔ یہ کیفیت اور یہ

حالت ہر ذی شعور کا مقصود ہے۔ حضور اکرم ﷺ اسی کیفیت کے داعی اور اسی حالت کے مبلغ ہیں آپ نے جو نظریہ حیات پیش کیا اُس کا ہر پہلو اسی مطلوب کے لئے جد وجہد کا مظہر ہے۔ ایمان کے کلمہ کی بنیاد میں امن موجود ہے، ایمان اگر تسلیم ورضا اور خضوع وانقیاد کا اظہار ہے تو اس میں حالت امن کے وجود پذیر ہونے کی بشارت بھی موجود ہے۔ اسلام ۔سَلِمَ۔ سے ماخوذ ہے جو سراپا سلامتی کا اظہار ہے۔ مومن کہا جائے یا مسلم، یہ اعلان بہر طور ہوتا ہے کہ یہ اُس قوم یا گروہ کا فرد ہے جو سلامتی کا خواستگار اور امن کا نقیب ہے۔ یہ صرف لفظی مناسبت نہ تھی بلکہ نبی رحمت ﷺ نے اس امن پذیری کو وجود بخشا، تمام دنیا کو درس سلامتی دیا اور قرآن مجید کا یہ اعلان سنایا۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (الانعام:82)

ترجمہ: وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں ظلم کی آمیزش نہ کی اُن کے لئے امن ہے۔ اسلامی تعلیمات کا یہ معاشرتی پہلو ہے کہ ایمان وہی مقبول ہے جس میں ظلم شامل نہ ہو اس لئے کہ ایمان اور ظلم متضاد کیفیات ہیں۔ ایمان کا لازمی نتیجہ امن ہے اور ظلم کا خلفشار اور حد سے تجاوز کی سرگرانی، حدود آشنائی بین الاقوامی تعلقات اور معاشرتی روابط کی اساس ہے جبکہ ظلم ان تعلقات اور روابط پر شب خون مارتا ہے اسی لئے فرمایا گیا کہ مومن نہ زبان دراز ہوتا ہے۔ اور نہ دست دراز بلکہ وہ تو امن کا نشان اور سلامتی کا مبلغ ہے اسی رویے سے دنیا امن آشنا ہوئی تھی آئندہ بھی یہی رویہ امن کی ضمانت ثابت ہوگا۔

سیرتِ رسول ﷺ کے اُن گوشوں پر نظر ڈالیے جو سراسر معاشرتی نوعیت

کے ہیں تو آپ کی امن پسندی کا اندازہ ہوجائے گا۔ بلد امین کا نبی حرم پاک کو حرماً آمناً قرار دینے والا الامین ۔اُس دور میں بھی پیغامبر امن و سلامتی تھا جبکہ ایمان و اسلام کی دعوت کا مکلّف بھی نہ ٹھہرا تھا۔ تنصیب حجر اسود کے موقعہ پر انانیت پسند اور مائل بہ جنگ قبائل کی تلواریں بے نیام ہو چکی تھیں ۔حرمِ کعبہ انسانی جان کی پامالی سے رنگین ہونے والا تھا۔ چار، پانچ روز تصادم کا خطرہ منڈلاتا رہا مگر پیغمبر امن کے وجودِ مسعود نے جذبات کا رخ موڑ دیا۔ صاحب حکمت و دانش نبی نے تسکینِ جذبات کا وہ اہتمام کیا کہ حجر اسود بھی نصب ہوا اور خون کا تقدس بھی برقرار رہا۔ ابن ہشام کے الفاظ ہیں کہ جب مضطرب قبائل مسجد حرام میں کسی داعی امن کے لئے بیقرار ہو رہے تھے تو حضور اکرم ﷺ تشریف لائے۔ دیکھتے ہی سب پکار اُٹھے۔ ھذا الامین۔ رضینا، ھذا محمد۔ امن دہندہ آ گیا ہم راضی ہوئے یہ تو محمد (ﷺ) ہیں۔ آغاز جوانی میں ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والے شرفاء عرب میں آپ کا حوالہ اکثر مورخین نے دیا ہے بلکہ آپ کو باہمی مشاورت اور قیام امن کے مشن کا محرّک قرار دیا ہے۔ بعثت کے بعد بھی آپ نے یہ اعلان کیا تھا کہ اسلام اس حلف کو منسوخ تو کجا مضبوط ہی کرتا ہے اور یہ کہ خود آپ اسکی دہائی پر اب بھی دوڑیں گے ، بعثت کے بعد مکہ مکرمہ میں جو ناروا سلوک آپ کے ساتھ ہوا اس کا بظاہر تقاضا یہ تھا کہ نفرت کی دیوار کھڑی ہو جاتی۔ دشمنی کا ہر حربہ آزمایا جاتا مگر آپ کا امن پسند رویہ ہر موڑ پر راہنما رہا۔ کوئی قتل نہ ہوا کسی کا حق غصب نہ ہوا اور کسی کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائی گئی۔ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران میں قوت کا مظاہرہ مناسب نہ جانا۔ ہمیشہ جنگ کو ٹالا۔ ہر حالت میں ظلم سے انکار کیا۔ معاہدہ حدیبیہ، آپ کے امن پسند رویہ کا ایسا اظہار ہے

کہ جس پر ہر دور میں معاشرتی سکون اور بین الاقوامی بقائے باہمی کی اساس رکھی جا سکتی ہے، شرائط کا ایک ایک حرف دنیا کو طاقت کے حصول کے باوصف رواداری، حسنِ سلوک اور احسان کا درس دے رہا ہے۔ سیرتِ مطہرہ کا بین الملی حوالہ اس سے بھی بڑھ کر دعوتِ امن ہے۔ شاہانِ عالم کو لکھے گئے مکاتیب کا ہر ورق پکار رہا ہے۔ ''اَسْلِمْ تَسْلَمْ'' دینِ اسلام اختیار کرلو سلامتی پالو گے۔ جنگ وجدال تو ناگزیر صورتِ حالات ہے اس لئے جہاد پر روانہ ہونے والے لشکر کو صبر و استقلال کے درس کے ساتھ یہ بھی حکم تھا کہ کسی سے زیادتی نہ ہو۔ بستے شہروں کو ہراساں نہ کیا جائے۔ عام انسان سے تعرض نہ ہو۔ افہام و تفہیم کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ جنگ کو ٹالنے کا ہر ممکن ذریعہ اپنایا جائے لیکن جب خودسری، لاعلاج ہو جائے تو جہاد کو ناگزیر علاج کے طور پر برپا کیا جائے۔ یہ علاج ہے عمومی رویہ نہیں۔ اس لئے یہ صرف بوقت ضرورت اور بقدر احتیاج ہی انجام دیا جاتا ہے، ہجرت حبشہ ہو یا ہجرت مدینہ، یہ تصادم سے بچنے کے وسیلے تھے جنگ بدر یا غزوہ احد، معرکہ احزاب ہو یا تبوک کی یلغار، یہ حدود آشنائی کا درس دینے اور امن و سلامتی کا نفاذ ممکن بنانے کے سامان تھے حیرت ہے جتنا بڑا دشمن تھا اتنا بڑا کرم ہوا، فتح مکہ پر عام معافی کا اعلان بھی ہوا اور سب سے بڑے مخالف سے سب سے زیادہ حسن سلوک بھی، یہی رویہ تھا جو اندر کی نیکی کو بیدار کرنے کا سبب بنا، تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی اسلامی تعلیمات کا نفاذ ہوا غیر مسلم رعایا اور غیر مسلم حلیف زیادہ راحت پاتے رہے۔ اس کی وجہ حضور اکرم ﷺ کا وہ رویہ ہے جو انسان دوستی کی معراج ہے آخری خطبے میں عمومی تحفظ کا اعلان ان الفاظ میں ہوا۔

اَیُّھَا النَّاسُ: اِنَّ دِمَاءَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَةِ

يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا۔ (سبل الهدیٰ جلد 8 ص 644)

''اے لوگو تمہارے خون اور مال تم پر اُسی طرح محترم ہیں جیسے اس مقدس شہر میں اس معزز مہینے میں آج کا دن''۔

غور کیجئے جب بھی تحفظ کی بات ہوئی۔ امن وسکون کی تلقین ہوئی تو خطاب اَيُّهَا النَّاسُ سے شروع ہوا۔ جب انسانی شرف کو علاقائی تعصبات اور لسانی تحفظات کی دلدل سے آزاد کرانا چاہا تو رب واحد کا حوالہ دیا۔ یہ بنیاد ہے انسانی تعلقات کی، اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ زمین سب کا گھر ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سب انسانوں کے جد امجد ہیں آپ کو جنت سے دنیا میں بھیجا گیا تو یہ اہتمام کیا گیا۔

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (البقرة:36)

یعنی تمہارے لئے زمین قرار گاہ بھی ہے اور قیامت تک کے لئے سامانِ زیست کا ذریعہ بھی۔ اس سے حق زیست اور حق معاش سب انسانوں کے لئے لازم ٹھہرا۔

امن وسلامتی کی پامالی صرف اس لئے ہوتی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم سے اُس کا جغرافیہ چھین لینا چاہتی ہے یا اُس کے روزی کے وسائل پر قابض ہونا چاہتی ہے فساد کی بنیاد تو یہی لالچ ہے حد سے بڑھی ہوئی خواہش ہے، مگر جو رسول رحمت ﷺ لالچ کو مکروہ قرار دے اور خواہشات پر قناعت کا پہرہ بیٹھا دے وہ تعلقات میں کسی قدر مخلص اور معاملات ہیں کیسا بے لوث ہوگا یہ اخلاص اور یہی بے لوثی امن وسلامتی کی اساس ہے۔

امنِ عالم کے قیام کی خواہش کے دیگر موانعات میں ایک اہم ترین مانع یہ عنصر بھی ہے کہ دنیا مختلف النوع افراد اور متضاد نظریت کی حامل اقوام پر مشتمل ہے یہ

ممکن نہیں کہ جملہ نوعِ بشر ایک سے نظریات کو اپنا لے اس لئے متصادم نظریات کا وجود ہمیشہ برقرار رہے گا نظریات کا تضاد، عمل کے تفاوت کو جنم دے گا، ہر کوئی چاہے گا کہ اُس کے عقائد ونظریات نافذ ہوں اور اُس کے عملی رویوں کو عظمت حاصل ہو یہ خواہش ستیزہ کاری کا سبب بنے گی اور دنیا کا امن برباد ہوگا اس ناگزیر صورت حال کا مقابلہ کیسے ہو۔ ظاہر ہے بین الاقوامی امن کی ضمانت وہی دے سکتا ہے جو دوسروں کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو یہ حوصلہ صرف اور صرف اپنے نظریات کا ایقان مہیا کرسکتا ہے، عقیدہ پختہ ہو، نظریے پر اعتماد ہو اور اپنی حقانیت کا یقین ہو اور بہر صورت اُس کے برقرار رہنے پر غیر متزلزل ایمان ہو تو دیگر اقوام، مقابل نظریات اور متصادم عقائد کا خوف نہیں رہتا۔ بے یقینی شک کو جنم دیتی ہے اور شک باہمی تعلقات میں زہر گھولتا ہے۔ نبی رحمت ﷺ نے اپنی تعلیمات اور اپنے کردار سے عقائد گی اس طرح ترسیخ کی کہ غیروں کے حصار میں بھی زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اس حوصلے نے اعتماد عطا کیا اور یہ اعتماد دوسروں کو جینے کا حق دینے پر ہر لحظہ تیار رہا۔ اس اعتماد کی بہترین مثال معاہدہ حدیبیہ کی وہ شق ہے جس میں یہ تسلیم کرلیا گیا کہ اگر مکہ سے کوئی بھاگ کر مدینہ منورہ آئے گا تو اُسے واپس کردیا جائے گا مگر مدینہ منورہ سے بھاگنے والا فرد قریش کے رحم وکرم پر ہوگا وہ چاہیں تو واپس کردیں وگرنہ روک لیں۔ یہ شق بظاہر کمزوری پر دلالت کرتی ہے مگر اس میں حضور اکرم ﷺ کے اپنے مشن پر بے پناہ اعتماد کا اعلان ہے مکہ مکرمہ سے جو بھاگ کر مدینہ منورہ آئے گا وہ اگر کافر ہے تو اسے واپس ہی جانا چاہیے اور اگر وہ مسلمان ہے تو بھی اُسے وہاں رہنا چاہیے تا کہ مکہ مکرمہ ایمان کی تابانیوں سے یکسر خالی نہ ہوجائے۔ اُس مسلمان کا قیام

مکہ والوں کے لئے تو خطرہ ہوسکتا ہے کہ اس کا اعتماد دوسروں کو گرویدہ نہ بنالے اُس کے اپنے ایمان کے لئے کوئی خطرہ نہیں کہ معلم انسانیت ﷺ کی تربیت کچا رنگ نہیں جو کفر وشرک کے شعلوں میں اترنے لگے۔ اسی طرح مدینہ منورہ سے کوئی کافر یا منافق بھاگ جائے تو خس کم جہاں پاک اور اگر وہ مومن ہے تو جرأت کا پیکر ہے کہ کفر کے آتش کدہ میں مثل خلیل علیہ السلام رہنے کو ترجیح دے رہا ہے جس کا لازمی نتیجہ گل وگلزار کی آفرینی ہے۔ معلوم ہوا کہ جب اعتماد، ایمان بن جائے تو وقار حاصل ہوتا ہے اور صاحبِ وقار مومن مخالف قوتوں پر دھونس یا دھاندلی سے غالب آنا نہیں چاہتا اُس کے پاس دلائل کی بے پناہ قوت ہوتی ہے اس لئے وہ دوسروں کو برداشت کرنے کی توفیق پاتا ہے یہ برداشت ہی تصادم کی ضد ہے اور اسی سے کفالتِ امن ممکن ہے۔

امن کی تلاش انسان کی معاشرتی ضرورت بھی ہے کہ اس کے بغیر معاشرتی استحکام حاصل نہیں ہوتا اس کی وجہ سے تعمیر سیرت کی تمام کاوشیں پاور ہوا ثابت ہوتی ہیں یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ جن نظریات و مذاہب کو انسان کی فلاح کا ذمہ دار گردانا گیا وہی امن دشمنی کے پرچارک نکلے۔ یہ عجیب معاملہ ہے کہ امن کے نام پر امن کو برباد کیا جاتا رہا۔ مادی یلغار تو امن دشمنی کی تحریک ہی تھی مگر بدقسمتی یہ ہے کہ روحانی انقلاب کے داعی بھی تلوار ہاتھ میں لے آئے اور امن کی خاطر فساد برپا کرتے رہے جبکہ حضور اکرم ﷺ نے اُس دشمن کو بھی امن کا درس دیا جو جان کا دشمن ہی نہ تھا پورے مشن کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ خون کے پیاسوں کو معافی اور قتل وغارت کے خوگر انسانوں کو عفو ودرگزر کی نوید آپ کے پیغمبرانہ کردار کی ایک جھلک ہے جس کی مہک آج تک راہ حیات کو معطر کئے ہوئے ہے۔

امن عالم کی ضمانت ان تعلیمات نے مہیا کی جو آپ نے اپنی سیرت کے حوالے اور اپنے ارشادات کے واسطے سے تلقین فرمائیں۔ نفاذ امن کے لئے آپ نے جو بنیادی احکام ارشاد فرمائے وہ قرآن مجید اور حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں یہ ہیں۔

انسان کا وجود محترم ہے۔ اس لئے اس کا تحفظ سب کی مشترک ذمہ داری ہے۔ قتل اس تحفظ کی نفی ہے اس لئے بہر صورت حرام ہے۔ ارشاد ہوا۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ (المائدہ:32)

یعنی جس نے کسی جان کو قتل کیا کسی جان کے بدلے کے بغیر یا زمین میں فساد کے لئے تو گویا اُس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے اُسے زندہ رکھا تو گویا پوری انسانیت کو زندہ رکھا۔

معلوم ہوا کہ کسی جان کو مارنا یا زمین میں فساد پیدا کرنا کہ امن درہم برہم ہوجائے انتہائی سنگین جرم ہے۔ یہ قتل کی ظاہری صورت ہے۔ معنوی قتل جو کسی پر سنگ زنی کر کے، بہتان لگا کر یا غیبت کر کے کیا جاتا ہے۔ اس کا بھی راستہ کاٹا گیا غیبت کو تو درندگی سے مشابہ قرار دیا گیا کہ اس سے معاشرتی نظم تباہ ہوتا ہے اور انسان درندوں کی طرح ایک دوسرے کو نوچنے لگتے ہیں۔

انسانی روابط کی خوش گواری پر کیف ہے جبکہ ان میں عدم توازن لاتعداد معاشرتی قباحتوں کو جنم دیتا ہے اسلئے ان روابط کی استواری پر خصوصی توجہ دی گئی پوری نسل انسانی مشترک اور مقدس رشتوں میں منسلک ہو کر ایک اکائی بن جاتی ہے۔ اور یہ اکائی خالق کی یکتائی کی مبلغ اور توحیدی تقاضوں کی امین ہوتی ہے۔

اطاعت شعار فرد صالح معاشرہ قائم کرنے کا ذریعہ ہے اور صالح معاشرہ امن کا مرکز اور سلامتی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

معاشرتی استحکام کے لئے باہمی اعتماد ضروری ہے ہر انسان مکلف ہے مگر ایک حد تک استطاعت سے بڑھ کر کوئی مطالبہ مناسب نہیں لیکن استطاعت کی ناشکری بھی نہ چاہیے۔ فرد کی آزادی معاشرتی ضوابط سے متصادم نہیں بقول حضرت علامہ اقبال۔ صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی ہے۔

برائی کا تعفن معاشرہ کو زہر آلود کرتا ہے جس سے معاشرتی امن غارت ہو جاتا ہے اس لئے برائی کی بیخ کنی سب کا مشترک فرض ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ برائی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتی ہے مگر اسلامی تعلیمات اسے رائج الوقت نہیں بننے دیتیں بلکہ نیکیاں اس کا تعاقب کرتی رہتی ہیں کہ۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ط (ھود:114)

بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

برائی بدکرداری کی شکل میں بھی ہوتی ہے۔ اور غیر متوازن رویوں کے روپ میں بھی، برائی بہر صورت قابلِ نفرت ہے مگر برا انسان قابل رحم و شفقت، اسلام کے اس تصور نے اخوت و محبت کی فضاء قائم کی، اجتناب کے بجائے تالیف قلب اور دھتکارنے کے بجائے اپنانے کی تاکید کی۔

معاشی عدم توازن حیوانیت پر اکساتا ہے۔ جاہلی معاشرے میں غربت کے خوف سے اولاد کا قتل ہونے لگا تھا۔ یہ جرم ہر اس دور میں عام ہوگا جہاں تقسیم دولت کا نظام ناکارہ ہوگا جب بعض افراد رزق کے چشموں پر قابض ہوں گے تو خواہش امن

دم توڑ دے گی اس لئے ارشاد ہوا۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ (الزخرف:32)

یعنی ہم نے انسانوں کے درمیان ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا ہے۔

یہ تقسیم عدل کی بنیاد پر ہے وسائل رزق پر ناجائز قبضے سے بدچلنی کا تعفن پیدا ہوتا ہے اسلئے صالح معاشرے اور پرامن ماحول کی استواری کے لئے گردشِ دولت کا محکم نظام قائم کیا گیا۔ یہ تو ہر کوئی جانتا ہے کہ فساد فی الارض کے بیشتر سوتے معاشی الجھاؤ سے پھوٹتے ہیں۔ دولت کو پابند آداب بنانا عالمی امن کے لئے بے حد ضروری ہے اور یہ صرف سیرت رسول ﷺ کی روشنی میں ممکن ہوسکتا ہے کہ اس میں امانت کا تصور بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ایثار واحسان کی ترغیب اور مواخذے کا خوف خواہشات کو بے لگام نہیں ہونے دیتا۔ معاشرتی برابری، معاشی توازن، سیاسی دیانت، ایثار کا جذبہ، احترام آدمیت کا شعور، احسان کی عادت، برداشت کی قوت، جینے اور جینے کا حق دینے کا رویہ، نسلِ انسانی کی مساوات کا تصور، ایک خالق کی مخلوق ہونے کا اعتراف اور نیکی میں سبقت لے جانے کی خواہش، امن وسکون کے حصول کے بنیادی عناصر ہیں۔ پیغمبر امن ﷺ نے اپنی تعلیم، اپنی سیرت، اپنے رویے اور اپنے عمل سے انسان کو امن آشنا کیا۔ دنیا نے خواہش امن کو ممکن الحصول پایا۔ تمیز بندہ و آقا کے صنم کدے کو پامال ہوتے دیکھا اور وحدتِ نسل انسانی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ ایسا ہر دور میں ممکن ہوسکتا ہے شرط صرف یہ ہے کہ زاویہ نگاہ بدلا جائے، انسان کی عظمت کا اعتراف کیا جائے۔ انسان کو زمین، آب وہوا، رنگ و روپ اور نسلی ولسانی

پستیوں سے آزاد ہونے کا حق دیا جائے۔ شعور انسانیت کی آبیاری ہوتا کہ دنیا بے یقینی کے گرداب سے نجات پائے آج بدی کا زہر منہ زور ہے ہر جانب شیطنت رقص کناں ہے مگر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، تریاق اب بھی موجود ہے، دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔ کہ وہ اس زہر کو تریاق کے روبرو لائے، بدی کی قوتوں کی توانائی چھیننے اور نیکی کے فروغ کا اہتمام کرے تا کہ یہ دنیا پھر سے خطہ امن اور مسکن راحت بنے، اللہ کرے یہ وقت جلد آئے کہ انسانیت کی کراہیں عرشِ عظیم پر دستک دے رہی ہیں۔

دعوت وتبلیغ کی حکمت عملی

تعلیمات نبوی کی روشنی میں

انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی ہدایت وراہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا تھا کہ کوئی دَور یا کوئی نسل بھی بے خبری کے دھندلکوں میں نہ رہے، یہ سلسلۂ رشد صدیوں تک جاری رہا حتیٰ کہ خاتم الانبیاء ﷺ تشریف لائے، آپ ﷺ سے ہدایتِ کامل کا ظہور ہوا کہ آپ ﷺ تمام انسانوں کے لئے رسول رحمت بن کر آئے، خود خالق کائنات نے ان وسعتوں کا تذکرہ کیا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف:158)

”فرما دیجئے کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔“

اسی آفاقیت کی وجہ سے آپ ﷺ نے پیغام رحمت کو ہر انسان تک پہنچانے کا اہتمام کیا، یہ پیغام کن اصولوں کے تحت پہنچایا گیا ان کا شمار آپ ﷺ کی تعلیمات سے کیا جا سکتا ہے، تعلیمات نبوی کی اساس وہ اصول تھے جو خود پروردگار عالم نے متعین فرما دیئے تھے۔ اس سے واضح ہوا کہ حضور ﷺ کی تعلیمات اور اُسوہ حسنہ، دعوت وتبلیغ کی اساس ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی پوری حیات مبارکہ لائق اتباع ہے کہ اسی کی بنیاد پر دعوت دی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تبلیغ کیسے ہو اور دعوت کس طرح دی جائے اس کی وضاحت قرآن مجید میں کر دی گئی، ارشاد باری ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا

بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ (المائدہ:67)

"اے رسول محترم (ﷺ) آپ کے رب کی طرف سے جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے پہنچایئے، اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے بچالے گا۔"

اس ارشاد ربانی میں متعدد جہتوں سے راہنمائی فراہم کردی گئی مثلاً:

1- ابلاغ لازم قرار دے دیا گیا۔

2- ابلاغ صرف اس کا، جو رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

3- اگر نازل شدہ احکام یا ارشاد کو نہ پہنچایا گیا تو رسالت کا منصب ادا نہیں ہوا۔

4- اس ابلاغ حق میں جو بھی مخالفانہ ردعمل آئے اسے خاطر میں نہ لایئے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی معاندت اور دشمنی سے آپ کی حفاظت کرلے گا۔

اس آیت کریمہ سے مبلغ کے لئے راہنمائی کے یہ اصول دریافت ہوئے۔

1- ایک یہ کہ تبلیغی ہماہمی اور ارسال ہدایت کے خروش میں مبلغ کو اپنی حدود کا ہمیشہ خیال رہنا چاہئے۔ اسے ہر حال میں تبلیغ کے مشن کو جاری رکھنا ہے مگر تبلیغ صرف ان فرامین کی ہو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کئے گئے ہیں۔ اس ارشاد نے تبلیغ کی حدود متعین کردیں اور واضح کردیا گیا کہ مبلغ ایمانداری سے احکام وارشادات تک رسائی حاصل کرے اور دیانتداری سے ان احکام کو لوگوں تک پہنچائے، وہ ایک امین کا کردار انجام دے، اس تبلیغی روش میں اسی کی اپنی پسند وناپسند دخل اندازی نہ کرے۔ حرف حرف احتیاط کے دائرے میں رہے، اسے یاد رہنا چاہے کہ اگر ایک جانب یہ حکم ہے کہ:

بلغوا عنی ولو آیۃ (جامع الترمذی کتاب العلم)

"کہ میری جانب سے پہنچاؤ اگرچہ ایک آیت ہو۔"

تو دوسری جانب یہ بھی وعید موجود ہے کہ جس نے مجھ سے ارادۃً جھوٹ منسوب کیا اسے اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالینا چاہیے۔ (صحیح البخاری کتاب العلم عن انس رضی اللہ عنہ)

تبلیغ کا مشن دوطرفہ حدبندیوں کا تقاضا کرتا ہے۔ جوش خطابت کے زیراثر، یا اپنی بات منوانے کے حوالے سے روایات میں حک و اضافہ، استخراج میں شترگربگی اور تدوین مسائل میں ذاتی انا کی کارفرمائی، لائق مواخذہ ہے۔ مبلغ ہر حال میں ایک تنی ہوئی رسی پر چل رہا ہوتا ہے کہ ذرا سی لغزش بھی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔

2- تبلیغ کو چونکہ "أُنزل اليك" کے حصار میں رہنا ہے اس لئے مبلغ کو اس حصار کے تمام مشتملات سے باخبر رہنا چاہئے۔ آیات قرآنیہ کی درست تفہیم ارشادات نبوی ﷺ کی صیانت وحفاظت کی پاسداری اور لفظ لفظ کی حرمت کا احساس، مبلغ کے لئے لازم ہے، اسے یقین رہنا چاہئے کہ سیرت رسول ﷺ کی ہر ادا رضائے الٰہی ہے اس طرح یہ عمل خالصۃً نیکی کا عمل بن جائے گا اور اس کے اثرات بھی مرتب ہوں گے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریق عمل اس سلسلے میں ہمیشہ راہنما رہنا چاہئے کہ ایک لفظ پر ہلکا سا شک بھی آیا تو مدینہ منورہ سے فسطاط تک کا سفر کیا اور وہ بھی اونٹنی پر اور اس کیفیت میں کہ "ماحل رحلہ" کہ کجاوہ بھی نہیں اتارا، ایسی احتیاط تبلیغ کو سراپا خیر بنا دیتی ہے۔

3- ابلاغ حکم اس قدر ضروری ہے کہ اگر اس میں کوتاہی رہ گئی یا مداہنت ہوگئی تو صرف تنبیہ یا اصلاح کا اشارہ ہی کافی نہیں سمجھا گیا تبلیغی مشن کی نفی ثابت کردی گئی اسی

لئے فرمایا گیا تھا کہ ہر سننے والا حاضر شخص یہ احکام ان تک پہنچانے کا مکلّف ہے جو وہاں موجود نہیں ہیں اور یہ بھی وعید سنائی گئی کہ:

''جس نے علم سیکھا اور پھر اسے چھپائے رکھا، قیامت کے روز اس کی زبان پر لوہے کی زنجیر ڈال دی جائے گی۔'' (سنن ابنِ ماجہ باب من سئل عن علم)

یہ اس لئے کہ ہر حکم فلاح انسانیت کا کفیل ہے اور حکم کا روکنا معاشرتی فلاح سے انکار ہے اور یہ معاشرے پر ظلم ہے۔

4- چوتھی بات یہ کہ ہر مبلغ کو بلا خوف وخطر ابلاغ حق کا فریضہ انجام دینا ہے، اس راہ کی مشکلات یقیناً بے حوصلہ کریں گی، خوف جان و مال اور عزت وآبرو بھی راہ کاٹیں گے مگر مبلّغ کو حوصلہ رکھنا چاہئے کہ جس کا وہ فرض انجام دے رہا ہے وہ قادر وقیوم ہے، اس کی حفاظت ہی سب سے بڑی حفاظت ہے اور اس کی پناہ ہی اصل پناہ ہے۔

یہ چار اصولِ تبلیغ ہر مبلّغ کے پیش نظر رہنے چاہئیں، تبلیغ دراصل نشر خیر ہے انسانوں کا یہ حق ہے کہ ان کے لئے مفید احکام ان تک پہنچائے جائیں تاکہ وہ لغزش قدم سے بچ سکیں۔

مبلغ کے لئے لازم ہے کہ لوگوں کو قریب لایا جائے، ان کو دعوت دی جائے تاکہ عملِ تبلیغ کارگر ہو سکے، قرآن مجید نے اس دعوت الی الحق کے بھی اصول متعین کر دیئے ہیں جو اسوہ نبوی ﷺ سے بھی واضح ہیں اور تعلیمات نبوی بھی ان کو محیط ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ؕ (النحل: 34)

''بلایئے اپنے رب کی راہ کی جانب، حکمت سے، عمدہ نصیحت سے اور ان سے بحث ومناظرہ کیجئے اس طریق سے جو عمدہ تر ہو''

اس آیت کریمہ میں دعوت کے اصول بتائے جا رہے ہیں نیکی کا شوق فراواں کرنا ہے، راستی کا سبق دینا ہے، قرب تلاش کرنا ہے، کوئی بھی ہو اسے دعوت دینا ہے، مقصود دائرہ رحمت میں لانا ہے، اس لئے بلایئے، ہاں بلانے کے انداز ضرور سیکھ لیجئے کہ یہ دعوت نازک بھی ہے انسانیت کی فلاح کی ضامن بھی ہے اور دنیا وآخرت میں کامیابی کی خشت اول بھی ہے اس لئے اس کو درست اور مستحسن انداز سے نصب کیجئے تاکہ پوری تعمیر حسن کا مرقع بن جائے، دعوت کیسے دینا چاہئے۔ اس کے لئے بنیادی اوصاف کا ذکر کر دیا گیا۔ فرمایا گیا:

1- اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ ۔ مقصود ہو اس دعوت کا، یہ دعوت کسی گروہ بندی، جتھہ سازی یا فرقہ پسندی کا شاخسانہ نہ ہو، دعوت صرف اور صرف پروردگار کی طرف بلانے کے لئے ہو، جب مقصود یہ ہوگا تو ذاتی وجاہت، انفرادی جلالت یا کوئی عصبیت پسندی پریشان نہ کرے گی، داعی کو رب کے راستے کا نقیب بن جانا چاہئے اسے اپنی ذات کو کسی صورت مرکز نگاہ بنانے کی سعی نہ کرنی چاہئے۔ پھر یہ بھی کہ دعوت رب کی طرف ہو، کوئی اور مقصود نہ ہو، رب کی طرف دعوت، رب کے احکام کے تحت اور رب کے رسول ﷺ کے فرمودات کے مطابق ہو، اس میں وہ تمام غیر ضروری لاحقے ختم ہو جاتے ہیں اور تعلیمات میں پیدا کردہ انتشار بھی رُک جاتا ہے۔

2- فرمایا گیا: دعوت حکمت کے ساتھ ہونی چاہئے۔ حکمت، دانائی، دانش مندی اور حسب حال گفتگو اور مناسب طرز عمل کو کہتے ہیں۔ دعوت کو ہوشمندانہ اور

سلیقہ شعارانہ انداز اپنانا چاہئے اور ساتھ یہ بھی کہ دعوت مستحکم بنیادوں پر ہونی چاہیے کہ حکمت میں محکم ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ کوئی ایسی بات دعوت کا حصہ نہیں بننی چاہیے جو شعور انسانی سے ٹکرائے اور بلاوجہ مضطرب کرے، نبی اکرم ﷺ کی تبلیغی مساعی انہیں حکمتوں سے آراستہ تھی، کبھی آپ ﷺ نے بحکم الٰہی صرف قریبیوں کو دعوت دی تو کبھی اپنی صداقت کے اعتراف عمومی کی بنیاد پر دعوت کا اہتمام کیا، سامع کی عقلی استعداد کا بھی خیال رکھا اور دلائل کی اثر انگیزی کو بھی ملحوظ رکھا، اس لئے داعی کی گفتگو اور معاشرتی رویہ سراپا حکمت ہونا چاہئے اور صرف حقائق پر مشتمل ہونا چاہیے۔
نبی اکرم ﷺ عمومی رویوں سے ہٹ کر دعوت دے رہے تھے مگر کسی نے بھی آپ ﷺ کے کردار یا قول پر کوئی ناشائستہ ردعمل نہ دیا اور ہزار مخالفت کے باوجود صادق وامین ہی کہتے رہے۔

3- موعظت وہ نصیحت ہے جس میں دردمندی کی مانوسیت شامل ہے اور پھر حسنہ کی قید لگا کہ اس نصیحت افروزی کو سراپا حسن بنا دیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی تبلیغی مساعی اسی نصیحت پسندی کا شہکار تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ تنہائیوں میں بھی بڑے سے بڑا معاند حقیقت کا اعتراف کرتا رہا۔

دعوت جب حکمت کے ساتھ ہو اور اس کا لفظ لفظ نصیحت سے دمک رہا ہو تو اس کا اثر ونفوذ بے پایاں ہوتا ہے۔ آج بھی اس روش کو اپنانا ہوگا، شعلے برساتا ہوا لہجہ کس قدر بھی اثر آفریں لگے مگر نتائج کے اعتبار سے بے توفیق ہوتا ہے۔

4- چوتھی شرط یہ لگا دی گئی کہ دعوت مناظرانہ رنگ بھی لے لے اور جملوں میں حرارت بھی امڈنے لگے تب بھی ایسی راہ اپنانی چاہئے جس سے دعوت کا حسن متاثر نہ ہو،

اس کی نصیحت آفروزی پر حرف نہ آئے اور گفتگو حکمت کے دائرے سے متجاوز نہ ہوجائے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (السجدہ:34)

کا فرمان ہر حال میں پیش نظر رہے تاکہ معاند فضا میں بھی ماحول خوشگوار رہے۔"

تعلیمات نبوی قدم قدم پر ان اصولوں کی سرفرازی کا سبق دے رہی ہیں، نرم، مگر پُروقار لہجہ، عام فہم مگر سراپا پُرحکمت گفتگو، عقل انسانی کے قریب مگر مرعوب کن انداز اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خیر خواہی کا جذبہ، یہ وہ عناصر ہیں جو تبلیغ ودعوت کو پُرتاثیر بناتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر صلحاء امت تک آئمہ کرام سے لے کر صوفیاء عظام تک دعوت وتبلیغ کا یہی رویہ قائم رہا جس کے اثرات آج بھی ہر کہیں دکھائی دیتے ہیں۔
اگر آج نشر خیر اور اشاعت اسلام کی وہ رفتار قائم نہیں ہے تو سوچئے نقص کہاں ہے؟ کیا تعلیمات کا حسن اجاگر نہیں ہو رہا یا پیشکش کا انداز اثر آفرین نہیں رہا۔ حصار ذات میں غلطاں کوئی بھی کاوش بار آور نہ ہوگی۔ دعوت تب انقلاب پیدا کرتی ہے جب اس میں حقائق شناسی، صداقت شعاری، بے غرض اصول پسندی اور مخلوق سے پیار ومحبت کی نمود ہوتی ہے، محبت فاتح عالم ہے، یہی دعوت کی اساس بننی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے محبوب کریم ﷺ کی تعلیمات کو اپنانے اور ان کے مطابق ترویج دین کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تعلیم وتربیت میں ہم آہنگی

تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢﴾ (الجمعة:2)

"وہ ذات جس نے اُمیّین میں انہیں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جواُن پر اُس کی آیات پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، بلاشبہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"

اس آیت کریمہ میں مناصبِ نبوت کا ذکر کیا گیا کہ وہ چار ہیں، تلاوتِ آیات، تزکیہ نفوس اور تعلیم کتاب وحکمت، ترتیب آیت واضح کر رہی ہے کہ آیات کی تلاوت جو حرف شناسی کے مرحلہ اولین کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے بعد تزکیہ نفوس کا ذکر ہے جو تعمیر سیرت اور پاکیزگی کردار کا مرحلہ ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُس آفاقی دُعا جو تعمیرِ کعبہ کے موقعہ پر مانگی گئی تھی، میں تزکیہ کا ذکر آخر پر ہے مگر دُعا کی تکمیلی صورت میں اسے تعلیم کتاب وحکمت پر تقدم حاصل ہے، اس ترتیب نے واضح کر دیا کہ تربیت وجود کے فرض کو کس قدر اولیت دی جا رہی ہے اس لئے کہ اس کے بغیر تعلیم کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوتے، ظاہر ہے کہ تعلیم کس قدر بھی اہمیت کی حامل ہو اس کے اثرات مرتب نہیں ہو سکتے جب تک متعلم کا رویہ ذہنی وقلبی طہارت کا آئینہ دار نہ ہو، اسلامی تعلیمات

کی یہی اساس اس کا امتیازی وصف ہے کہ ان میں علم صرف حصولِ معلومات کا ذریعہ نہیں بلکہ تعمیر کردار کا اساسی جوہر ہے اسی لئے تو اس کا دورانیہ مہد سے لحد تک ہے کہ کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں کہ انسان اپنے انسانی جوہر سے ناآشنا ہو سکے، یہ زندگی بھر کا فرض ہے اور اس کا اظہار ہر قدم پر ہونا چاہئے، رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کا عملی اُسوہ اسی ہم آہنگی کا درس دیتا ہے، نبی رحمت ﷺ نے اپنے نبوی مشن کی ابتداء ہی اس سے کی تھی، غارِ حرا کا قیام جہاں غور وفکر کی معراج تھا وہاں تربیتی رویوں کی ترسیخ کا مرحلہ بھی تھا اس لئے جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس ذمہ داری کا اظہار فرمایا تو انہوں نے کرداری اوصاف کا ہی تذکرہ کیا تھا اسی فکر ومجاہدے کا نتیجہ یہ تھا کہ شاعر مشرق بھی اعتراف کا اعلان کرنے لگے۔ فرمایا:

در شبستان حرا خلوت گزید   قوم و آئین و حکومت آفرید

اور جب پہلی مرتبہ مکہ مکرمہ کے باسیوں سے خطاب فرمایا تو اُن سے اپنی صداقت کا سوال کیا، ایسا معاشرہ جو عام طور پر صداقت ناآشنا ہو چکا تھا اس سے پہلے قدم پر ہی صداقت کا اعتراف کرانا تعمیر کردار کی خشت اول تھی، اعلانِ نبوت کے چالیس سال ذہنوں کو مانوس کرنے اور کرداری صداقتوں کے اظہار کا ہی دورانیہ ہے۔

کتاب الہام کی تعلیم سے قبل عملی تربیت کے ایسے نقوش ثبت ہو چکے تھے کہ اعلان نبوت کے ساتھ ہی چند نیک نفس جو تربیتی دورانیئے کے شاہد تھے، حاضر دربار ہو گئے، اور انہوں نے بغیر کسی دلیل یا معجزے کے اسلام قبول کیا، تسلیم ورضا کا یہ محیر العقول واقعہ تربیتِ ذہنی کا وہ شاہکار ہے جس کے اثرات بعد کی زندگی میں بھی نمودار ہوتے رہے، کوہِ صفا پر نبی اکرم ﷺ کا پہلا خطبہ کسی آیت کریمہ پر مشتمل نہ تھا اور نہ ہی عقائد حقہ کی وضاحت پر مرکوز تھا، صرف اور صرف اپنا کردار پیش کیا جو سامعین کا ہر روز کا مشاہدہ تھا، معلوم ہوا تعلیمات نبوی کی اساس کردار افروزی پر تھی، تعلیم تبھی

کامیاب ہوتی ہے جبکہ متعلم کا رویہ قبولیت پر مائل ہو چکا ہو، رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات جہاں تعلیم کی اہمیت وفضیلت بیان کر رہی تھیں اور ناخواندہ اور جاہلی معاشرے کو دربار علم کی راہ دکھا رہی تھیں، وہاں اُن افراد کے جاہلی رویوں کی بھی اصلاح کر رہی تھیں اور ان میں مومنانہ خصائل کی نمود کا ذریعہ بن رہی تھیں۔

رسول رحمت ﷺ کی تعلیمات جہاں ترویج علم کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں وہاں وہ کرداری رویوں میں مثبت تبدیلیاں لا رہی تھیں، سیرتِ رسول ﷺ کا جائزہ لیجئے تو دونوں پہلوؤں کا ایک متوازن اور حسین امتزاج نظر آتا ہے مثلاً

ترویج علم کی کاوشیں اس قدر ہمہ جہتی اثرات رکھتی ہیں کہ وہ معاشرہ جہاں علم کی سرافرازی تو کجا حرف شناسی کی صلاحیت بھی نہ تھی، علامہ بلاذری رقم طراز ہیں کہ جب مکہ مکرمہ میں اسلام کا اعلان ہوا تو صرف سترہ افراد ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، یاد رہے کہ مکہ مکرمہ مذہبی مرکز تھا اور تجارتی بھی، وہاں کا یہ حال تھا تو باقی عرب معاشرے کی حالت کیا ہوگی، یہ عیاں ہے دارِ ارقم کا تعلیمی مرکز مکہ مکرمہ کی وادی میں پہلا مکتب علم تھا جس کے اثرات پوری اسلامی تاریخ پر نمایاں ہیں، تبلیغی مساعی کا دائرہ جب اہل یثرب تک ممتد ہوا اور دوسری حاضری پر ستر سے زائد افراد حصارِ رحمت میں آ گئے تو مزید تربیت کے لئے ایک معلم ساتھ روانہ کیا گیا، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی علمی پیش رفت اور تربیتی کاوش کا اثر دیکھئے کہ صرف ڈیڑھ سال بعد ہجرت ہوئی تو اوس وخزرج مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو چکے تھے اس سے رسول اکرم ﷺ کے حُسنِ انتخاب کا بھی اظہار ہوتا ہے اور حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی مساعی جمیلہ کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب نبی رحمت ﷺ مدینہ منورہ میں داخل

ہو رہے تھے تو مرد ہی نہیں، جوان ہی نہیں، بچیاں خیر مقدمی ترانے گا رہی تھیں، پتہ چلا کہ تربیت کے اثرات کس قدر ہمہ گیر تھے کہ عرب معاشرہ جہاں عورتوں اور خصوصاً بچیاں حد درجہ پسماندہ تھیں، وہ بھی اس تربیت سے فیضیاب ہو چکی تھیں اور ایمان کا نور اُن کے قلب ونظر کو بھی تسخیر کر چکا تھا، ایک معلم کی تربیت کا یہ شاہکار ہر معلم کے لئے مینارۂ نور ہے۔

غزوہ بدر کے اسیروں سے ترویج علم کا اہتمام کرانا نبوی بصیرت کا روشن باب ہے، ماحول پیدا کیا گیا اور معاندین سے بھی اپنا حق وصول کر لیا گیا، کتنے نامور بزرگ اس تعلیمی روش سے فیضیاب ہوئے اس کا اندازہ صرف اس حقیقت سے لگائیے کہ اسیران بدر کے متعلمین میں وہ بھی شامل تھے جو تدوین قرآن کے بورڈ کے امیر تھے یعنی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ کو تو بعد میں نبی اکرم ﷺ نے عبرانی سیکھنے کا بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اس طرح حکومتی اسرار کی پاسداری ممکن تھی۔

مسجد نبوی میں ''صفہ'' کا قیام اقامتی درس گاہ کی خشتِ اول تھی، ستر کے قریب صحابہ رضی اللہ عنہم وہاں دن رات درسی مقاصد کے لئے حاضر رہتے تھے، معلمین مقرر تھے جن کی نگرانی خود نبی اکرم ﷺ فرماتے تھے، ظاہر ہے ان طلبہ کی عملی تربیت سایہ نبوت میں ہی ہوتی تھی، روایت ہے کہ یہ اصحاب صفہ دن کے وقت محنت کرتے، جنگل سے لکڑیاں چُنتے اور رات کو حصولِ علم کی منزلیں طے کرتے، اس طرح طلبہ کے اندر خود کفالت کے جذبوں کی آبیاری ہوئی اور خودداری کے رویوں کی تربیت بھی ہوئی، اسی ایک صفہ پر بھروسہ نہیں کیا گیا جہاں جہاں بھی اسلام کی اشاعت ہوئی، تربیت کے لئے معلم بھیجے گئے اگرچہ بعض معلمین ظلم کا بھی شکار ہوئے اور شہید بھی

کردیئے گئے مگر یہ سلسلہ جاری رہا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے نزدیک تعلیم وتربیت کی کس قدر اہمیت تھی کہ خطرات کے باوجود اس مشن کو موقوف نہیں کیا گیا۔

نبی آفاق ﷺ نے تربیتی مراحل کا اس وقت بھی خیال رکھا جہاں ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا، غزوہ بدر اسلامی تاریخ کا پہلا اور نازک غزوہ تھا کہ اس کی فتح مندی کے ساتھ اسلام کا مستقبل وابستہ تھا مگر جب مبارزت کی اجازت ملی تو حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے سبقت کی، وہ سب سے پہلے دربار میں حاضر ہوئے اور قتال کی اجازت مانگی مگر نبی رحمت ﷺ نے اجازت نہ دی، وجہ یہ تھی کہ لشکر مکہ کی طرف سے جو جنگ جو سامنے آئے تھے ان میں عتبہ تھا، شیبہ تھا جو عتبہ کا بھائی تھا اور ولید تھا جو عتبہ کا بیٹا تھا اور لشکر اسلام میں سے جو اذنِ مبارزت مانگ رہا تھا وہ اسی عتبہ کا حقیقی بیٹا تھا، یعنی اس کے سامنے اس کا باپ تھا چچا تھا اور بھائی تھا، غزوہ کی ہیبت ناکی بھی نمایاں تھی اس کی نزاکت کا بھی اندازہ تھا مگر رحمت عالمین ﷺ جو جنگ کی فتح مندی سے زیادہ تربیت اولاد کو مقدم رکھتے تھے نے اصرار کے باوجود اجازت نہ دی کہ آپ ﷺ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ایک بیٹا اپنے باپ کو قتل کردے تاریخ عالم تربیت کے ایسے واقعات کو آج بھی ترس رہی ہے مگر یہ تعلیمات نبوی ﷺ کا امتیاز تھا کہ تربیتی مراحل کو کبھی نظر انداز نہ ہونے دیا، تعلیمی وفود کو روانہ کرتے وقت جہاں اشاعت علم کی تاکید کی جاتی تھی وہاں یہ بھی نصیحت کی جاتی تھی کہ:

يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا أَنِّسُوا وَلَا تُنَفِّرُوا (صحیح البخاری کتاب المغازی)

"آسانیاں پیدا کرنا ہیں تنگیاں عام نہیں کرنا، اُنس و رغبت دلانا ہے نفرت نہیں کرنا ہے۔"

سوچئے جب معلّم یُسر و اُنس کے جوہر سے سرفراز ہوگا تو متعلمین وطلبہ میں

اشتیاق علم کی کیسی فراوانی ہوگی۔ دورِ نبوت اور عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں طلبہ پر سختی کی اجازت نہ تھی، اسی لئے ایسے معلمین منتخب کئے جاتے تھے جو اس منصبِ جلیل کے اہل ہوتے تھے تاریخ گواہ ہے کہ جس کا بھی انتخاب ہوا، اُس نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے، یہ اسی لئے ممکن ہوا کہ اساتذہ کی تربیت کی جاتی تھی اور کہیں روانہ کرنے سے قبل اُن کو اس منصب کے لئے تیار کیا جاتا تھا مثلاً علامہ طبری لکھتے ہیں کہ سات ہجری میں مختلف شاہانِ عالم کو دعوتی خطوط لکھے گئے اور ان خطوط کے لئے سفیر منتخب کئے گئے اور مسجد نبوی سے ان کو روانہ کیا گیا، وہ جب نکلے تو کس حال میں تھے کہ:

كُلُّهُمْ يَتَكَلَّمُونَ بِلِسَانِ قَوْمِ الَّذِيْنَ بُعِثَ إِلَيْهِمْ (الطبری)

"کہ سب کے سب وہ زبان بول رہے تھے جو اُن قوموں کی زبان تھی جن کی طرف بھیجے جارہے تھے۔"

سوچئے کہ ایک مسجد جس کی چھت بھی مضبوط نہیں کہ بارش ہو تو ٹپکنے لگتی ہے اور کچا فرش کہ جس پر لیٹیں تو رخسار خاک آلود ہوجاتے ہیں، نہ کوئی یونیورسٹی اور نہ کوئی زبان سکھانے کا ادارہ، مگر یہ سب مکتوب الیہم کی زبانیں بول رہے ہیں، یہ ہے وہ تعلیم جو درسگاہِ نبوت سے حاصل ہورہی تھی اور پھر جب یہ سفراء اپنے اپنے مراکز تک پہنچے تو ان کا رویہ کیا تھا، صرف شاہ مصر شاہ مقوقس کے الفاظ سے اندازہ لگایئے، خط پڑھا، گفتگو کی تو کہنے لگا تو تُو سمجھدار آدمی ہے اور جس نے تجھے بھیجا ہے وہ بھی کوئی حکیم ہے، یہ تھی تربیت کہ جہاں گئے نقوشِ تربیت چھوڑتے آیئے، سوچیے کتنے سفیر ہوں گے جو اپنے رویوں سے اپنے ملک اور حکومت کے لئے نیک نامی کا سبب بنیں گے؟ اس سے اُس حسین ہم آہنگی کا اندازہ ہوتا ہے جو تعلیمات نبوی کے ذریعے تعلیم وتربیت کے

درمیان پیدا ہو چکی تھی۔ یہ رسول اکرم ﷺ کا وہ اُسوہ ہے جو ہر معلم کے پیش نظر رہنا چاہئے، ہمدردی کے جذبات خیر خواہی کا رویہ اور مصالحانہ ماحول کا قیام تعلیمی نظام کے بنیادی عناصر ہیں جو فروغِ علم کا ذریعہ ہوتے ہیں، ذرا مسجد نبوی کی تعمیر کی ابتداء کے واقعات کا شمار کیجئے کہ کس طرح پتھر چُننے کے لئے گارا بنایا جارہا ہے، ایک حضری اُجرت پر لیا جاتا ہے، وہ گارے میں پاؤں مار مار کر مٹی کو گارے کی شکل دے رہا ہے کہ نبی رحمت ﷺ تشریف لے آتے ہیں، قریب کھڑے ہو کر غور سے اُس کے پاؤں کی حرکت مشاہدہ کر رہے ہیں، کام میں لگن نظر آئی تو آگے بڑھے، اور فرمایا تو تو اپنے کام میں بڑا پختہ ہے، یہ ارشاد فرمایا کہ اسے گارا بنانے پر رہنے دو اور تحسین فرمائی کا اثر یہ تھا کہ وہ تربیتی لمحہ زندگی بھر کا رُخ موڑ گیا، اسی کے اثرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں دمک رہے ہیں۔ (وفاء الوفاء جلد 1 ص 33)

علم کی روشنی ہر انسان کا حق ہے اور حاصل کئے گئے علم کو دوسروں تک پہنچانا بھی ہر صاحب علم پر لازم ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق علم حاصل کرنا فرض ہے اس لئے ہر فرد ایمانداری کے جذبوں کے ساتھ اسے حاصل کرے مگر جب حاصل ہو جائے تو دیانتدارانہ رویوں کے ساتھ اسے قوم تک پہنچائے کہ حاصل کرنا بھی فرض ہے اور منتقل کرنا بھی لازم ہے، یہی رویہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم امت صاحبانِ علم و عمل پر مشتمل ہوئی، قرآن مجید نے اُولُوا الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَار ارشاد فرما کر واضح کر دیا کہ مسلمان صاحبان قوت و نظر امت ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو علم کی روشنی بھی عطا کی، تعلیم کتاب و حکمت سے فرد فرد کو سرافراز کیا اور یُزَکِّیْھِمْ کی تربیت سے ایسے کردار کی تعمیر کی کہ صدیاں گزرنے کے باوجود کوئی

معاند سے معاند بھی اُن کی پاکیزہ سیرتوں کو داغدار نہیں کر سکا۔ نبوی تعلیمات کی برکات سمیٹنے کے لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم:

- ایسے صاحبان قوت و نظر اساتذہ پیدا کریں جن کے کردار و سیرت سے آئندہ نسل کی تشکیل ہو سکے۔
- علم کی بارگاہ میں بلا امتیاز اور بغیر کسی تفریق کے حاضر ہو جائیں کہ عظمت و شرافت کی اساس علم و تربیت قرار پائے۔
- ایسے ادارے قائم کریں جہاں باصلاحیت افراد کو حکومتی سرپرستی میں علم کے حصول کی سہولت بہم پہنچائیں اور اُن کے اندر جذبۂ خدمت کی آبیاری کریں۔
- اُن تمام علوم کو اپنے نظامِ تعلیم میں جگہ دیں جو روحانی آسودگی اور مادی خوشحالی کا ذریعہ بنیں تاکہ پاکیزہ کردار ماہرین پیدا ہو سکیں کہ انہیں سے ملت کو بھلائی کی امید ہے۔
- ایسے افراد تیار کریں جو علوم میں مہارت تامہ رکھتے ہوں اور محاسبۂ نفس کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں کہ صرف ماہرین ہی قوم کی راہنمائی کے قابل نہیں کہ تزکیہ نفوس کے بغیر علم وہ ستم ڈھاتا ہے کہ انسانیت سسکنے لگتی ہے۔
- اصحاب حیثیت افراد کے ضمیروں کو جھنجھوڑیں تاکہ وہ بھی تعلیم و تربیت کے میدان میں عملی اقدام کریں، اس پیش رفت کو دولت سمیٹنے کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ اُخروی نجات کا وسیلہ سمجھیں۔

اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کے اساسی فرض کو نبھانے کی اس ملت کو توفیق بخشے تاکہ تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں ہم ایک صالح معاشرہ قائم کر سکیں آمین

عدم برداشت کا رجحان اور تعلیمات نبوی ﷺ

حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات، شرفِ انسانیت کی محافظ، عظمتِ بشر کی نگہبان اور تمام تعلیمات کی جامع ہیں، آپ ﷺ کا عطا کردہ نظامِ حیات، ہمہ گیر بھی ہے اور وسعت پذیر بھی اس لئے کہ یہ تعلیمات نہ جز وقتی ہیں اور نہ محدود، ان کے نفاذ کی ابتداء انسان کے اندر سے ہوتی ہے جس سے داخل کے جذبات، میلانات اور رجحانات میں انقلاب آتا ہے، داخلی انقلاب کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کے تمام سماجی رویے بدل جاتے ہیں، تعلقات باہمی کا پیمانہ، ذاتی انا یا گروہی حصار نہیں ہوتا بلکہ یہ وحدتِ نسل انسانی کے حوالے سے متعین ہوتا ہے جس سے اخوت رواداری، برداشت وموانست کے جذبات فروغ پاتے ہیں ایک دوسرے کے لئے نیک جذبات اور مناسب کشادگی کی نمود ہوتی ہے۔ تعلیماتِ نبوی کی یہ ہمہ گیر اثر پذیری تب رونما ہوتی ہے جبکہ ان کے مطابق تعلقات ومعاشرت کو ترتیب دیا جاتا ہے مگر یہ بدقسمتی انسانی المیہ کا روپ دھار لیتی ہے جبکہ انسان، جاہ پسندی اور خودسری کی تحریک سے شیطانی راہ اختیار کرلیتا ہے، تاریخ انسانی گواہ ہے کہ حیوانی خواہشات نے انسان کو انسان کے لئے درندہ بنائے رکھا ہے، یہ خواہشات کا دباؤ مختلف روپ میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ کبھی نسل کے محدود تصور نے تفاخر کا احساس دلایا تو کبھی رنگ وروپ کی ظاہر پرستی نے سرمستیوں کو دعوت دی۔

حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے قبل اولادِ آدم اسی طبقاتی کشمکش

اور نسلی عدم برداشت کا شکار تھی، عرب ہی نہیں پوری معلوم دنیا عداوت کی آگ میں جل رہی تھی خواہشات بے لگام تھیں اور برتری کی تمنا۔ کے عفریت نے انتقام اور عدم برداشت کی راہ دکھائی تھی، ایران کی وسیع قلمرو ہو یا قیصرِ روم کی بڑی سلطنت۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی نظروں میں لالچ اُتر آیا تھا۔ آج کی دنیا بھی اُسی بے لگام خواہش کی اسیر ہے، اپنی عظمت کا احساس ہر قسم کے جبر کو اپنانے کی تحریک بن رہا ہے دوسروں کو برداشت کرنے کی اعلیٰ انسانی روایات ناپید ہوتی جارہی ہیں یہ سب ناپختہ شعور اور ہمہ جہت محیط عدم برداشت کے رویے کا شاخسانہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی تعلیماتِ کی اساس، عقل وشعور کے انسانی رویوں پر رکھی گئی ہے، کسی نظریہ حیات میں اپنے آپ کو منوانے کی صلاحیت ہو تو طاقت کا استعمال اور بہیمانہ اظہار خود پرستی لائق توجہ نہیں رہتا، قوت وطاقت کا اندھا پن، یقین کی بے ثباتی اور ایمان کی کمزوری کی علامت ہوتا ہے۔ تاریخِ اسلام کے صفحات گواہ ہیں کہ رحمتِ عالمین ﷺ نے کسی حال میں بھی جبر واستبداد کا سہارا نہیں لیا، اُن دشمنوں کو بھی عدم برداشت کا نخچیر نہیں بنایا جو آپ کے مشن کے مخالف بھی تھے اور شمعِ حیات کو بجھانے کے درپے بھی تھے، آپ نے مخالفت کے تشدد کا جواب حلم وبردباری، جاہلانہ شورش کا جواب متانت وسنجیدگی اور ظلم وجور کا جواب، عفو وکرم کے بے پناہ حوصلے سے دیا۔ مکہ مکرمہ کی سرزمین پر ظلم وستم کا ہر حربہ آزمایا گیا، گزرگاہوں کو خوں آشام کیا گیا، راستوں میں کانٹوں کے آزار بچھائے گئے، نہ عظمتِ آدمیت کا لحاظ رہا اور نہ ہم نسبی وہم وطنی کا پاس رہا مگر نبی آفاق ﷺ نے ان رویوں کو جاہلیت، انانیت اور عدم برداشت کا مظہر گردانتے ہوئے رد کردیا وگرنہ جس

سربراہ کے پاس، بلال حبشی، صہیب رومی اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم جیسے معاشرے کے ستائے ہوئے جانثار ہوں وہ ابوجہل، ابولہب، عتبہ اور شیبہ کی گردنیں اُتارنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے مگر ظلم کا بدلہ ظلم تو کافروں کا رویہ ہے۔ مومن تو ظلم کا بدلہ ظلم کے ہاتھ روک کر دیا کرتا ہے اور وہ وجود اکرم جو ایمان کی اساس ہو، ظلم کو کس طرح پذیرائی بخش سکتا ہے، معاہدہ حدیبیہ کی شرائط بظاہر کمزور دکھائی دیں مگر ان سے ساتھیوں کی رفاقت پر اعتماد کا اظہار بھی ہوا، ابوجندل کے خون آلود جسم پر مشقِ ستم برداشت کر لینا، ارفع معیار انسانیت کی تمہید قرار پایا، اسلامی تعلیمات کی بنیاد انہیں سنہری اصولوں پر رکھی گئی، ایک کا قتل، پوری انسانیت کا قتل گردانا گیا اور ایک وجود کی بقا کو پوری نسل انسانی کی بقا شمار کیا گیا کہ اسلام، سلامتی کا پیغام ہے اور ایمان، امن کی کفالت کا حوالہ ہے۔ اسلام کا پیغام پر امن ہے کہ امن دہندہ کا پیغام ہے، اُس وجود مکرم نے آمنہ (رضی اللہ عنہا) یعنی امن عطا کرنے والی گود میں پرورش پائی ہے اور بلدِ امین یعنی امن بخش شہر میں اپنے مشن کا آغاز کیا ہے۔ معیار اتنا بڑا ہے کہ

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ (الانعام:82)

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں ظلم کی آمیزش نہ کی اُن کے لئے امن ہے۔'' اور وہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔

ظلم، حد سے تجاوز کا نام ہے۔ اور حدود آشنائی، بین الاقوامی تعلقات کی اساس ہے، یہ حدود آشنائی صرف حقوق میں ہی نہیں رویوں میں بھی ضروری ہے کہ مومن اپنے قول و فعل پر ضبط و اعتدال کا پہرہ بٹھاتا ہے۔ مومن نہ زبان دراز ہوتا ہے

نہ دست دراز، وہ اختلاف تو کر سکتا ہے، عداوت نہیں، علمی اختلاف، تلاش علم کا محرک ہے، اسے رحمت قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ اختلاف کیسا جو گردن مارنے پر اُکسائے، یہ اختلاف نہیں، بے حوصلگی ہے، بے صبری ہے، بلکہ ایمان کے تقاضوں سے انحراف ہے، مومن برداشت کا کوہِ جمال ہوتا ہے، یہی جمال انسانی معاشرہ کو خوشگوار اور پر بہار بناتا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت اور ان میں اعتماد و برداشت کا روح پرور منظر دیکھنا ہو تو حیاتِ رسول ﷺ کے اُن گوشوں پر نظر ڈالئے جو اقوام عالم کے ساتھ باہمی روابط کے مظہر ہیں۔ اسلام کی ابھرتی ہوئی قوت اور باطل کی پسپا ہوتی ہوئی جھنجھلاہٹ کے تناظر میں وہ مکاتیب پڑھیے جو دربار نبوی ﷺ سے شاہانِ عالم کے نام لکھے گئے، ان مکاتیت کا حرف حرف، اسلامی مزاج اور نبوی خلق کا پیغام ہے، ہر ایک کو کہا گیا ''اَسْلِمْ تَسْلَمْ'' اسلام قبول کر لو یا یہ کہ نظریہ اسلام کی جانب جھک جاؤ سلامتی پاؤ گے۔ جب رویوں میں سلامتی اور تعلقات میں برداشت نمایاں ہوئی تو کرم فرمائیوں کی بے مثال تاریخ مرتب ہوئی۔ بین الاقوامی روابط میں عدم تشدد، ہمہ جہتی حسنِ سلوک و برداشت اور انسانی انداز آخذ و ترک اسلامی تعلیمات کا مقصود رہا ہے۔

دنیا مختلف النوع افراد اور متضاد نظریات کی حامل اقوام پر مشتمل ہے، یہ ممکن نہیں کہ پوری نسلِ انسانی ایک سے خیالات کی حامل ہو، نظریات کا اختلاف اور اعمال کا تفاوت ناگزیر ہے۔ اگر ہر کوئی اپنے نظریے کو نافذ کرنے لگے اور اپنے عمل کو ہی وجہ ثواب ٹھہرائے تو تصادم ناگزیر ہے، اسی سے دنیا کا امن تباہ ہوتا ہے بین الاقوامی امن و سکون کی ضمانت صرف اور صرف وہ قوم دے سکتی ہے جو دوسروں کو

برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو، یہ حوصلہ نظریات کی پختگی عطا کرتی ہے، عقیدہ پختہ ہوتو دوسروں کا خوف نہیں رہتا اور یہ بھی کہ دوسروں کے ساتھ نباہ میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ نبی محترم ﷺ نے نظریات وعقائد کی یوں ترسیخ کی کہ ہر صاحب ایمان غیروں کے حصار میں بھی زندہ رہنے کا حوصلہ پانے لگا، اس حوصلے نے اعتماد پیدا کیا اور یہ اعتماد دوسروں کو جینے کا حق دینے پر دلیر ہوا، یہی وجہ تھی کہ اسلام کے دورِ عروج میں غیر مسلم رعایا کو زیادہ تحفظ حاصل رہا، جب بھی اسلامی تعلیمات پوری قوت سے نافذ ہوئیں تو غیر مسلم رعایا اور غیر مسلم تعلق دار زیادہ محفوظ رہے۔ حضور ﷺ نے جب بھی قومی وملی تحفظ کی بات کی تو خطاب ایھا الناس سے شروع کیا۔ خطبہ حجۃ الوداع اس کی روشن مثال ہے اور جب انسانی شرف کو علاقائی تعصّبات اور لسانی عصبیت سے آزاد کرانے کا اہتمام فرمایا تو رب واحد کا حوالہ دیا۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق یہ سرزمین سب کا گھر ہے، سب کے لئے قرار گاہ اور سب کے لئے ذریعہ زیست، سوچئے جو وجود مکرم ﷺ زمین کو سب کے لئے تسلیم کرلے وہ کسی فرد، اجتماع، معاشرہ یا قوم وملک کو زندگی بسر کرنے کا حق دینے سے انکار کرسکتا ہے؟ اور جو قیامت تک کے لئے اس سرزمین کو روزی کا کفیل سمجھے وہ کسی کو رزق کی تلاش سے محروم کر سکتا ہے، اقوام تو ایک بڑا مجموعہ ہے اسلام تو ایک انسان بلکہ ایک جاندار تک کو حقِ سکونت اور حقِ معشیت سے محروم نہیں کرتا۔ وہ سب کو برداشت کرتا ہے۔

بین الاقوامی امن وسکون اس لئے پامال ہوتا ہے کہ کوئی قوم یا گروہ دوسرے لوگوں کا علاقہ چھین لینے پر دلیر ہوجاتا ہے یا اُس کی روزی کے وسائل پر قابض ہونے کے لئے مضطرب ہوتا ہے۔ یہ دنیا صرف اس صورت میں امن کدہ بنے گی جب

سرورِ کائنات ﷺ کے فرمودات کی روشنی میں، معاشرتی برابری، معاشی انصاف، سیاسی دیانت، احسان کی عادت، برداشت کی قوت اور سب سے بڑھ کر اولادِ آدم کی نسبت پر فخر اور ایک خالق کی مخلوق ہونے کے تصور پر ناز پیدا ہوگا۔

وطنِ عزیز پاکستان، مسلمانانِ برصغیر کی تمناؤں کا مظہر ہے۔ یہ ایک ایسا عافیت کدہ ہے جس کے لئے بہت قربانیاں دی گئیں، اس خطۂ امن میں اگر خوف در ودیوار پر دستک دیتا رہے تو یہ قربانیاں کس کام آئیں؟ اسے تو محبت کا نگر اور اخوت کا مسکن بننا ہے۔ اس ساحلِ مراد کو ایسا گلشن بننا ہے جہاں محبت کے زمزمے پھوٹیں، اتحاد واتفاق کے نعرے گونجیں، یہ تو کوئی نہیں کہتا کہ اپنی سوچ کو دوسرے کی سوچ کے تابع کرلو، اپنے مسلک کو دوسرے کے مسلک کے لئے قربان کردو، کہنا تو صرف یہ ہے کہ دوسروں کے لئے برداشت کا حوصلہ پیدا کرو، آزاد فضا میں سانس لینے کی تمنا رکھنے والے کو دوسرے کی سانسیں روکنے کا حق نہیں، کیا ہی اچھا ہو کہ اہل مدینہ منورہ کے ایثار واخوت کو اپنایا جائے اور مواخات کے سنہری اصولوں کو حرزِ جاں بنایا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس سرزمینِ پاک پر سچے جذبوں اور مہکتے ارمانوں کے ساتھ انسان بلکہ مسلمان بن کر رہنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

سادگی اور کفایت شعاری

سیرتِ رسول ﷺ کی روشنی میں

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۔وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝۲۹ (بنی اسرائیل 29)

اسلام دینِ فطرت ہے توازن اس کا بنیادی وصف ہے ،افراط اور تفریط توازن کی ضد ہیں اس لئے قابلِ نفرت بھی ہیں اور لائقِ اجتناب بھی، اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس کا ہر فرد متوازن کردار کا حامل ہو۔ کردار کا یہ توازن مقتضی ہے کہ انسانی زندگی کی تمام جہتوں کو راہِ اعتدال دکھائی جائے تا کہ اُس کے تمام پہلو، روحانی ہوں یا مادی، معاشرتی ہوں یا معاشی، وحدت آشنا ہو جائیں۔ اسلام تعمیرِ سیرت کا داعی ہے اس لئے جہاں وہ افعال حسنہ اور اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم دیتا ہے وہاں وہ ہر اُس عمل وحرکت سے بچنے کی تلقین بھی کرتا ہے جس سے کردار میں مصنوعیت اور کھوکھلا پن پیدا ہو، نمود ونمائش، تصنع وتکلف، اسراف وتبذیر ایسے مذموم مظاہر ہیں جن سے معاشرتی امراض اور کرداری سقم پیدا ہوتے ہیں اس لئے ان سے اجتناب کا حکم دیا گیا اور عملی نمونہ بھی فراہم کیا گیا۔

نبی رحمت ﷺ نے انسانی فلاح ،معاشرتی بہبود ،سماجی انصاف اور معاشی خود کفالت کے ایسے ضابطے اور راہنما اصول متعین فرمائے کہ ان کے

نفاذ واجراء سے انسانی معاشرہ، شرفِ آدمیت کے تحفظ اور احسن تقویم کے معیار کو پالیتا ہے کامرانیوں کا جادۂ مستقیم یہی ہے کہ انسان، سیرت رسول ﷺ کی پناہ میں آجائے ارشاد باری ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔(الاحزاب:21)

''بیشک رسول اکرم ﷺ کے وجود میں تمہارے لئے اسوۂ حسنہ ہے''۔

یہ آیت ایک پہلو یا خاص رُخ کی نشاندہی نہیں کرتی بلکہ یہ بے قید عمومیت اور ہمہ گیریت کی خبر دیتی ہے۔رسول اکرم ﷺ ہر انسان کے لئے ہر دور کے لئے اور ہر حال کے لئے راہنما وجود ہیں انسان زندگی کی بوقلمونی کسی سطح پر ہو اور گردش دہر کے تنوع کے کسی موڑ پر ہو، اُسے ایک ہی حسین تر نمونہ ملے گا، یہ اشارہ دے دیا گیا کہ نمونے اور بھی بنا سکتے ہو اور کئی افراد ایسا دعویٰ بھی کریں گے مگر راہنمائی کا حُسن اور دستگیری کا مربوط و حسین تعلق ایک ہی ہوگا۔ جس عمل میں اور جس کردار میں احسن کی تمنا کرو گے تو سامنے ایک ہی وجود آئے گا۔ رسوائیوں سے نجات کی خواہش ہو یا آسودگیوں کی تمنا۔ تحفظ ذات کا مرحلہ درپیش ہو یا تعمیرِ سیرت کا، تعلقات کا گھمبیرین ہو یا اجتماعی کفالت کا، معاشی مسائل ہوں یا سماجی ہیجانات سب کو پابند آداب بنانے اوران میں اخلاق وکردار اُجالنے کا ایک ہی ذریعہ ہوگا اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ کا اسوہ اور آپ کا لایا ہوا پیغام جامع بھی ہے اور بے لاگ بھی ،فطرت کے مقاصد کا امین بھی اور اس کا پاسدار بھی، حضور اکرم ﷺ نے حیاتِ انسانی کی یوں کفالت کی ہے کہ وحدت ذات کا جوہر پیدا ہوا ہے معاش ومعاد میں آشتی اور مادہ وروح میں پیوستگی آپ کی تعلیمات کا حُسن ہیں کہ ان میں روحانی واخلاقی قدروں کی صیانت کا سامان

بَطَرِتْ کا کلمہ دورِ حاضر کی اصطلاح (INFLATION) کا کس قدر بھرپور اظہار ہے۔ یہ علمائے لغت ہی بتا سکتے ہیں۔

انسانی معاشرہ میں برائیوں کی افزائش یا تو کثرتِ زر سے ہوتی ہے یا آسان جلب زر سے، کبھی انسان دولت کی جلترنگ کا اسیر ہوکر معاشرہ میں اپنی سطوت وعظمت کا اعلان کرتا ہے اور دوسروں کو انفاق بے سبیل کے ذریعے مرعوب کرتا ہے تو کبھی دوسروں پر رزق کے دروازے بند کرکے قارون صفتی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لباس کی چمک دمک، سواریوں کی آمدورفت، منزلوں کی رفعت، گھرانوں کی چمک اور رعنائی، یہ سب برتری کے شاخسانے ہوتے ہیں۔ دوسروں کی عزتِ نفس کو مجروح کرکے تسکین پائی جاتی ہے۔ اسی کے لئے ذرائع آمدنی سے جائز وناجائز کی قدغنیں اُٹھائی جاتی ہیں۔ علیحدہ نظر آنے کا فریب، ہمہ وقت بے چین رکھتا ہے اور جب اس خودنمائی اور نخوت پذیری پر انگشت نمائی ہوتی ہے تو جواب بڑا منطقی اور استدلالی نوعیت کا ہوتا ہے۔ محنت سے حاصل کی گئی دولت میری ہے اس کو خرچ کرنے کا مجھے حق حاصل ہے۔ یہ تو تحدیث نعمت ہے اور آسودگیوں کا شکرانہ ہے ایسے ہی کئی جملے اور دلائل، خواہش نفس کو مطمئن کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ دولت کا ارتکار بجائے خود محل نظر ہے غور کیا جائے کریدا جائے تو اس آسودگی کے نیچے متعدد ظلم، بے شمار برائیاں اور مختلف قسم کے سیاہ اعمال نظر آتے ہیں کسی غریب کی حق تلفی، کسی یتیم کی جائیداد پر غاصبانہ قبضہ، کسی قومی غیرت کا نیلام، غداری، ہم وطنوں سے بے وفائی اور بداعمالیوں کی غلاظت، کسی خودسر امیر، کسی نام نہاد جاگیردار اور کسی نودولیتے ساہوکار کا شجرہ نسب پڑھ لیجئے۔ گناہوں کی طویل فہرست سامنے آئے گی۔

اسی پر اگر کہا جائے کہ بدقماشی کا سلسلہ بہت طویل ہو چکا۔ اب ہی حساب برابر کر لیجئے تو جبیں شکن آلود اور دل آتشِ انتقام سے دہلنے لگتے ہیں یہ کوئی داستان نہیں، وطنِ عزیز کا پیش پا واقعہ ہے۔

یہ تو ناجائز دولت کی بات تھی، جائز دولت بھی تو امانت ہے اس کے حاصل کرنے کے اصول ہیں تو اس کے خرچ کرنے کے بھی آداب ہیں، جائز ذریعہ سے کمائی ہوئی دولت بھی اسلامی احکام کے مطابق ہی خرچ ہوگی۔ محنت کی کمائی سے شراب تو نہیں خریدی جاسکتی کہ یہ سراسر تبذیر ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے۔

"لَوْ اَنْفَقَ مُدًّا فِیْ غَیْرِ حَقٍّ کَانَ مُبَذِّرًا۔ (تفسیر ابن کثیر سورۃ الاسریٰ ص:36)

یعنی ناحق ایک مد (ایک پیمانہ) خرچ کرنے والا بھی مبذر ہے۔

جس کے لئے قرانی وعید ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ط (الاسراء:27)

یعنی ناجائز جگہوں پر خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

جائز آمدنی کا جائز مقام پر حد سے بڑھا ہوا خرچ بھی اسلام کو پسند نہیں کہ یہ اسراف ہے۔ اسراف حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے۔ حضرت ایاس بن معاویہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔

مَا جَاوَزْتَ بِہٖ اَمْرَ اللّٰہِ فَھُوَ مُسْرِفٌ۔ (تفسیر ابن کثیر سورۃ الانعام ص:182)

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز کرنے والا مسرف ہے۔

یہ اکل وشرب میں بھی ہے اور دیگر اعمال وافعال میں بھی حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

إِنَّهُ نَهَى مِنَ الْإِسْرَافِ فِي كُلِّ شَيْءٍ ۔ (تفسیر ابن کثیر سورۃ الانعام ص: 182)

یعنی قرآن مجید نے ہر شے میں اسراف سے منع کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔

أَحَلَّ اللهُ الْأَكْلَ وَالشُّرْبَ مَا لَمْ يَكُنْ سَرَفاً أَوْ مَخِيلَةً۔

(تفسیر ابن کثیر سورۃ الاعراف ص: 260)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اکل وشرب کو حلال کیا ہے جب تک اس میں اسراف یا تمرّد و تکبر شامل نہ ہو۔

حضور اکرم ﷺ نے تو یہ بھی ارشاد فرمایا۔

إِنَّ مِنَ السَّرَفِ أَنْ تَأْكُلَ كُلَّ مَا اشْتَهَيْتَ ۔ (سنن ابن ماجہ کتاب الاطعمۃ)

کہ خواہش نفسانی کی تسکین کے لئے کھائے جانے کا نام اسراف ہے

مقصد یہ ہے کہ خواہشات، احکامات کی پابند ہوں تا کہ وہ اس قدر بے مہار نہ ہو جائیں کہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکے ڈالنے لگیں۔ یہاں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اسلام ہر خواہش کی نفی کرتا ہے۔ نہیں نہیں اسلام کا یہ مدعا نہیں بلکہ حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ کھاؤ، پیؤ اور پہنو کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اپنی نعمتیں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ نفی حد سے بڑھنے کی ہے۔ کیونکہ اس سے دوسروں کی دل آزادی اور اپنی خودنمائی ہوتی ہے۔ یہ ایک معاشی مسئلہ ہے۔ بے جا اخراجات، معاشرتی الجھنوں اور معاشی پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں اس لئے اعتدال ایک محفوظ طریق عمل ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ۔ (تفسیر ابن کثیر سورۃ الفرقان ص: 325)

میانہ رو کبھی محتاج نہیں ہوتا ایک دوسری روایت میں ہے۔

مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ قَصْدُهُ فِي مَعِيْشَتِهِ ۔ (تفسیر ابن کثیر سورۃ الفرقان ص: 325)

معیشت میں میانہ روی انسان کے عقلمند ہونے کی دلیل ہے۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیت میں بھی اسی توازن کا درس ہے۔ کہ اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا نہ رکھ اور نہ اُسے بالکل کھول دے کہ تو لائق ملامت اور ہارا ہوا ہو بیٹھے۔ یہ توازن زندگی کو حسین بناتا ہے کہ تصنع کا خمار اُترتا ہے۔ سادگی کا حسن نمایاں ہوتا ہے اور حسب کفایت متمتع ہونے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی ذات نہ صرف یہ کہ سرور انبیاء کی ذات تھی بلکہ ایک سلطنت کی حکمران ذات بھی تھی آپ کا حکم واجب الاتباع اور آپ کی رضا اہل ایمان کے دلوں کی پکار تھی وہ جو چاہتے جتنا چاہتے مہیا کر سکتے تھے مگر ”دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں“ چٹائی کا بستر، جسم پر کھردرے کپڑوں کے نشان، گھر میں آسائشوں کی نہ خواہش نہ ضرورت، اختیار کردہ فقر اور خود پسند کی ہوئی سادگی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیکھ لیں تو رو پڑیں کس قدر بے اعتنائی سے جواب دیا کہ میرے لئے آخرت ہے اور اُن کے لئے دینا“

(تفسیر الدر المنثور، سورۃ الدھر)

کسی نے خوب کہا تھا۔

نعلین شکستہ ہے تو بوسیدہ قبا ہے — یہ بادشاہ سلطنتِ ہر دوسرا ہے
قاسم ہے مگر ٹکڑوں پہ کرتا ہے گزارہ — سلطاں ہے مگر مجمع فقراء میں کھڑا ہے

اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں ہونا چاہیے کہ سادگی شعار نبی رحمت ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ دولت مندوں سے اہل حق کا حق صرف رحم و کرم کی اپیل سے نہیں قوت

سے لیا جاتا ہے۔ کہ یہ اسلامی حکومت کے فرائض کا حصہ ہے ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

تُوخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ فَتَرَدُّ فِیْ فُقَرَائِهِمْ (صحیح مسلم کتاب الایمان)

یعنی اُن کے امیروں سے لیا جائے گا۔ اور ان کے محتاجوں کو لوٹا دیا جائے گا

معاشی تحفظ کی فراہمی قوم کا حق اور حکومت کا فرض ہے۔ وسائل کی دریافت اور عدل کی بنیاد پر اس کی تقسیم جاری رہنا چاہیے کہ اس طرح معاشی اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جائز آمدنی، جائز جائیداد سے بھی محروم افراد کا حق لے لیا جاتا ہے تو ناجائز آمدنی سے یہ حق کیوں نہیں لیا جا سکتا۔ قومی دولت پر ہر نقب لگانے والوں پر ہاتھ ڈالنے سے کون سا قانون مانع ہے۔ ایسے دست درازوں پر ہاتھ ڈالنا جنہوں نے حدود کو پامال کیا۔ قومی خزانوں کو لوٹا اور پرتعیش زندگی کا سامان کیا۔ اسلامی مملکت کا حق بھی ہے اور حکمران کا فرض بھی، درحقیقت انسان خواہشات کے بھنور میں اسیر ہو کر محمد شاہی رنگیلے پن کا رسیا ہو جاتا ہے۔ ضرورت کے مطابق حصولِ زر انسانی معاشرت کے حسن کو قائم رکھنے کے لئے محنت اور سماجی فلاح کے لئے ایثار۔ حسن انسانی معاشرہ کا وہ جوہر ہے جو بقدر کفایت حاصل کرنے پر قائع رہنے کا نتیجہ ہے۔ کفایت شعاری، مفلسی کا نام نہیں۔ انسانی ضرورتوں کی انسانی شرف کے حوالے سے کفالت کا نام ہے۔ سادگی، بے بسی نہیں فطرت پسندی ہے، فطرت تصنع پسند نہیں کہ اس سے کردار کا دوہرا پن اور تہذیبی منافقت کا شاخسانہ پیدا ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کا ورق ورق فطرت پسندی کی شہادت اور وقارِ آدمیت کی ضمانت دیتا ہے کہ آپ کی سیرت طیبہ فلاحِ انسانیت کی ضامن بھی ہے اور عروج آدم خاکی کی نوید بھی۔

اللہ تعالیٰ نبی آفاق ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے کہ اسی میں دنیا کی کامیابی اور آخرت کی کامرانی ہے۔ آمین

احتساب کا جامع تصور تعلیمات نبوی کی روشنی میں

خالق کائنات نے وجود کی ہر اکائی کو حُسنِ تخلیق کا مظہر بنایا ہے۔ ضرورت واحتیاج کی یوں کفالت کی کہ کسی منظر سے بھی بے کیفی یا ناتمامی کا احساس نہیں ابھرتا، تہ در تہ تخلیق کے طبقات پر نظر ڈالئے تو عقل وشعور کا ایقان۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ۔ (الملک:3)

''کہ تو بے پایاں رحم کرنے والے کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہ دیکھے گا''

کی صداقت کا قائل ہو جائے گا۔ ایک قرینہ ایک ترتیب اور ایک ہمہ جہت رحمت، مسلسل دعوت فکر دے رہی ہے، جمادات، نباتات، اور حیوانات، بے لاگ اور مربوط ضابطوں کے پابند بھی ہیں اور ایک وسیع تر حصار میں آزاد بھی، ربوبیت کے ان اَن گنت مظاہر میں بوقلمونی بھی ہے اور مرکزیت بھی، کسی کو نا مسعود محدودیت کا شکوہ نہیں اور کوئی تجاوز عن الحد کی سرمستیوں لے لئے بے مہار بھی نہیں، کہا گیا کہ

"بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ"۔ (المفردات مادہ عدل)

آسمان کے محیط طبقات ہوں یا زمین کے طویل وعریض قطعات، سب عدل کے ضابطوں سے ہی قائم ہیں، وجود کا ہر پہلو قوی بھی ہے اور ہر لمحہ نشوونما کی صلاحیتوں سے بہرہ مند بھی مگر ان منہ زور قوتوں اور ان مچلتی ہوئی صلاحیتوں کو عدل نے آداب آشنا بنا رکھا ہے اسی سے نظم کائنات قائم ہے، انسانی تخلیق کا حسن بھی ہے اور ربوبیت کا جمال بھی، اس کو پیدا کر کے خالق نے ''احسن الخالقین'' ہونے کا

اعلان کیا تھا، اسی کو احسن تقویم گردانا گیا اور اسی کے سامنے ساری مخلوق کو مسخر رہنے کا پیغام دیا گیا، مسجودِ ملائکہ ہونا اسی کا شرف ہے کہ تقدس کے پیکروں کو سطوت علم کے سامنے سجدہ ریز کر دیا گیا، علم آشنائی ہے اپنی بھی اور موجود حقائق کی بھی، یہ خودنگری کی دولت بھی ہے اور عرفانِ خالق کی صلاحیت بھی، اسی علم نے انسان کو جبر سے اختیار تک کی جولاں گاہ کا راہی بنایا ہے اور اسی نے حقوق وفرائض کی پہچان کا درس دیا ہے

اسلام ایک معاشرتی دین ہے یہ افراد سے اجتماع تک پھیلا ہوا ایک مربوط نظام ہے، اس میں فرد بھی پابندِ ضوابط ہے اور اجتماع بھی، ایک متفاوت فضا کا شعور، یگانگت کے فروغ کا باعث ہے کہیں بھی ناموافق مسابقت نہیں اور کہیں بھی خودسر معاندت کا تعفن نہیں، معاشرتی قوانین بے بصارت نہیں اور اخلاقی تقاضے بے بصیرت نہیں، اس لئے خارج سے زیادہ داخل کی فعالیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

تعلیمات اسلام جو نبی رحمت ﷺ کے اسوہ و پیغام کے عملی قالب میں ظاہر ہوئیں، داخل کی اصلاح اور خارج کی تہذیب کا نظریاتی دستور ہیں، دنیا کا تاریخی تناظر واضح کرتا ہے کہ ہر تحریک جو اصلاح کے نام پر وجود میں آئی وہ یا تو شروع سے یک رخی تھی یا وحدت نے اُسے اس تنگ نائے کا اسیر بنا دیا تھا، کہیں وجود کی نفی نے فرار کی راہ دکھائی تو کہیں مادیت کی زیبائی نے جاہ پرستی اور لذت آشنائی کا خوگر بنایا، اسلام دین عدل ہے، تعلیمات نبوی ﷺ ہمہ جہت اور ہر پہلو کفالت کو محیط ہیں، اس طرز حیات میں باطن کی کارفرمائیوں کو اس قدر مضبوط کر دیا جاتا ہے کہ ہر انسان داخلی عدل کی میزان پر استقامت کا جویا رہتا ہے، محاسبہ نفس صرف ایک اصطلاح نہیں عملی کارگزاری کا گراف ہے، ایک فعال وہمہ مقتدر محاسب انسان کے اندر ڈیرے لگائے رہتا ہے۔

"اِسۡتَفۡتِ مِنۡ قَلۡبِكَ"۔ (سنن الدارمی کتاب البیوع)

اپنے دل سے فتویٰ پوچھو کا فرمان رسالت ﷺ ایک خوشنما جملہ ہی نہیں ایک دعوتِ عمل بھی ہے۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی (النجم:38)

کوئی مکلف نفس کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

کا قرآنی ارشاد معاشرتی راہنمائی کا بیّن حوالہ ہے، نفس مکلف ہے اُسے دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھانا اپنا تو اٹھانا ہے اس سے دوہری ہدایت ملی ایک یہ کہ اپنے اعمال کا ملبہ خود عمل کرنے والے کو ہی اٹھانا ہے اس لئے ہر عمل پر کڑا پیرہ چاہیے یہ اطمینان بھی رہے کہ کسی دوسرے کے عمل کا بوجھ نہیں ہوگا دوسرے یہ کہ اپنے اعمال کو کسی دوسرے کی میزان میں نہیں ڈال سکو گے اس لئے ہر عمل کامل احتیاط اور مکمل ہوشمندی کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ اسلام کا داخلی نظامِ احتساب ہے ہر عمل ہر فعل بلکہ ہر مفاد، انسان کے داخل کو تحریک دیتا ہے کہ وہ اس کو بجالانے سے پہلے اس سوال کا جواب ضرور مانگے کہ کیا یہ اُس کے دائرہ حسنات میں آئے گا یا نہیں اس لئے وہ خواہشات کی دلدل میں اُترنے سے رُک جائے کہ اس میں ہی عافیت ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنے جان نثاروں کی تربیت اس نہج پر کی تھی کہ جذبات کا کھچاؤ اور چاہت کا گرداب اُنہیں متزلزل نہ کر سکا، صلح حدیبیہ میں یہ شرط کہ جو مکہ مکرمہ سے بھاگ کر آئے گا واپس کر دیں گے اور جو مدینہ منورہ سے جائے گا اُس کو واپس کرنے پر اصرار نہ کریں گے۔ تعلیمات نبوی ﷺ کے بے لاگ نفاذ کی ترجمان ہے اپنا تو جہاں بھی ہو اپنا ہی ہے، مکہ مکرمہ کی معاند فضا اُس پختہ یقین کو لرزا نہ سکے گی کہ ان جاں سپاروں کا داخل اس قدر بیدار کر دیا گیا ہے کہ خارج کی کوئی گھٹا اس کو

دھندلا نہ سکے گی ، احتساب کی اصل روح یہی ہے کہ دل مرکزِ انوار ہو جائے تا کہ تاریکیاں شب خوں نہ مار سکیں ، تعلیماتِ رسول ﷺ کا اصل ہدف یہی ہے ، صوفیاء جسم کو سواری کہتے ہیں اور روح کو سوار ، سواری کی دیکھ بھال لازم ہے مگر توجہ کا اصلی مرکز سوار ہے ، انسانی ضمیر ہی راکب ہے یہ مر گیا تو مرکب کو ہزار عمل مومیائی سے گزارا جائے حیات کی امید عبث ہے۔

اسلام اس حقیقت کو ہر لمحہ سامنے رکھنے کے باوجود زمینی حقائق سے غافل نہیں ، نفس امارہ کی بے ترتیبیاں بھی توجہ طلب ہیں تا کہ داخلی احتساب کی گرفت رہے اور بے اعتدالی ، معاشرتی اضطراب کا باعث نہ بنے ۔ تعلیمات نبوی ﷺ کا یہ معاشرتی پہلو ہے جو ضابطوں کے حصار میں ہے ، گناہ کے وجود سے انکار نہیں مگر گناہ کو سرفرازی حاصل نہیں ہونی چاہیے ، بدی ، پردوں میں پنپ رہی ہے تو بھی قابل گرفت ہے مگر بدی کو چوراہوں اور میدانوں میں عریاں ہو کر رقص کی اجازت تو نہ ملنی چاہیے یہی وہ لمحہ ہے جہاں معاشرتی قوانین اور ریاستی فرامین کی ضرورت ہوتی ہے ، '' تَقَلُّبُ فِی الْبِلَاد '' اشاعتِ شرک کا محرک بننے لگے تو اس کی راہ روکنا صالح معاشرے اور عادل حکومت کا فرض ہوتا ہے حضور اکرم ﷺ نے منصب کی تفویض اور اختیار کے استعمال کو حدود آشنا بنایا ، مفادات کی چکا چوند کو نیکیوں کی برکات اور عدل واحسان کی حسنات سے پسپا ہونے پر مجبور کیا معاشرتی آسانیاں پیدا کرو ، گھٹن کا ماحول طاری نہ کرو ، محبت وانس کی فضاء قائم کرو ، نفرتوں کے بیج نہ بوؤ مگر جب ان احکام سے روگردانی ہوئی اور خواہش وہوس نے صاحبِ اقتدار افراد کو زیر کر لیا تو بھر پور محاسبہ فرمایا۔ ایک عاملِ خراج جب دربار رسالت میں حصیلات زر

کے ساتھ حاضر ہوئے تو دو ڈھیر لگائے ، کہا یہ قوم کا حصہ ہے کہ حدود شرعی کے مطابق وصول کیا گیا ہے اور یہ اُس کا اپنا ہے کہ لوگوں نے اس حاکم خراج کو تحائف کی شکل میں دیا ہے اس پر عدل پرور نبی رحمت ﷺ کا ردعمل اس قدر شدید تھا کہ یہ مزاج کے عمومی رویوں سے ہٹ کر تھا ، فرمایا ، لوگوں کو منصب دیا جاتا ہے ، وہ واپس آتے ہیں اور کہتے ہیں یہ آپ کے لئے ہے اور یہ میرے تحائف ہیں ، فرمایا اپنے ماں باپ کے گھر ہی کیوں نہیں بیٹھے رہتے ، پھر دیکھیں کس قدر تحائف آتے ہیں واضح کر دیا گیا کہ منصب پر فائز منصب دار ریاست کا نمائندہ ہوتا ہے اس حوالے سے جو بھی حاصل ہو وہ قوم وریاست کا حق ہے کہ یہی وہ چور دروازہ ہے جس سے مفادات کی چلتر نگ نمو پاتی ہے اور یہی وہ خود فریبی ہے جو گناہ سے بھی بدتر ہے ۔ حضور اکرم ﷺ نے برسراقتدار افراد ہی کو اس احتساب کا پابند نہیں بنایا مالیات کے تمام شعبوں پر کڑی نگرانی کا مربوط نظام بھی وضع فرمایا اہلیت کی بنیاد پر منصب کی تفویض ، واجبات کی وصولی میں عدل کی حکمرانی کی حتمیت ، تقسیم میں توازن اور ضرورت کا احساس احتساب کی جامعیت اور محاسبہ کا بے لاگ حکیمانہ نفاذ ، عوام کی جائز خواہشات کا احترام اور شکایات کا ازالہ۔

اسلام میں کوئی حکم بلا مقصد نہیں دیا گیا ، خالق کی رضا اور مخلوق کی فلاح ہر وقت مقصودِ نظر ہے احتساب کا پورا عمل اور اس کا دائرہ کار معاشرتی صلاح کے لئے ہے یہ حدود آشنا ہے کہ نیکیوں کے فروغ کا عمل ہے اس کے ڈانڈے کبھی بھی انتقام سے نہیں ملتے کہ اگر یہ انتقام بن جائے تو اپنے اہداف سے بھٹک جائے گا بلکہ دوسرے احتساب کا متقاضی ہوگا اس طرح احتساب بذات خود مقصود بن جائے گا اور اس سے مطلوب اہداف حاصل نہ ہو سکیں گے ، ذاتی اغراض گروہی تعصب ، دنیاوی اقتدار یا

جذبات کی تسکین کی بے پناہ خواہش اس بظاہر خیر سے شر کشید کرے گی، حضور اکرم ﷺ جب تبوک تشریف لے گئے تو وہاں کے باسیوں نے شکوہ کیا کہ اُن پر جو لگان لگایا گیا ہے وہ استطاعت سے بڑھ کر ہے، حضور اکرم ﷺ نے دوبارہ اپنی نگرانی میں تخمینہ لگوایا، شکایت درست ثابت ہوئی تو دس وسق کے حساب سے واپسی کا حکم دیا گیا، اس پر نہ لوگوں نے تخمینہ کار پر پھبتی کسی اور نہ کوئی شکوہ کیا، اس سے معلوم ہوا کہ احتساب کے عمل میں نیک نیتی شرط ہے اور یہ کہ منصب دار کی بدنیتی ثابت نہ ہو تو معزولی ہوتی ہے اور نہ تضحیک، یہی توازن حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات کا امتیازی وصف ہے تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں احتساب کا جامع نظام یوں ترتیب پاتا ہے۔

1 احتساب ہمہ گیر ہو کہ کسی شعبہ ریاست کو استثنیٰ حاصل نہ ہو

2 احتساب بے لاگ ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہی مقصود ہو؟ یہ کسی گروہی تعصب یا وقتی مصلحت کی بنا پر نہ ہو۔

3 احتساب کسی صورت انتقام نہ بنے کہ انتقامی جذبے بذات خود احتساب کے متقاضی ہوتے ہیں۔

4 احتساب کا عمل شفاف ہو کہ جس کا احتساب ہو رہا ہو اُس کو بھی احتسابی عمل کی غیر جانبداری کا یقین ہو اور اُسے دفاع ذات کا ہر موقع فراہم کیا جائے

5 احتساب شک وریب کی بنیاد پر نہ ہو، اس کا ہر عمل یقین کے ساتھ روبہ عمل آئے

6 احتساب کے نتیجہ میں سزا حدود آشنا ہے کہ ازالہء گناہ مطلوب ہے، گناہ کا ارتکاب نہیں۔

7 احتساب پر متعین اہل کار بے داغ شخصیت کا مالک ہو ورنہ گناہ کی پاداش میں گناہوں کا اجراء ہوتا رہے گا۔

8 احتساب کا عمل برملا اور واشگاف ہونا چاہیے تاکہ پسند وناپسند کا گرداب شبہات کو جنم نہ دے۔

9 احتساب میں گناہ کے ورے نیات کا اندازہ لگانا چاہیے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

10 احتساب کا عمل مکمل ہونے تک کردار کشی نہ ہونی چاہیے کہ گناہ ثابت نہیں ہوا، گناہ ثابت ہونے پر قانون کا عمل جاری ہو مگر شخصیت پر بے جا داغ نہ لگے کہ عدل بہرحال ضروری ہے۔

11 احتساب کا مقصود ریاستی استحکام، ملکی مفاد اور معاشرتی اصلاح ہو، قومی دولت کا تحفظ ہتھیائی ہوئی دولت کی بازیابی اور آئندہ ایسے عمل سے اجتناب کی تحریک ہو۔

اللہ تعالیٰ ہر عمل میں اخلاص ہر پیش قدمی میں استقامت اور ہر رویے میں توازن کی توفیق عطاء فرمائے آمین

نئے عالمی نظام کی تشکیل اور امتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں

سیرت طیبہ کی روشنی میں

حضور اکرم ﷺ کی سیرت، اُسوہ حسنہ بھی ہے اور نوع انسانی کے لئے فلاح کی ضمانت بھی، یہی اندازِ حیات، انسانیت کی بقا کا محافظ، عظمتِ بشر کا نگران اور حسناتِ دنیا و آخرت کا کفیل ہے، آپ کے تعلقات کا پیمانہ ذاتی یا گروہی حصار کے حوالے سے نہیں وحدتِ نسل انسانی کے حوالے سے متعین ہوتا ہے کہ اخوت و رواداری، موانست و برداشت کے جذبے فروغ پاتے ہیں۔ نیک جذبات اور مناسب کشادگی کی افزائش ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی آمد سے قبل اولادِ آدم، طبقاتی کشمکش اور نسلی عدم برداشت کا شکار تھی، آج بھی دنیا اسی حرص و آز کی راہ پر بے لگام دوڑے جا رہی ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ھل من مزید کی جہنمی پکار صاف سنائی دے رہی ہے۔ اپنی قوت کا گھمنڈ ہر قسم کے جبر پر اکسا رہا ہے اور دوسروں کو برداشت کرنے کی اعلیٰ انسانی روایت مفقود ہوتی جا رہی ہے آج کا انسان اُسی طرح اضطراب میں ہے جیسے آج سے چودہ صدیاں پہلے تھا۔ انسان پھر اُسی دور ھایوں کے لئے بے چین ہے جس میں انسانی عزت و وقار، جان و مال اور شرف و عظمت کی ضمانت مل سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کئی چارٹر تیار ہوئے کئی پیمان باندھے گئے مگر یہ سب ریت کی دیوار ثابت ہوئے کہ طاقت آج بھی سکہ رائج الوقت ہے۔ معالجین نسخہ ہائے شفا کے آوازے لگا رہے ہیں مگر یہ سب معالج عطائیوں کی طرح مزید گرفتار

بلا کر رہے ہیں حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے تو برملا اعتراف کیا تھا کہ۔

دست ہر نااہل بیمارت کند

سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

آیئے ایک نظر رسول اکرم ﷺ کے نسخہ شفا پر بھی ڈالیں اور آپ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں درد کا مداوا تلاش کریں۔ نبی اکرم ﷺ نے اصلاح کا عمل داخل سے شروع کیا اور انسانی شرف کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی تعلیمات کی اساس، عقل و شعور کے انسانی رویوں کو بنایا، نظریہ حیات طاقت سے نہیں منوائے جاتے کہ یہ بہیمانہ طرزِ عمل ہے۔ قوت و طاقت کا اندھا پن، یقین کی بے ثباتی، اور ایمان کی بے کیفی کا مظہر ہوتا ہے۔ نبی رحمت ﷺ نے کسی حال میں بھی جبر و استبداد کا سہارا نہیں لیا۔ مخالفت کو رام کرنے کے لئے کبھی تشدد نہیں اپنایا۔ آپ نے مخالفت کا جواب حلم و بردباری، جاہلانہ انا کا جواب بے نفسی و متانت اور ظلم و جور کا جواب بے پناہ حوصلے سے دیا۔ مکہ مکرمہ کی سرزمین پر ظلم کا ہر حربہ آزمایا گیا۔ گزرگاہوں کو خوں آشام بنا دیا گیا۔ راستوں کو آزارِ بے درماں کے کانٹوں سے بھر دیا گیا۔ نہ عظمتِ آدمیت کا لحاظ رہا نہ ہم نسبی کا پاس رہا۔ مگر نبی آفاق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان رویوں کو جہالت، عدم برداشت اور بے جا انانیت کا مظہر گردانتے ہوئے رد کر دیا۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ ظلم کا بدلہ ظلم سے نہیں۔ ظلم کے ہاتھ روک کر لیتا ہوں۔

ابوجندل کا خون آلود جسم پکار رہا تھا کہ جذبات برافروختہ ہو جائیں مگر معاہدوں کی پاسداری کرنے والے نبی اعظم ﷺ مصلحتی فیصلوں کے قائل نہ تھے۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ حدود آشنائی بین الاقوامی تعلقات کی اساس ہے۔ مومن اپنے قول و فعل پر ضبط و اعتدال کا پہرہ بٹھاتا ہے وہ اختلاف تو کر سکتا ہے

عداوت نہیں۔ وہ اختلاف کیا ہوا جو گردن مارنے کی تحریک دے۔ یہ تو بے حوصلگی ہوئی۔ سیرت طیبہ کا تقاضا ہے کہ مومن برداشت کا وہ جمال بنے کہ اسی جمال سے انسانی معاشرہ خوشگوار اور پربہار ہوتا ہے۔

نئے عالمی نظام کی تشکیل میں جب تک سیرت طیبہ کی پیروی کا دعوی کرنے والی ملت، سیرت کے اُن گوشوں کو اپنانے کی کوشش نہ کرے گی جن کی ترسیخ سے عہدِ رسالت میں نظامِ امن کی تشکیل ہوئی تھی تو مطلوبہ مقاصد حاصل نہ ہوسکیں گے۔ اسلام کی ابھرتی ہوئی تحریک کے سامنے باطل کی جھنجھلاہٹ کے تناظر میں وہ رویہ دیکھئے جو طاقت رکھنے کے باوجود اپنایا گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ کی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی تو اپنوں سے موانست کے جذبات کو فروغ دینے کے لئے مواخات، کا سنہری اصول اپنایا اور غیروں کو حدود آشنا بنانے کے لئے میثاق مدینہ کی شرائط نافذ کئیں، لِلْيَهُودِ دِيْنُهُم (یہود کے لئے اُن کا دین ہے) کا جملہ اشتراک باہمی کے ہزارہا اصولوں پر بھاری رہا۔ سوچئے اس قدر آزادی کون عطا کرسکتا ہے۔ دورِ حاضر گواہ ہے کہ ایسا حوصلہ بڑے بڑے سربراہان سلطنت کو بھی نصیب نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ غیروں کو امن وسکون کی ضمانت صرف وہ دے سکتا ہے جو دوسروں کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ عقیدہ مضبوط ہو، نظریات حیات کے حوالے سے ایمان کی دولت نصیب ہو تو دوسروں کے ساتھ نباہ میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

غور کا مقام ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب قومی وملی تحفظ کی بات کی تو خطاب ''ایھا الناس'' سے شروع ہوا اور رب واحد کا حوالہ دیا یہی بین الاقوامی تعلقات اور انسانی معاشرت کی بنیاد ہے اسلام کے نزدیک یہ سرزمین سب کا گھر ہے۔ سب کے لئے قرارگاہ ہے اور سب کے لئے ذریعہ زیست، سیرتِ طیبہ گواہ ہے کہ اسلام

ایک انسان بلکہ ایک حیوان سے بھی حق سکونت اور حق معیشت نہیں چھینتا۔ یہ دنیا ایک مثالی نظم حکومت تشکیل دینے میں اُس وقت کامیاب ہوگی جب سرکار دوجہاں ﷺ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں اولادِ آدم ہونے پر فخر اور ایک خالق کی مخلوق ہونے پر ناز پیدا ہوگا۔

وطنِ عزیز پاکستان ملّی امنگوں کا مظہر ایک ایسا عافیت کدہ ہے جس کے لئے مسلمانان برصغیر نے طویل جدوجہد کی اور بے شمار قربانیاں دیں۔ اس لئے یہ مملکت خداداد کو محبت نگر اور مسکن اخوت ہونا چاہیے اس ساحل مراد کو ایسا گلشن بنانا ہے جہاں محبت کے زمزمے پھوٹیں اتحاد ویگانگت کے نغمے گونجیں، یہ آزاد فضا اس لئے تلاش کی گئی تھی کہ آزادی کے ماحول میں جینے والوں کو انسانی شرف کی عظمت کا احساس ہو اس لئے کہ کھلی فضا میں سانس لینے والوں کو دوسروں کی سانسیں روکنے کا شوق نہیں ہوتا، تحریکِ پاکستان کی گہما گہمی میں ہم نے کئی وعدے کئے تھے۔

نئے عالمی نظام کی تشکیل کی خواہش پچھلی صدی سے ہی انسانی ذہن کو مرعوب کرنے لگی تھی۔ عالم انسانیت نے کئی انقلاب بھی دیکھے۔ صنعتی انقلاب ایک مثبت پیش رفت کا غماز تھا۔ انسان مظاہر پر حکمران بننے کی تگ ودو میں شریک ہوا تھا۔ اس کے اثرات مادی ترقی، معاشرتی آسائش کی صورت میں نمودار بھی ہوئے مگر بدقسمتی سے زبردستوں کی سطوت نے زبردستوں کو مظلوم تر بنادیا، سماجی انصاف کے نام پر انقلاب برپا ہوا انسانیت کا چہرہ اور بھیانک ہوگیا۔ مساوات نسل انسانی کے نام پر اور فرد ومعاشرہ کی اصلاح کے حوالے سے کئی چارٹر تیار ہوئے۔ جمہور کی طاقت کا راگ الایا جاتا رہا مگر جمہور کی بے بسی کا اہتمام ہوتا گیا۔ ایسے عالم میں امت مسلمہ کی

ذمہ داری ہے کہ وہ اُس نسخہ شفا کو بروئے کار لائے جس سے انسان کے دکھوں کا مداوا ہو۔ سیرت طیبہ کی روشنی ہمارے لئے نور کا مینار ہے اور سیرت کی معطر فضا آج بھی ہمارے مشامِ جاں کے لئے عطر بیز ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں امت مسلمہ کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے کیا کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں چند بنیادی نقاط توجہ طلب ہیں۔

1۔ امت مسلمہ کے تمام طبقوں میں اتحاد و ہم آہنگی کی وہ فضا پیدا ہونا ضروری ہے جس کا درس مدینہ منورہ کی پہلی اسلامی ریاست کی تشکیل کے وقت دیا گیا تھا تاکہ اخوت کو فروغ حاصل ہو اس کے لئے علاقائی تعصبات سے چھٹکارا پایا جائے اور اتحاد کی اساس، نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ انور کو بنایا جائے۔ ایمانی حوالوں میں وحدت، رب واحد پر ایمان کا ثمر ہوگی اور نسل وزبان پر فخر کو ایک باپ کی بنیاد پر رد کیا جائے گا۔ ذرا سوچیے، لوگ باپ، دادا پر فخر کرتے ہیں اور ان کے حوالے اپنی شناخت کراتے ہیں، یہ شناخت اگر معتبر ہے تو ساری انسانیت کے باپ کا حوالہ کیوں نہ معتبر قرار پائے۔ یہ اعلان انسانیت کا چارٹر اور بین الاقوامی معاشرت کی خشت اول ہے۔ اتحاد کو مضبوط تر بنانے کے لئے باہمی رابطے لازم ہیں تاکہ غیریت، اپنائیت کا روپ لے لے۔

2۔ علم مومن کی میراث ہے کہ علماء ہی وارثِ انبیاء قرار دیئے گئے ہیں۔ دین ہمہ علم ہے۔ دینی تعلیمات ہمہ عقل ہیں اس لئے بے علمی دین نہیں اور بے عقلی کا دین سے کوئی تعلق نہیں، علم کی تلاش، مسلمان امت کی شناخت اور اسلامی معاشرے کا مطلوب ہے، یاد رہے کہ تعلیمات اسلام میں علم زیور نہیں، فرض ہے، یہ چند لوگوں

کے لئے وجہ شرف نہیں بلکہ پوری امت کا نشان ہے، علم کا حصول فرض ہے تو علم کا پھیلانا بھی لازم ہے، یہ مومنانہ جذبوں کے ساتھ ایمانداری سے حاصل کیا جاتا ہے اور پوری دیانتداری سے امانت سمجھ کر قوم تک پہنچایا جاتا ہے، امت مسلمہ کو علمی پس ماندگی سے ایسے ہی نکلنا ہوگا جیسے عرب کا معاشرہ ہدایات نبوی کی روشنی میں جہالت کی تاریکی سے نکلا تھا خوب یاد رہنا چاہیے کہ حالتِ جنگ میں ہونے کے باوجود مسند علم بچھادی گئی اور مکہ مکرمہ کے اسیروں سے فروغِ علم کا کام لے لیا گیا تھا، نہ عمارتوں کی تیاری سد راہ ہوئی تھی اور نہ عقیدوں کی غیریت نے راہ کاٹی تھی، علم مومن کی میراث ہے اس لئے اس کو جہاں سے ممکن ہو حاصل کر لینا ضروری ہے یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ علم میں بلند مقامی ہی انسانی شرف کی اساس ہے۔ دینی علوم، نصاب انسانیت ہیں ان کا حصول لازم ہے کہ ان کے بغیر بہتر انسان تشکیل نہیں پاتے مگر یہ علوم، دیگر علوم کی راہ میں رکاوٹ نہیں، معاون ہیں اس لئے جدید علوم کی تدریس کے بغیر جہانگیری وجہانبانی کا تصور خام خیالی ہے۔ پوری امت اسلامیہ کو اپنے وسائل مجتمع کر کے علم کی بارگاہ میں نیاز مندانہ حاضر ہونا چاہیے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ سائنسی وتکنیکی علوم کے لئے محنت کی جائے۔ ایک مربوط تعلیمی نظام جوامت مسلمہ کے ہر گروہ کی کفالت کرے وقت کی آواز ہے، اسی کے ذریعے نئے نظام کی تشکیل میں ہم فعال کردار انجام دے سکیں گے۔ یہ دینی فریضہ ہے اور یہی وقت کی پکار ہے۔

3۔ نئے نظام کی تشکیل میں امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک معاشی قوت کے ساتھ شریک ہو، ارشاد نبوی ہے کہ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، قرض، مراعات، امداد کی ہر صورت قومی احتیاج کی دلیل ہوتی ہے اور پستیوں کا اعلان بنتی ہے۔ خوش قسمتی سے امت مسلمہ بہت سے وسائل سے بہرہ مند ہے مگر باہمی

عدم تعاون اور شخصی انا کا عفریت، جسدِ ملت کو زہر آلود کر رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت کی دولت پر دوسروں کا قبضہ ہے، شاعر اسی بدترتیبی پر چیخا تھا کہ

مَا بَالُهُ مِنْ قُطْنِهِ عُرْيَانَا

مَا بَالُهُ مِنْ قَمْحِهِ جُوْعَانَا

یعنی اُسے کیا ہوا ہے کہ اپنی روئی کے باوجود ننگا ہے اور اُسے کیا ہوا ہے کہ وہ اپنی گندم کے باوجود بھوکا ہے۔ استیصال محنت کی یہ تمام شکلیں غلامی کی شروعات ہوتی ہیں، ان سے بچنے کے لئے مجموعی کاوش کی ضرورت ہے۔ سیرتِ طیبہ کے اوراقِ زریں گواہ ہیں کہ معاشی بدحالی کا شکار قوم چند سالوں میں معاشی قوت کا نشان بن گئی اسی لئے کہ معاشی اصولوں کو رب کائنات کے احکام کا پابند کر دیا گیا جس سے ایک ایسا انقلاب رونما ہوا جو معاشی تحفظ کی ضمانت بنا۔

4۔ امت مسلمہ پر مشتمل تمام ممالک کو اپنے سیاسی فیصلوں میں یک آواز ہونے کی ضرورت ہے اس کے لئے او آئی سی یا اس قبیل کی کوئی بین الملی انجمن تشکیل پانا چاہیے، حالات اس نہج پر آ گئے ہیں کہ ایسی صورت گری ممکن ہو سکے۔ یورپی ممالک قرب کی راہیں تلاش کر رہے ہیں تو مسلمان ممالک کو بھی ایسا سوچنا چاہیے۔

5۔ عصرِ حاضر میں تعلقات کا قرب معاشی یگانگت پر انحصار کرتا ہے اس لئے ایسا بینکنگ سسٹم وضع کر لینا چاہیے جو امت کے پس ماندہ طبقوں کی اعانت کرے تاکہ اُس فرمان نبوی پر عمل ہو سکے کہ امیروں سے حاصل کیا جائے اور غریبوں کو لوٹایا جائے، اس لئے بھی کہ دولت ایک جگہ مرتکز نہ ہو جائے کہ اس سے معاشی یرقان پیدا ہوتا ہے، یہ قرب مسلسل ہو جائے تو وہ منزل بھی آ جائے گی جب مسلم ممالک کرنسی میں یکجائی کا سوچ سکیں گے۔

6۔ امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اُس سیاہ گوشوں کے خلاف جہاد کرے جو اُس کی امن پسندانہ روش کو داغدار کر رہے ہیں اسلام دینِ امن وسلامتی ہے کہ اس کی اساس ہی امن پر ہے، ایمان میں امن، اسلام میں سلامتی تو اساسی طور پر موجود ہیں پھر یہ الامین یعنی امن دہندہ نبی کا لایا ہوا دین ہے اور یہ بلد امین یعنی امن والے شہر میں اولین مرکز کے طور پر نافذ کیا گیا ہے۔ دنیا کو یہ پوری قوت سے باور کرانا چاہیے کہ یہ دین ہمہ امن وسلامتی ہے اس لئے کسی تخریب کاری یا دہشت گردی سے اس کا کوئی تعلق نہیں، بدقسمتی سے یہ تاثر قائم کرنے میں بہت سے ادارے شریک ہیں، اس لئے مدافعت کے لئے اور حقیقت واشگاف کرنے کے لئے مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔

الغرض امت مسلمہ کو اگر آنے والے دور میں فعّال کردار ادا کرنا ہے اور دنیا میں برپا ہونے والے نئے نظام میں آبرومندانہ مقام حاصل کرنا ہے تو اُسے سیرت طیبہ کی روشنی میں اتحاد، یگانگت اور اخوت کے جذبات کو فروغ دینا ہوگا، تدریسی اداروں کا وقار بحال کرنا ہوگا۔ تربیت یافتہ اساتذہ کی کھیپ تیار کرنا ہوگی طلبہ کو بھٹکنے سے بچا کر بارگاہِ علم میں مودّبانہ لانا ہوگا۔ دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کو اپنانا ہوگا۔ معاشی بدحالی سے چھٹکارا پانے کے لئے مشترکہ سعی کرنا ہوگی اور ایک امن پسند قوم کے طور پر بین الاقوامی سطح پر اپنے آپ کو منوانا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ رب رحیم وکریم امت مسلمہ کو سیرت طیبہ کی نورانیت سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

رسول اکرم ﷺ کا نظامِ معیشت

نبی رحمت ﷺ نے انسانی فلاح، معاشرتی استحکام، سماجی بہبود اور معاشی آسودگی کے ایسے ضابطے اور راہنما اصول متعین فرمائے ہیں کہ ان کے نفاذ و اجراء سے انسانی معاشرہ شرفِ آدمیت کے تحفظ اور احسنِ تقویم ہونے کے مرتبہ کو پالیتا ہے۔ اور اگر ان اصولوں سے صرفِ نظر کیا جائے یا انحراف کی جسارت کی جائے تو حسنِ معاشرت ہی نہیں شرفِ انسانی بھی اسفل السافلین کے انحطاط کی طرف اترنے لگتا ہے۔ کامرانیوں کا ایک ہی جادۂ مستقیم ہے جو سیرتِ رسول ﷺ کی پناہ میں ہے اور یہ سیرت ساری نسل آدم کے لئے مقامِ عافیت بھی ہے اور اسوۂ حسنہ بھی، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب 21)

بیشک رسول اکرم ﷺ کے وجود میں تمہارے لئے اُسوۂ حسنہ موجود ہے۔

ایک پہلو یا خاص رُخ کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ عمومیت اور ہمہ گیریت کی خبر دیتا ہے کہ رسول ﷺ کا وجود تم سب کے لئے ہر دور میں اور ہر حال میں راہنمائی کا احسن معیار اور پیروی کا نمونہ کامل ہے فی رسول اللہ کہہ کر واضح کر دیا گیا کہ انسان کو جب بھی کسی معاشرتی، معاشی، تہذیبی فکری، نظریاتی یا عملی راہنمائی درکار ہوگی تو جامع صفات اور مربوط تر سیرت ایک ہی ہوگی جو عقدہ کشائی کرے گی اور یہ بھی کہ ذاتِ نبوت حل ہی پیش نہ کرے گی بہتر اور احسن حل پیش کرے گی، اب محفوظ ترین

راہنمائی موجود ہو اور ہر لحہ دستگیری کی صلاحیت بھی ہو، مرکزیت کا شہکار بھی ہو اور یہ کہ اس سے بہتر راہنمائی ممکن بھی نہ ہو تو در بدری کیوں؟ انسان رسوائیوں سے نجات چاہے یا آسودگیوں کی تمنا رکھے، تحفظ ذات کا مرحلہ ہو یا تعمیر سیرت کا، باہمی تعلقات کا گھمبیر پن ہو یا اجتماعی کفالت کا، کیوں نہ ذہن کو یکسوئی اور عمل کو یکسانی مہیا کی جائے، معاشی مسائل، معاشرتی اضطراب کا سب سے قوی محرک ہوتے ہیں، ان کو پابند آداب نہ بنایا جائے تو معاشرتی بہبود کے سب منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں، حضور اکرم ﷺ نے تو احتیاج کو کفر کے قریب قرار دیا تھا اس لئے آپ نے اس اساسی مسئلہ پر بھرپور توجہ دی تا کہ خواہش نفس بے لگام نہ ہو جائے اور معاشرتی رعنائیوں کو پامال نہ کر دے۔

حضور اکرم ﷺ کا لایا ہوا پیغامِ حیات جامع بھی ہے اور بے لاگ بھی، اس میں نہ محدودیت ہے اور پسند و ناپسند کا استثنیٰ، اس لئے کہ یہ دینِ فطرت کا پیغام ہے اور فطرت اپنے مظاہر میں کسی حد بندی یا مصلحت کا شکار نہیں ہوتی، اسلامی تعلیمات کا مقصود مادی خوشحالی و معاشرتی بہبود بھی ہے اور روحانی آسودگی و ذہنی بالیدگی بھی، انسانی معاشرت کا بغور جائزہ لیا جائے تو مختلف اور متنوع اہداف کے ورے یہی مقاصد نمایاں نظر آتے ہیں، کہیں مال و زر کی ہوس کا سکہ جاری ہے تو کہیں اپنے اندر کے انسان اور اُس کی صلاحیتوں کے احیاء کی کوششیں ہیں۔ ان حوالوں سے ہی تہذیبیں اپنا رُخِ کردار متعین کرتی ہیں یعنی مادی تہذیب اور روحانی تہذیب، اسلام اس ثنویت کا قائل نہیں، وہ ان کی یکجائی چاہتا ہے اسی لئے داخل و خارج میں ہم آہنگی معاش و معاد میں آشتی اور مادہ و روح میں توازن اسلام کا امتیازی وصف ہے اسلام

انسان کے اندر موجود اخلاقی وروحانی جذبوں کی تسکین کے ساتھ اُس میں موجود حیوانی تقاضوں اور مادی احتیاج کو بھی ضروری تحفظ دیتا ہے۔ چونکہ مقصود ارفع و اعلیٰ ہے اس لئے ان تقاضوں اور ضرورتوں کو اخلاق عالیہ کا سایہ عطا کیا گیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بسا اوقات معاش کے دباؤ کے تحت اپنا شرف بھول جاتا ہے خواہشِ شکم کبھی اس قدر منہ زور ہو جاتی ہے کہ حیوانات کی سطح پر لے جاتی ہے۔ یہ قوتوں کا اندھا پن ہے، اُسے زندہ رہنا ہے اور زندہ رہنے کے لئے بھوک پیاس لگتی ہے، اسلام زندگی کا کارواں روکنا نہیں چاہتا بلکہ وہ اپنی تعلیمات کو یوں ترتیب دیتا ہے کہ وہ انسان کے لئے حیات بخش قرار پاتی ہیں، تسلسلِ حیات کے لئے تمام سہولتوں کی فراہمی اسلام کا ہدف ہے۔

مگر سمجھا دیا گیا کہ اسلامی نظامِ معیشت میں مادی آسودگیوں کو اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھتے ہوئے حاصل کرو کہ اس سوچ سے مادی آسائشوں میں روحانی تسکین کا سامان ہوتا ہے۔ مادی احتیاج کو روح کی تسکین کا حوالہ دے کر اسلامی نظام معیشت کی بنیاد واضح کر دی گئی، نامقبول تصادم سے بچاؤ کے لئے کچھ ضابطے مقرر کئے گئے اس سلسلے میں ایک اساسی قانون بیان فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے وقت ہی فیصلہ فرما دیا تھا۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الزخرف 32)

کہ ہم نے دنیا کی زندگی معاشی سہولتوں کو ان میں تقسیم کر دیا ہے۔

تاکہ یہ سب کے لئے ہوں اور کوئی ہوس کا بندہ ان پر ذاتی قبضہ کی کوشش نہ کرے، یہ بھی انتباہ فرما دیا کہ اگر ایسا نہ ہوا اور معاشرہ معاشی عدم توازن کا شکار ہو گیا

جس کے نتیجے میں معاشی وسائل چند ہاتھوں میں مرتکز ہو گئے اور افراطِ زر کا اندھا عفریت معاشرے میں دندنانے لگا تو ایسے معاشرے اور ایسی بستیاں قہرِ الٰہی کی سزا پاتی ہیں اور قانون فطرت کا توازن اپنا رنگ دکھاتا ہے۔

یہاں ایک سوال ابھرتا ہے کہ دولت کی فراوانی تو استحکام کا باعث ہوتی ہے، دولت مند ملک یا افراد تو معاشی فارغ البالی کی بنا پر شاہراہ ترقی کی طرف بہتر طریق اور قابلِ اعتماد انداز سے بڑھ سکتے ہیں پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید ایسی فارغ البال قوموں کی تباہی کے واقعات دوہرا رہا ہے؟ غور کیا جائے تو اُن کی خوشحالی کے تذکرے کے ساتھ ہی جواب دے دیا گیا، قرآنی نظام حیات اور نبوی فرامین کے مطابق انسانیت کی آسودہ حالی صرف معاشی خوش حالی پر مبنی نہیں ہے، یہ تو ایک ریت کی دیوار ہے جس کو استحکام اخلاقی قوتوں نے عطا کرنا ہے جب بھی ان میں قوت اخلاق کی نفی ہو گی یہ تعمیر زمیں بوس ہو جائے گی، دل بیٹھ جائے تو مضبوط سے مضبوط جسم بھی تھرتھرانے لگتا ہے اور وجود پر بوجھ بن جاتا ہے، اسی طرح معاشی پختگی اخلاقی قوت پر منحصر ہے، قومیں جب دولت کی چمک دمک سے اس قدر چندھیا جاتی ہیں کہ انہیں بنیادی ضابطے بھی نظر نہیں آتے تو اُن کی ترقی کے راستے جلد ہی مسدود ہو جاتے ہیں اور وہ چند ساعتوں میں ہی کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر آ گرتی ہیں، معاشرت کو اخلاق آشنا نہ کیا جائے تو یہ خوشحالی نہیں بدحالی ہے، حضور اکرم ﷺ نے تقسیم دولت کا وہ نظام جاری فرمایا جس میں قوی معیشت قانون کی ہی پابند نہ ہوئی بلکہ اخلاقی تقاضوں کی بھی پابند ہو گئی، معاشی مسائل میں تقویٰ کو مدارِ عمل بنایا گیا جس سے شجرِ حسنات کی آبیاری ہوئی۔

حضور اکرم ﷺ کے نظامِ معیشت کی خشتِ اول اسی تقویٰ پر استوار ہوئی تا کہ اجر کا مطالبہ کرنے والوں کو اجرِ آخرت کا تصور راستی کا درس دیتا ہے، اس نظام کا ایک نمایاں وصف محنت کا وقار اور پیمانہ محنت کا تحفظ تھا واضح کر دیا گیا کہ معاشی تگ ودو کا اصول یہ ہوگا کہ

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم:39)

کہ انسان کے لئے صرف وہی کچھ ہے جس کے لئے اس نے کوشش کی ہے

محنت ایک پیمانہ ہے جس سے اجر ماپا جاتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ جو مفادات انسان کو حاصل ہو رہے ہیں کیا ان کا وزن اس کی محنت کے تناسب سے ہے کیا ایسا تو نہیں کہ اس میں دوسروں کی محنت کا استیصال ہو رہا ہے۔ یہ اوروں کی محنت کا پھل تو نہیں جو بلا محنت حاصل کر لیا گیا ہے اسلام نے یہ اصول دے کر ہر انسان کو مکلف بنا دیا کہ وہ اپنا خود محاسبہ کرے اور اپنی محنت کے ترازو میں اپنے معاوضے کو تولے اور جو محنت کا ثمر ہو اُس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور جو اُس کی محنت سے زائد ہو اُسے قوم کو لوٹا دے کہ یہ اُس کا حق نہیں، رزق حلال کا تصور محنت کے حوالے سے ہی قائم کیا گیا ہے کہ جب یہ پیمانہ قائم نہ رہے تو معاشرتی فساد رونما ہوتا ہے اور جلب زر اور حصولِ دولت کا ایک شیطانی سلسلہ پورے معاشرے پر محیط ہو جاتا ہے کہ یہ افراد کا عمل نہیں سب کا عمل ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے سے توفیق الٰہی کا سایہ اُٹھ جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے برملا ارشاد فرمایا تھا۔

اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا۔ (صحیح مسلم کتاب الزکواۃ)

بے شک اللہ تعالیٰ طیب ہے اور وہ طیبات کو ہی قبول کرتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک درماندہ حال، غبار آلود انسان کا تذکرہ فرمایا جس کے بال بکھرے ہوئے، لمبے سفر اور مسلسل تھکن سے پریشان انسان جس کی بظاہر دعا قبول ہونا چاہیے کہ ایسوں پر کرم ہوا کرتا ہے مگر فرمایا اس معاملہ میں ایسا نہیں ہوا وہ پکارتا رہا اے میرے پروردگار، اے میرے رب مگر حال یہ تھا کہ

مَطْعَمُہٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُہٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُہٗ حَرَامٌ وَغُذِّیَ بِالْحَرَامِ۔

(صحیح مسلم کتاب الزکاۃ)

اُس کا کھانا اُس کا پینا حرام کے مال سے، لباس حرام کی کمائی سے اور جو غذا جسم میں اُتاری گئی حرام و ناجائز مال سے تھی متنبہ کرتے ہوئے تہدیداً فرمایا۔ فانی یستجاب لہ۔ اس کی دعا کیسے قبول کر لی جائے۔ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب البیوع) ظاہری قرینہ تو قبولیت کا تھا مگر رزق حرام نے اُسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم کر دیا، اگر اسلامی معاشرہ کے افراد دستِ دعا بلند کرتے ہوئے اپنی ذات کا محاسبہ کر لیا کریں تو وہ بے یقینی اور مایوسی کی شکل پیدا نہ ہو جو آج مسلم معاشروں کو اندوہناک بنا رہی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے طیبات کی تلاش پر نہ صرف زور دیا بلکہ ان کے تحفظ کا اہتمام بھی فرمایا اسی لئے تو کسی کے حق ملکیت پر دست درازی کرنے والے کے بارے میں قرآن مجید کا یہ پیغام سنایا کہ ایسے انسان کا ہاتھ کاٹ دیا جائے کیوں؟ جواب ارشاد ہوا۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا (المائدہ 38)

اُن کے کئے کے بدلے کے طور پر، وہ ہاتھ جو حدود آشنا نہیں، وہ قوت جو دوسروں کے حقوق کو پامال کرتی ہے، اُسے کاٹ دیا گیا تا کہ دست درازی کا راستہ ہی

مسدود ہو جائے، ناحق مال کھانے پر وعید دی گئی کہ۔

لَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (النساء29)

ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق نہ کھاؤ ہاں جس کا حق ہے جس کی ملکیت ہے وہ خود ایثار کرنا چاہتے تو یہ اخوتِ اسلامی کا وہ درخشندہ باب ہوگا جو معاشرہ میں توازن لائے گا۔

لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ (سنن البیہقی)

کہ کسی انسان کا مال دوسرے پر حلال نہیں مگر جو وہ خود خوش دلی سے دے دے۔ اور اگر کوئی جابر دظالم اُس سے بغیر رضا کے چھیننا چاہیے تو اس کے دفاع کا اُسے حق حاصل ہے حتکہ اگر وہ اس حفاظت مال میں جان بھی دے دے تو خسارے کا سودا نہیں کہ ارشاد یہ ہے۔

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ (صحیح مسلم، کتاب الایمان)

جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا تو وہ شہید ہے۔

مسلم معاشرے کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی کہ وہ گردشِ زر میں حق انسانی کی عظمت قائم کرے۔ ایسا نہ ہو کہ چند بندگانِ ہوش تمام ذرائع معاش پر قبضہ کر لیں اور باقی افراد کو محروم کر دیں۔ اسلامی تصور معیشت کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ اس میں کسی گروہ یا فرد کا قبضہ تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ محنت کے پیمانے میں سب کو جانچا جاتا ہے محنت کے دربار میں سب کو اپنا استحقاق اسی حوالے سے ثابت کرنا ہے۔ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ جدوجہد باہمی میں سارے معاشرے کو کسی نہ کسی صورت شریک ہونا ہے۔ کوئی آجر بن کر آئے گا تو کوئی اجیر۔ مگر یہ ادائیگی محنت کے رخوں کا فرق ہوگا

انسانی وقار وعظمت کا نہیں اس لئے ان حوالوں سے معاشرے کی تقسیم مناسب نہیں ہے۔ آجر کو حکم دیا گیا کہ

اَعْطُوا الْاَجِيْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ يَجِفَّ عَرَقُهٗ۔ (سنن ابن ماجہ باب رھون)

اجیر کو اس کا اجر پسینہ خشک ہونے سے قبل ادا کرو، محنت حاضر ہو تو اجر موخر نہیں ہونا چاہیے کہ وہ وقتی استیصال بھی ہے اور معاشرتی اعتماد کی نفی بھی، آجیر کو حکم دیا گیا کہ اپنی محنت کی میزان میں اجر وصول کرے پورا اجر لے، نہ کم نہ زیادہ، کم ملے تو پورا حق لینے پر اصرار کرے اور معاشرہ اُس کا معاون بنے، زیادہ ملے تو انکار کرے کہ خیرات انسانی وقار کے لئے زہر قاتل ہے، ہاں اگر ایسے چند افراد موجود ہوں جو کسی حادثے، مصیبت یا ناگہانی افتاد کی وجہ سے محنت کے اہل نہ رہے ہوں تو ان کا حق، قوت وصلاحیت رکھنے والوں کے اجر میں رکھ دیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذریت19)

اور اُن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے۔ حق کہہ کر دونوں جانب انتباہ کر دیا گیا کہ دینے والے اسے احسان یعنی حسن عمل کے حوالے سے دے اس پر معاشرتی تفوق اور سماجی برتری کی کوئی بنیاد نہ رکھے کہ یہ ادائیگی حق تھی، نہ کی جاتی تو حقوق پامال ہوتے جو لائق مواخذہ ہیں۔ لینے والے کو بھی باور کرا دیا گیا کہ یہ نظامِ ربوبیت کے نفاذ کا نتیجہ ہے اس لئے حق سے زیادہ نہ لے اسے کاروبار نہ بنائے حقِ زیست کے لئے استعمال کرے اور اگر دولت والے اس نظام الٰہی کی پاسداری نہیں کرتے تو وہ اس قانون کو توڑ رہے ہیں جو روزِ اول سے ہی نافذ کر دیا گیا تھا۔ ارشاد ہے۔ جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا جا رہا تھا کہ جائیے۔

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾ (البقرہ 36)

اور تمہارے لئے زمین قرار گاہ بھی ہے اور قیامت تک کے لئے سامانِ زیست بھی، اس آیتِ کریمہ میں لَكُمْ کا کلمہ واضح کر رہا ہے۔ کہ اس وسیع و عریض زمین کی ملکیت ساری نسلِ انسانی کو حاصل ہے اس لئے انسان کو اس زمین سے تا حیات اپنی ضرورتوں کی کفالت کا حق حاصل ہے۔ رزق کی تلاش انسان کا حق ہے اور اس پر عزت سے رہنا بھی، اس لئے کوئی طالع آزما نہ کسی کو حق سکونت سے محروم کر سکتا ہے اور نہ ہی حق رزق سے، بلکہ اگر کہیں محرومی کا شائبہ ابھرے تو اُس محروم کا چھنا ہوا حق سمجھتے ہوئے اُسے ادا کرنا معاشرہ یا حکومت کا فرض بنتا ہے۔ اور یہ کوئی بے جا کی ذمہ داری نہ ہوگی کہ نیابت کا یہی تصور ہے۔ خالقِ کائنات نے یہ حق دیا ہے اور خالق کی رہنمائی کو عمل میں ڈھالنا اسلامی حکومت کا فرض ہوتا ہے اسی لئے ترغیب و تحریک سے قومی دولت کی واپسی کا مطالبہ کرنا عین اسلامی ضابطہ ہے تا کہ کسی ایک گروہ میں ارتکاز دولت کو یوں نہ پھیلا دیا جائے کہ نظامِ ربوبیت کا نفاذ نہ ہو سکے ہو سکتا ہے یہ سوال ذہن میں ابھرے کہ کیا یہ تحریک و ترغیب ہی کا عمل ہے اور اگر سرمایہ دار اپنے سرمایہ کو اپنے اندر ہی محدود گردش سے محفوظ رکھنا چاہیں تو کیا اخلاقی اپیل، یا رحم و کرم کی درخواست پر ہی اکتفا کرنا ہوگا اس سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کا عمل بڑا واضح ہے اور تاریخِ اسلام کا دورِ راشد اس حکما نفاذ کی مثال پیش کرتا ہے۔ مانعین زکاۃ سے جنگ، اس بات کا ثبوت ہے کہ جب حقوق ادا نہ کئے جائیں تو حکومت کو عملی اقدام کرنا ہوتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے کہ ایسے موقعوں پر طاقت کا استعمال بھی جائز ہوگا۔ فرمایا۔

تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ فِي فُقَرَائِهِمْ۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان)

یعنی اُن کے امیروں سے لیا جائے گا۔ اور اُن کے محتاجوں کو لوٹا دیا جائے گا معاشی تحفظ کی فراہمی قوم کا حق اور حکومت کا فرض ہے۔ وسائل کی دریافت اور عدل کی بنیاد پر اس کی تقسیم جاری رہنا چاہیے اس سے معاشی اضطراب پیدا نہیں ہوتا جو پر سکون اور آسودہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔

نظامِ معیشت میں محنت کا تعین، وقارِ انسانی سے مربوط ہے، محنت کش کو یہ یاد دلایا گیا کہ

"خَيْرُ الْكَاسِبِ الْعَامِلِ إِذَا نَصَحَ" (مسند احمد)

کہ کسب خیر اُس محنت کے لئے ہے جس کے پیش نظر خیر خواہی ہو، یعنی معاوضہ، شرط معاہدہ کے مطابق اور محنت تقاضائے عمل کے مطابق، مقصود بہر حال تعمیر و خیر خواہی ہو، ہر فردِ معاشرہ محنت کش ہے وہ کسی نہ کسی حوالے سے محنت کا مکلف ہے اس لئے کوئی شعبہ حیات بھی پسند کیا جائے اس میں رزقِ حلال کی خواہش رکھی جائے اور ہر شعبہ حیات کو احترام دیا جائے کہ محنت کسی حال میں بھی بے توقیر نہیں ہوتی نبی رحمت ﷺ نے اپنی برتر حیثیت اور رفعتِ شان کے باوجود نہ کدال اٹھانے میں عار محسوس کی اور نہ پیوند لگانے میں، اس طرح محنت کش کو اپنی ذات کا معتبر حوالہ عطا کر دیا۔ سربراہِ ریاست کی حیثیت سے خصوصی مراعات کا تقاضا نہ کیا اور تقسیم کار میں عدل و مساوات کو راہنما اصول قرار دیا، اس سلسلے میں آپ ﷺ نے متعدد اصول متعین فرمائے جن میں معاشی آسودگی کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا، پوری ریاست میں سکونت کے مسئلہ کو یوں حل فرمادیا کہ کوئی بے گھر نہ رہا۔ قطائع کے زیرِ عنوان، قطعات کی تقسیم کا عمل تاریخ اسلام کا روشن باب ہے۔ ایک گھر سب کے لئے اور زائد کسی کے لئے بھی نہیں، اور قطعات کو مقامی تقاضوں سے مربوط کیا تا کہ حالات سے سے صرفِ نظر نہ ہو، رہا سرکاری ملازمین کا مسئلہ تو اُن کے لئے بھی ایک گھر ہی پر اصرار

کیا گیا، ہاں مختلف مراکز پر عارضی رہائش کا اہتمام بھی ہوا کہ فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے لئے دوسرے شہروں میں بھی قیام کرنا ہوتا تھا مگر یہ عارضی قیام، حقِ ملکیت کا موجب نہ تھا، تعیناتی میں تبدیلی کے ساتھ ہی مکان خالی کرنا ہوتا تھا، کفالت کے لئے ضرورتوں کو ملحوظ رکھا گیا تاکہ اہلِ منصب کسی معاشی گھٹن کا شکار نہ ہو اور ناجائز ذرائع پر اعتماد نہ کرنے لگے، اور اگر پھر بھی کسی نے ایسی جسارت کی تو سختی سے پابند آداب بنایا گیا، ایک عامل نے جب مالِ غنیمت پیش کیا تو کچھ علیحدہ رکھ لیا، پوچھا یہ کیوں، تو کہا، غنیمت کا مال تو میں نے حاضر کردیا ہے یہ مال لوگوں نے محبت سے مجھے تحفہ دیا تھا، رحمت عالمین ﷺ نے اس استدلال اور توجیہہ کو پسند نہ فرمایا اور تہدیداً فرمایا، جاؤ اپنی ماں اور باپ کے گھر بیٹھ جاؤ، پھر بتانا کون تحفہ لاتا ہے۔

(صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ، باب تحریم ہدایا اللعمال)

واضح کردیا گیا کہ اصحاب منصب کے تحائف ذاتی نہیں ہوتے منصب کے حوالے سے ہوتے ہیں اس لئے ان کو اپنا قرار دینا دیانت دارانہ طرزِ عمل نہیں ہے۔

نظامِ معیشت میں وصولیوں کا نظام بڑی اہمیت رکھتا ہے، کبھی تو حکام کی بدعملی، کاہلی اور بدی کی قوتوں سے نباہ کی بنا پر محاصل میں کمی آتی ہے اور کبھی تخمینہ کاری کی نارسائی غیر متوازن کردیتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تخمینہ کاری کا ایک مستقل محکمہ تشکیل دیا تھا جس کے سربراہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ تھے، آپ کا کام تھا کہ آمدنی کے ذرائع، حصول کی کمیت اور برداشت کی حیثیت متعین کرتے اور اس کی اساس پر حکومتی واجبات کی حد بندی کرتے، یہ نظام بڑے مستحسن طریق سے جاری رہا لیکن ایک مرتبہ شکایت کا موقعہ ملا، حضور اکرم ﷺ جب غزوہ تبوک کے لئے تشریف لے گئے تو اہل تبوک نے شکایت کی کہ ہم پر محاصل کا طاقت سے بڑھ کر بوجھ

لادا گیا ہے۔ آپ نے ان کی شکایت کو نہایت خندہ پیشانی سے سنا اور فرمایا: میں خود تخمینہ لگاتا ہوں۔ چنانچہ تخمینہ کاری کا پورا عمل آپ کی زیر نگرانی دوبارہ مکمل کیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ شکایت درست تھی۔ کتنا زیادہ وصول کیا گیا اس کا بھی حساب ہوا اور بالآخر آپ نے دس دسق کے حساب سے شکایت کنندگان سے لیا ہوا مال واپس لوٹا دیا اور ثابت کردیا کہ اسلامی نظامِ معیشت میں عدل ہوتا ہے، صرف محصولات کی فراہمی ہی مقصود نہیں ہوتی۔ اس سے حکومتی جبر کے راستے بند ہوگئے اور شہریوں کو سکون کی دولت نصیب ہوئی۔

نظامِ معیشت کے جس جس پہلو کا بھی جائزہ لیا جائے حضور اکرم ﷺ کی عملی راہنمائی موجود ہے آپ نے چند سالوں ہی میں اُس جزیرہ نمائے عرب کو معاشی خود کفالت کا اہل بنادیا جو ہمیشہ دوسروں کے نذرانوں اور نوازشوں پر پلتا تھا۔ بے گیاہ وادی جس کا سینہ ہر قسم کی روئیدگی سے محروم تھا اور جہاں گھاس کا ایک ایک تنکا تلاش کرنے کے لئے میلوں کا سفر کرنا پڑتا تھا اور جہاں بارش کے جمع شدہ چند قطروں پر قتل وجدال ہوتا رہا تھا جہاں قوم تباہی کے کنارے پر تھی۔ معاشی بدحالی نے اخلاقی پستی کو جنم دیا تھا کہ افلاس کا کفر سے رشتہ جڑ جایا کرتا ہے ایسا ماحول جس کی اصلاح کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی اور ایسے ظالم وجابر بادیہ نشیں جو ایک دوسرے پر چند لقموں کے لئے جھپٹتے رہتے تھے وہی لوگ حضور اکرم ﷺ کے زیر سایہ صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کر گئے، استیصال اور جبر، سود وخراج کے بندھنوں میں اسیر قوم نہ صرف یہ کہ خوشحال ہوئی بلکہ اسلامی اخوت کا معیار بن گئی۔ اور آنے والوں کو جہاں بانی کے اصول سمجھانے لگی، کسی معاشرے کو عملی تطہیر سے گزارنے کی ابتداء معاشی تطہیر سے ہی ہوا کرتی ہے۔ پیٹ کے راستے بغض وحسد اور ظلم وجبر پیدا ہوتا ہے اس لئے معاشی کفالت، رفاہی ریاست کا

جز ولازم ہوتی ہے اور جب احتیاج مٹ جائے تو اخلاق عالیہ کی نمو ہونے لگتی ہے۔
حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا مربوط نظام معیشت عطا فرمایا جس میں محنت کی عظمت محنت کش کا وقار، آجر کا تحفظ، اجیر کے حقوق کی پاسداری، گردشِ زر کا بے لاگ طریق کار اور شرفِ انسانیت کا فروغ سب کچھ ہے، ضرورت صرف اس چشمہ فیض سے متمتع ہونے کے لئے ایک عزمِ صادق کی ہے۔ یاد رکھئے عزم صادق ہو تو مسدود راستے بھی استقبال کرنے لگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ وطن عزیز میں نبوی نظامِ معیشت کے احیاء کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اس کے نفاذ کے لئے عملی اقدام کا حوصلہ دے۔ آمین

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے حوالے سے شعر کا مقام

شعر کیا ہے؟ علماء ادب نے اس بارے میں متعدد خیالات کا اظہار کیا ہے۔
وزن اور قافیہ شعر کی صوری صفات ہیں اور بعض نے ان کے التزام کو ہی شعر کا بنیادی عنصر شمار کیا ہے۔1
ابن رشیق القیر وانی نے مقولات شعر کو چار عناصر پر مشتمل قرار دیا ہے وزن وقافیہ الفاظ اور معانی تکوین شعر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں بلکہ وہ تو انہیں شعر کا جسم وروح کہتا ہے۔2

الفاظ ذریعہ ہیں معانی تک پہنچنے کا اور اگر الفاظ یہ فریضہ باحسن طریق انجام نہ دیں تو شعر ابلاغ کے بنیادی وصف سے محروم ہو کر نا قابل التفات ٹھہرتا ہے اور اگر معانی مرغوب ومحبوب نہ ہوں تو الفاظ کی تراش خراش سعی لاحاصل ہوتی ہے۔ الفاظ ومعانی میں جسم وروح کا تعلق ان کی قدر وقیمت کا تعین کرتا ہے۔ جسم کی سج دھج قابل لحاظ ہے مگر یہ سب کچھ روح کے رابطے کے حوالے سے ہے۔ یہ رابطہ نہ ہو تو جسم مردہ ہے اور مردہ کو کس قدر بھی عمل مومیائی سے گزارا جائے باعث نشاط نہیں لائق عبرت ہی ہے۔
شعر میں معانی کی عظمت کا اعتراف اس کی شعور سے لغوی نسبت کے حوالے سے بھی کیا گیا ہے کہ شعر کو شعور کا انعکاس سمجھا گیا ہے۔ ابن رشیق کہتا ہے۔

سمی الشاعر شاعر الانہ یشعر بما لا یشعر لہ غیرہ۔3

امام راغب الاصفہانی (م 502ھ) فرماتے ہیں۔

وسمی الشاعر شاعر الفطنته ودقة معرفته۔4

(شاعر کو اس کی ذہنی بالیدگی اور دقت معرفت کی وجہ سے شاعر کہا گیا)

شعر یوں تو وزن وقافیہ کے ضابطوں سے ترتیب دیا ہوا ایک قطعہ کلام ہے مگر دراصل یہ شاعر کے اندرونی جذبے اور داخلی شعور کی ایسی سچی آواز ہے کہ ہر سامع اسے اپنے دل کی پکار اور روح کی تڑپ خیال کرتا ہے۔اس لئے یہ نہ صرف وزن وقافیہ کا مظہر اور نہ صرف جذبوں کا عکاس ہے بلکہ یہ سب جوانب کا جامع ہے اور تمام مقومات کا ایسا مجموعہ ہے جس میں یہ سب ایک دوسرے میں پیوست ہوکر ایک وحدت اور ایک اکائی بن گئے ہیں۔عرب کا صاحب معلقہ شاعر زہیر بن ابی سلمٰی کہتا ہے۔

وان احسن بیت انت قائله
بیت یقال اذا انشدته صدقا۔5

(عمدہ تر شعر وہ ہے کہ جب تو شعر کہے تو تیرے پڑھنے پر یہی پکارا آئے کہ سچ کہا)

عربوں کے ہاں شعر کی منزلت اس قدر تھی کہ شاعر ان کے قومی وقار کا ناقوس تھا۔وہ قبائلی کارناموں کا محافظ اور ان کی غیرت کا امین تھا اس لئے اس کے شعر تیر سے زیادہ اثر آفرین تھے۔ڈاکٹر لکلسن کا کہنا ہے کہ

Their unwritten words flew across the desert faster than arrows and came home to the hearts and gossoms of all who heard them.6

شاعری کی بے پناہ عظمت اور ہمہ جہتی اثرات کا حوالہ ڈاکٹر لی بان نے ان الفاظ میں دیا۔

''ان یعنی عرب شعراء کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ قریش نے الاعشیٰ شاعر کو سو اونٹ محض اس لئے دیئے کہ آنحضرت ﷺ کی مدح میں جو اشعار اس نے لکھے تھے ان کی اشاعت نہ کرے۔7

اسلام دین فطرت ہے وہ انسانی جذبوں کی تہذیب کا تو قائل ہے نفی کا نہیں۔شعر کی حیثیت مسلم تھی اس سے کلیتہً اجتناب نہ ممکن تھا نہ مناسب اس لئے اسلام نے شعر کی معاشرتی گرفت اور شاعر کی ذہنی صلاحیت کو تسلیم کیا اور اس ادبی وفکری مظہر کو پذیرائی بخشی لیکن اس قوت کو منہ زور ہونے اور معاشرتی اضطراب کا محرک بننے کی اجازت نہ دی،قرآن مجید نے شعر کے حوالے سے جو اسلامی رویہ کی وضاحت کی اس سے بعض اذہان میں شعر سے نفرت بھی بیدار ہوئی اور وہ اسے شغل لاطائل سمجھ کر تردید کرنے لگے جبکہ بعض نے حدود وضوابط سے انکار کرتے ہوئے شعر کو لامحالہ احسن اور بہتر مظہر سمجھا۔نبی رحمت ﷺ نے امت کو اس پریشان نظری کا شکار نہ ہونے دیا اور واضح ارشادات سے درست طریق عمل کی نشاندہی فرمادی۔وہ طریق اعتدال کیا ہے اس کو جاننے کے لئے قرآن وحدیث کے ان احکام کو پیش نظر رکھنا ہوگا جو کبھی موافق کیفیت کا اشارہ دیتے ہیں تو کبھی مخالف کیفیت کا۔بہتر ہوگا کہ تمام موافق اور مخالف روایات کا حتی الامکان احصاء کر لیا جائے تاکہ تقابلی جائزہ سے درست صورتحال سامنے آئے۔آیئے پہلے موافق روایات پر توجہ دیتے ہیں۔

موافق روایات:

(ا) 1۔ان من الشعر حکمة(8)(بے شک شعر میں حکمت ہے)

2۔ان من الشعر حکماً(9)(بے شک شعر میں حکمتیں ہیں)

3۔ان من البیان سحرا وان من الشعر حکما (10)

(بے شک بیان میں جادو ہے اور بے شک شعر میں حکمتیں ہیں)

(ب) 1۔حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ دربار رسالت میں شعر کا ذکر ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ھو کلام فحسنہ حسن وقبیحہ قبیح (۱۱)

(2) عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال:انما الشعر کلام مولف فما وافق الحق منہ فھو حسن ومالم یوافق الحق منہ فلاخیر فیہ....وقد قال علیہ الصلاۃ والسلام انما الشعر کلام فمن الکلام خبیث وطیب۔12

(ج)(1) حضرت ابوہریرہ ؓ سے حضرت حسان ؓ نے پوچھا کہ انہوں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ یقول یاحسان اجب عن رسول اللہ اللھم ایدہ بروح القدس قال ابوھریرۃ نعم۔13

2 قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوم قریظۃ لحسان بن ثابت اھج المشرکین فان جبریل معک۔14

3 عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال اھجو قریشا فانہ اشد علیھا من رشق بالنبل۔15

حضرت کعب بن مالک ؓ کا شعر پڑھنا جبکہ بعض روایت میں حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ کا عمرۃ القضا کے موقع پر شعر پڑھنا مذکور ہے۔(اگرچہ حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ کا ذکر قرین واقعہ نہیں کہ ان کا موجود ہونا درست نہیں کہ وہ اس

سے قبل ہی جنگ موتہ میں شہید ہو چکے تھے) حضرت عمر ؓ نے روکا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے حرم پاک میں شعر پڑھنا مناسب نہیں مگر فقال رسول اللہ ﷺ خل عنہ یاعمر فھو اسرع فیھم من نضج النبیل۔16

کہ اے عمر ؓ رہنے دو، یہ ان کے لئے تیر کے گھاؤ سے زیادہ تیز ہیں۔

4 امیۃ بن الصلت کے متعدد اشعار (سو کے قریب) خود حضور ﷺ نے سنے اور تحسین فرمائی۔17

5 دوران سفر حضرت حسان ؓ کو بلایا اشعار سنے اور سنتے رہے آخر یہ فرمایا۔ لھذا اشد علیھم من وقع النبل۔18

6 حضرت ضراء بن الازور ؓ حاضر ہوئے تو فرمایا پڑھو تو انہوں نے چار شعر کہے۔19

(د) 1۔حضرت حسان ؓ نے جب مشرکین کی ہجو کے لئے اجازت چاہی تو فرمایا میری قرابت داری کا کیا ہوگا، اس پر حضرت حسان ؓ نے عرض کیا۔

لاسلنک منھم کما تسل الشعرۃ من العجین۔20

میں آپ کو ان سے یوں نکال لوں گا جیسے گندھے ہوئے آٹے سے بال نکال لیا جاتا ہے۔

2 ایک روایت میں العجین (گندھا ہوا آٹا) کی بجائے الخمیر (خمیر والا آٹا) ہے 21

(ہ) 1۔حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ حضرت حسان ؓ کے لئے مسجد میں منبر رکھوایا کرتے تھے اور آپ اس پر کھڑے ہو کر دفاعِ رسالت کا فریضہ ادا کرتے تھے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

ان الله يويد حسان بروح القدس مايفا خراوينا فع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ 22

2 ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت حسانؓ کو مسجد میں شعر پڑھنے سے منع کیا تو انہوں نے جواب دیا۔

كنت انشد فية وفيه من هو خير منك۔ 23

کہ میں اس میں اس وقت بھی پڑھتا تھا جبکہ اس میں آپ سے بہتر وجود ہوا کرتا تھا) پھر آپ نے حضرت ابوھریرہ سے تائید بھی چاہی انہوں نے تائید فرمائی۔

3 حضرت عروہ بن الزبیرؓ نے حضرت عائشہؓ کے ہاں حضرت حسانؓ کو برا کہا (واقعہ افک کے حوالے سے) اس پر ام المومنینؓ نے فرمایا "لاتسبه فانه كان ينافح عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ 24

4 صاحب معلقہ جاہلی شاعر عنترہ کا شعر سنا تو آپ ﷺ نے اسے دیکھنے کو پسند کیا فرمایا۔

ماوصف لى اعرابى قط فاحببت ان اراه الاعنترة۔ 25

کسی بدوی نے میرا وصف بیان نہیں کیا کہ میں نے اُسے دیکھنا چاہا ہو سوائے عنترہ کے۔

5 حضرت ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔

اشعر كلمة تكلمت بها العرب كلمه لبيد۔

الاكلّ شئ ماخلا الله باطل ۔26

(و) دربار رسالت سے مدح خواں شعراء کو نوازا بھی گیا مثلاً

1 حضرت حسانؓ نے اپنا ھمزیہ قصیدہ پیش کیا اور جب یہ شعر پڑھا۔

هجرت محمداً فاجبت عنه وعند الله فى ذاك الجزاء

تو فرمایا:

جزاوك على الله الجنة ياحسان

اور جب یہ شعر پڑھا۔

فان ابى ووالده وعرضى لعرض محمد منكم وقاء

تو فرمایا۔

وقاك الله ياحسان حر النار۔ 27

2 حضرت کعب بن زہیرؓ نے جب اپنا لامیہ قصیدہ بانت سعاد پیش کیا تو حضور اکرم ﷺ نے ان پر اپنی چادر اوڑھادی جسے امیر معاویہؓ نے بھاری قیمت ادا کر کے خرید لیا۔ جس کو خلفاء عیدین کے موقعوں پر پہنتے رہے۔ 28

اس کی قیمت العمدہ میں تیس ہزار درہم اور بعض نے بیس ہزار درہم بتائی ہے۔ 29

3 حضرت عباسؓ نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ انی ارید ان امتدحك فقال له النبی صلی اللہ علیہ وسلّم قل لايفضض الله فاك۔ 30

فرمایا اللہ تعالیٰ تیرے منہ نہ توڑے یعنی دانت نہ گریں۔

4 النابغة الجعدی کے اشعار پر بھی یہی دعا دی "لايفضض الله فاك"

کہا جاتا ہے کہ وہ بہت خوبصورت دانتوں والے تھے جب کوئی دانت گرتا تو دوسرا نکل آتا۔ 31

5 حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا اللھم ارحمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا رحم واجب ہوا۔32

6 ابوجرول زہیر بن جرد رضی اللہ عنہ کے اشعار پر آپ نے بنو ہوازن (حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کا قبیلہ) کا تمام مال واپس کر دیا۔33

(ز) 1۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رجزیہ اشعار پڑھتے تو آپ بھی شعر پڑھ کر جواب دیتے۔

اللھم لاخیر الاخیر الاٰخرۃ فاغفر الانصار والمھاجرۃ

34

خندق کی مناسبت سے بھی یہ شعر نقل ہوا ہے اور اس کے کلمات میں اختلاف بھی روایات میں موجود ہے۔

2 عامر بن الاکوع رضی اللہ عنہ کے اشعار سنے تو فرمایا یرحمہ اللہ۔35

3 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کسی کے شعر کی مثال بھی دیا کرتے ہیں تو فرمایا ہاں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے شعر کو پڑھتے۔

ویاتیک بالاخبار من لم تزود۔36

4 جنگ حنین میں جب پاؤں اکھڑے تو امام الانبیاء ﷺ خود سوار ہو کر نکلے حضرت ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ نے لگام تھام رکھی تھی اور آپ رجز پڑھتے جاتے تھے۔

انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب 37

یہ بھی ذکر کیا گیا کہ مسجد قباء کی تعمیر کے موقع پر آپ نے شعر پڑھا اگرچہ علماء

نے تصریح کی کہ

لم بلغنا فی الاحادیث ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمثل بیت شعر تام غیر ھذہ الابیات

شعر یہ ہے!

ھذا المحال لاحمال خیبر ھذا ابر ربنا واطھر

پھر پڑھا!

اللھم ان الاجر اجر الاٰخرۃ فارحم الانصار والمھاجرۃ

38

(ح) 1 حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔

"الشعر میزان القوم"

یعنی شعر کسی قوم کی شائستگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔39

2 حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ شعر کی تعلیم کا حکم دو

فانہ یدل علی معالی الاخلاق وصواب الرأی ومعرفۃ الانساب

40

3 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بہت کثرت سے شعر روایت کرتی تھیں۔ حضرت لبید رضی اللہ عنہ کے تو تمام شعر روایت کیا کرتیں۔41

4 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

علموا اولاد کم الشعر تعذب السنتھم 42

5 حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا شعر کہتی تھیں کثیر شعر روایت ہوئے ہیں۔44

6 کہا جاتا ہے کہ بنوعبد المطلب میں سے کوئی مرد یا عورت ایسی نہ تھی جو شعر نہ کہتی ہو سوائے نبی اکرم ﷺ کے۔ 45

7 حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جب تفسیر وحدیث کے درس سے فارغ ہوتے تو خوشگوار گفتگو کا ارشاد فرماتے تا کہ اکتاہٹ پیدا نہ ہو۔ 46

8 حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو انصار کا کوئی ایسا گھر نہ تھا جو شعر نہ کہتا ہو۔ پوچھا گیا۔

''وانت اباحمزۃ قال وانا'' 47

9 حضرت ابن سیرین رضی اللہ عنہ نے شعر پڑھا تو کسی ہم مجلس نے کہا آپ بھی شعر پڑھتے ہیں (گویا یہ اچھا کام نہیں) فرمایا ارے ناکارہ ''ھل الشعر الا کلام لایخالف سائر الکلام الافی القوافی فحسنہ حسن وقبیحہ قبیح 48

10 حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ عراق میں کچھ لوگ شعر کو ناپسند کرتے ہیں فرمایا عجمی راہ پر چلے ہیں۔ 49

روایات کا جائزہ:

یہ گفتگو شعر کی عظمت وحیثیت کے آٹھ مختلف حوالوں پر مشتمل ہیں۔ ان کے مندرجات کا جائزہ ان سے مترشح ہونے والے مفہوم تک رسائی کا ذریعہ ہوگا مثلاً

جزو ''الف'' میں شعر کی عمومی حالت کو واضح کیا گیا کہ شعر فی نفسہ کن اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔

ان من الشعر حکمۃ یا حکماً

کے الفاظ اپنے بسیط تر معانی میں بھی شعر میں حکمت کی موجودگی کے امکان

کا اظہار ہیں۔ من تبیعض کے لئے ہو تو بعض شعروں کا حکمت سے پر ہونا ثابت ہوا اور اگر یہ تبیین کے لئے ہے تو ہر شعر کا پرازحکمت ہونے پر دلیل ہوا۔ کم سے کم تر توجیہ یہی ہو سکتی ہے کہ ہر شعر نہ سہی بعض شعر یقیناً حکمت خیز ہوتے ہیں اس مفہوم کے مطابق شعر کی وسیع تر کائنات میں بعض اشعار کا قابل اخذ اور لائق التفات ہونا واضح ہوا۔ اگر وہ حدیث بھی پیش نظر رہے جو حضرت ابوھیرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن حیث ما وحدھا فھو احق بھا 50

یعنی کلمہ حکمت تو مومن کی متاع گم گشتہ ہے جہاں سے بھی اسے ملے وہ اس کا بہتر حق دار ہے۔ ان احادیث سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ کلمہ حکمت مومن کی متاع گم شدہ ہے اور بعض شعر کلمہ حکمت ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض شعر بھی مومن کی متاع گم گشتہ ہیں۔ ان سے شعر کا ایک حصہ مومن کا مطلوب ٹھہرا۔

عربوں کے ہاں شعر سحر آفریں ہوتا ہے وہ شاعر عظیم ہے جو لفظوں کا جادو جگائے اور حرفوں میں سحر بھر دے اس لئے ان کی شاعری ساحری تھی، حدیث رسول اللہ ﷺ میں شعر کی اس کیفیت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ صاحب مرآۃ الشعر کا کہنا ہے۔

''یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شعر اسی حد تک شعر ہے کہ شعور کا رنگ واثر غالب رہے۔ اپنی اصل وحقیقت سے دور نہ ہو، یہی راز حدیث نبوی ﷺ میں آیا ہے۔ ان من البیان لسحر أو ان من الشعر لحکمۃ یعنی بیان اصل میں حکمت وموعظت ہے لیکن کبھی کبھی حدود شعر میں داخل ہوجاتا ہے اور سحر بن جاتا ہے اور کبھی

کوئی شعر حدود خطابت میں آجاتا ہے اور سحر سے حکمت بن جاتا ہے کیونکہ خطابت کا انتہائے کمال یہ ہے کہ حکمت ہو اور تاثیر میں جادو بن جائے ، سننے والا سنے اور مسحور ہو جائے اور انتہائے کمال شعر کا یہ ہوتا ہے کہ شعر اگرچہ فی حد ذاتہ شعور وجذبات کا نتیجہ اور جادو ہے لیکن اس سحر و سامری کے باوجود دانش وحکمت کے ذروہ بلند تک پہنچے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ کلام انسانی کے درجہ کمال کا وہ بلند ترین نقطہ ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا اور جن کو نصیب ہوتا ہے ہر وقت نہیں ہوتا اسی لئے بعض از بیان اور بعض از اشعار کے بارے میں ارشاد ہوا جو کچھ ارشاد ہوا۔51

ان روایت سے شعر کہنے یا سننے کی تحریک ہوتی ہے کہ یہ کلام کا منتہیٰ ہے اور تاثیر کی بے پناہ قوت رکھتا ہے۔

جزو "ب" کی روایات میں شعر کو کلام کا ایک ایسا رخ قرار دیا گیا جو اپنے مفاہیم کی مناسبت سے حسین بھی ہو سکتا ہے اور قبیح بھی۔ کلام ہونے کی حد تک کسی حکم کا مصداق نہیں۔ شعر اظہار کا تند و تیز ذریعہ ہے۔ اسلام نے اسے بہتر مقاصد کے لئے مباح بلکہ بعض اوقات ضروری قرار دیا، حسن کلام محبوب ٹھہرا، کلام حق نما ہو کہ کلام کا حسن وقبح سانچوں سے زیادہ مضامین کی نسبت سے متعین ہوتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ۔ (م 505ھ)۔ فرماتے ہیں۔

الکلام المفہوم غیر حرام والصوت الطیب الموزون غیر حرام فاذا لم یحرم الاحاد فمن این یحرم المجموع۔52

کلام مفہوم حرام نہیں، اچھی اور موزوں آواز حرام نہیں، جب یہ فرداً فرداً

حرام نہیں تو مجموعہ کی حرمت کہاں سے آئے گی۔

جزو "ج" اور جزو۔ "د" میں شامل روایات سے شعر کی دفاعی حیثیت اور ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ حق وباطل کی آویزش میں ہر جائز اور ضروری حربہ استعمال کرنا ہوتا ہے تاکہ حق آشکار ہو اور باطل سرنگوں رہے۔ قتال بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور جہادِ باللسان بھی، ہر ایک کا اپنا مقام ہے لیکن بعض اوقات الفاظ کی کاٹ شمشیر سے کئی گنا شدید ہوتی ہے۔ لفظوں کے تیر، زہر آلود لوہے کے تیروں اور بھالوں سے زیادہ کاری ہوتے ہیں۔ اھجھم ان کی ہجو لکھو یا اجب من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے جواب دو، کے احکام دفاعی شاعری کو ایک فریضہ بنا رہے ہیں مگر اس ردعمل میں توازن کو ملحوظ رکھا گیا کہ تجاوز عن الحد نہ ہونے پائے۔ امیہ بن الصلت کے حکمت آمیز اشعار سماعت فرما کر اور ھیہ یعنی مزید کہو کا ارشاد فرما کر ایک طریق کار متعین کر دیا کہ حکیمانہ اشعار اور ناصحانہ ابیات کی خواہش رکھنا سنت پیغمبر علیہ السلام ہے۔ شعر گوئی محمود ہی تھی اس لئے کبھی شاعر کی خواہش پر جیسے حضرت ضرار بن الازور کی خواہش پر سماعت قبول کر لی تو کبھی خود تقاضا فرما کر شعر گوئی کی ترغیب دی جیسا کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا۔

جزو "ہ" میں شعر کی دربار رسالت میں پذیرائی کا بیان ہے۔ شعر خوانی فعلِ عبث ہوتا تو دربار رسالت میں راہ کیسے پاتا اور مسجد میں اس کی اجازت کیوں دی جاتی منبع رشد و ہدایت مسجد میں کسی فعل کا انجام پانا اور وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں فعل کی حلت کا ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد نبوی میں شعر خوانی، شعر کو حلت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی شعر کو تقدس عطا کرتے ہیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ

سماعت شعر کا یہ اہتمام کہ منبر بچھایا جاتا، پڑھنے والے کو روح القدس کی تائید حاصل ہونے کی نوید سنائی جاتی، حضرت حسان ؓ بشارتوں سے نوازے جاتے، حضرت عمر ؓ کے جواب میں ان کا پراعتماد لہجہ اپنے عمل کی صداقت پر اصرار، حضرت ابوھریرۃ ؓ کی تائید، شعرخوانی کے خلاف تمام شکوک وشبہات کو دور کرتے ہیں۔ جاہلی شاعر عنترہ کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار معنون شعر کی عظمت کا اعتراف ہی تو ہے۔ حضرت لبید ؓ کے مصرعہ پر پسندیدگی، شعر کے بارے میں نبوی رویہ کی شہادت ہے۔

جزو ''د'' کی روایات اس ہمدردانہ رویہ کی خبر دیتی ہیں جو آنحضرت ﷺ نے شعراء کے ساتھ اپنایا تھا، ترغیب کے ساتھ برمحل تحسین۔ شعر کی اثر آفرینی کا حوالہ ہے۔ حضرت حسان ؓ کو جنت کی بشارت، دوزخ سے محفوظ رہنے کی نوید اس طرز عمل کے شواہد ہیں۔ حضرت کعب بن زھیر ؓ کا قصیدہ جاں بخشی کا ذریعہ بھی بنا اور قبولیت کا معیار بھی ٹھہرا۔ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں۔

''صارت هذه القصيدة احسن الوسائل الى الشفاعة واوثق الذرائع الى الاغماض وفازت بحسن القبول من جنابه وجازى قائلها بعطية من جلبابه''53

حضرت عباس ؓ اور حضرت النابغة الجعدی ؓ کے حق میں دعا کہ لايفضض الله فاك کا یہ اثر کہ ان کے دانت موتیوں کی طرح تاعمر درخشاں رہے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ کے لئے رحم کی دعا اور ابوجردل ؓ کے استمدادیہ لہجے پر عام معافی۔ دربار رسالت میں شعرگوئی کے رواج کی خبر دیتے ہیں۔

جزو ''ز'' کی روایات ان پسندیدہ اشعار کی خبر دیتی ہیں جنہیں دربار رسالت

میں بار آور ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ باریابی شعر کی قبولیت اور ان میں متضمن خیالات کے بارے میں اسلامی مزاج کی نشاندہی کرتے ہیں۔ حضرت لبید ؓ کے شعر پر اصدق کلمة کا تبصرہ مضامین شعر کی حدود اور قدر و قیمت کا معیار ہے۔ جنگ میں رجز، تعمیر مسجد کے محنت طلب مرحلہ پر شعر کی حلاوت، شعر کے مواقع کی نشاندہی ہے کہ ذوق شعر بھی برقرار رہا دعا کا مقصد بھی حاصل ہوا اور اطمینان وسکون کی کیفیت بھی طاری رہی۔

انا النبی لا کذب۔ انا ابن عبد المطلب

کے نعرہ حق نے شکست کو فتح میں بدلا، زبان نبوت سے ادا ہونے والے باوزن اور ہم قافیہ کلمات نوید جانفزا ثابت ہوئے اور شعر کا حسن ہویدا ہوا۔

آخری جزو ''ح'' میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آراء پر مشتمل ایک مختصر فہرست ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اسوہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع میں ان برگزیدہ اصحاب کے ہاں شعر کی قدر وقیمت کیا ہے۔ شعر کو میزان القوم قرار دینا شعر کا وہ شرف ہے کہ نثر اپنی تمام تر رفعتوں کے باوجود حاصل نہ کر سکی۔ حضرت عمر ؓ کا ترغیب شعر کے لئے فرمان، حضرت عائشہ ؓ کا تعلیم شعر پر زور اور کثرت سے روایت، حضرت فاطمہ ؓ کا شعر کہنا، خاندان بنی عبد المطلب اور انصار مدینہ کے افراد کا شعر سے شغف، ابن سیرین کا شعر کی عظمت پر گواہی دینا اور حضرت سعید بن المسیب ؓ کا ترک شعر کو عجمی رویہ قرار دینا۔ شعر کی مقبولیت، ضرورت اور عظمت کے بین شواہد ہیں۔

یہ گفتگو روایت شعر کے بارے میں اسلامی تعلیمات کے رویے کو واضح کرتی

ہے۔ شعر کے بنیادی اوصاف کا اعتراف، شعر میں حکمت آمیزی کی شہادت، عمدہ اشعار پر تحسین وترغیب، خواہش شعر کا لحاظ، دفاعی ضرورت کے لئے شعر کی اہمیت، حسین موضوعات کے حامل اشعار پر پسندیدگی کا اظہار اور انعام واکرام کا اعلان، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اشتیاق اور آئندہ نسلوں کو شعر کی ترغیب وتحریک، یہ سب روایات شعر کی عظمت کے شواہد ہیں کیونکہ:

''شعر تو وہ کلام ہے جو لفظی ومعنوی حسن وجمال کی تصویر ہو، ایسی تصویر جو کمال شعور سے ناشی ہو اور سننے والوں میں شعور واحساس پیدا کرے۔ خود جذبات میں ڈوبا ہوا اور وہ جذبات سے اپیل کرے۔54

غیر موافق روایات:

اسلامی تعلیمات میں سے شعر کی تردید کے لئے بعض آیات وروایات سے استشہاد کیا جاتا ہے اور یہ تاثر قائم کرنے کے لئے کوشش کی جاتی ہے کہ قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے ایسے دلائل تلاش کئے جائیں جو شعر کی ہر نوعیت اور ہر مضمون کو معتوب قرار دیں تا کہ شعر گوئی اور شعر خوانی کو غیر اسلامی حرکت ثابت کیا جائے۔ ایسی روایات کا احصاء تو ممکن نہیں مگر ان میں سے وہ جن پر استدلال کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے ان کا ذکر مناسب ہوگا۔ ابتداء ان آیات سے کی جاتی ہے جو شعر کی نفی کے لئے بطور دلیل عموماً ذکر کی جاتی ہیں۔

(الف) قرآن مجید:

1 وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ 55

اور شعراء ان کی اتباع کرتے ہیں بے راہ رو، کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ جو کرتے نہیں۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کیا اور وہ فتح یاب ہوئے بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور عنقریب جان لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا کہ وہ کس کروٹ الٹتے جائیں گے۔

2 وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِیْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ 56

اور ہم نے آپ کو شعر نہیں سکھایا اور نہ یہ آپ کے لئے مناسب تھا، یہ تو ذکر اور قرآن مبین ہے۔

3 وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ 57

اور تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ 58

اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں تم بہت کم یقین کرتے ہو۔

اور پھر فرمایا یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔

(ب) احادیث:

1 حضرت ابوھیرۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

لان یمتلی جوف الرجل قیحاً حتی یریہ خیر لہ من ان یمتلی شعرا 59

2 یہی حدیث معمول اختلاف سے صحیح مسلم میں حضرت ابوھریرہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہوئی ہے۔ 60

3 سنن ابن ماجہ میں بھی یہ حدیث ہر دو صحابہ سے مروی ہے۔ 61

4 جامع الترمذی میں یہی روایت صرف حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ 62

5 حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا۔

ان یمتلی جوف احد کم قیحاً خیرلہ من ان یمتلی شعراً۔ 63

6 جامع الترمذی میں یہ حدیث حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ 64

7 مگر سنن ابی داؤد میں یہ حدیث حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ 65

8 عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لان یمتلی احد کم قیحاً حتی یریہ خیرلہ من ان یمتلی شعراً ھجیت بہ 66

9 یہی روایت حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔ 67

10 حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

لایمتلی جوف احد کم قیحاً ودماخیرلہ من ان یمتلی شعراً

قالت عائشۃ رضی اللہ عنہا لم یحفظ الحدیث لما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایمتلی جوف احد کم قیحاً ودما خیرلہ من ان یمتلی شعراً ھجیت بہ 68

11 حضرت ابوسعید الخذری رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چل رہے تھے کہ عرج کے مقام پر ایک شاعر کا سامنا ہوا جو شعر پڑھ رہا تھا اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

خذوا الشیطان اوامسکوا الشیطان لایمتلی جوف رجل قیحاً خیرلہ من ان یمتلی شعراً۔ 69

آیات قرآنیہ کے بارے میں چند توضیحی گزارشات:

قرآن مجید کی وہ آیات جن پر انکار شعر کی ساری عمارت استوار کی جاتی ہے شعر کی مذمت میں وارد نہیں ہوئیں بلکہ اس کی تہذیب اور اس قوت اظہار کی روش روش کے اظہار کے لئے ہیں۔ ذوق شعری انسان کی قوت گویائی کا حسین تر پرتو ہے اور اسلام دین فطرت ہونے کے ناطے اس سے صرف نظر نہیں کرتا اس لئے اسلامی تعلیمات نے کہیں بھی شعر کو بحیثیت شعر قابل نفرت نہیں گردانا ہاں اس پیکر جمیل کے لئے حسین مضامین کے انتخاب پر زور ضرور دیا ہے۔ قرآن مجید کے احکام میں یہی نقطہ ملحوظ رہنا چاہیے۔

1 والشعراء یتبعھم الغاؤن۔ بظاہر شعراء کے لئے ایک تہدید ہے۔ اس تہدید کی نوعیت اور حدود کیا ہیں یہ جاننے کے لئے چند مشہور تفاسیر کا حوالہ ایضاح مطلب کے لئے کفایت کرے گا۔

(الف) امام فخر الدین الرازی (م 606ھ) آیات مذکورہ کی شرح میں فرماتے ہیں۔

"فقد ظھر بھذا الذی بیناہ ان حال محمد صلی اللہ علیہ وسلم ماکان یشبہ حال الشعراء ثم ان اللہ تعالیٰ لما وصف الشعراء بھذہ

الاوصاف الذميمة بيانا لهذا الفرق استثنیٰ عنهم الموصومين بأمور العمل الصالح وهو قوله: وعملوا الصلحت (وثالثها) ان يكون شعرهم فی التوحيد والنبوة ودعوة الحق الی الحق وهو قوله: وذكروا الله كثيرا (ورابعها) ان لا يذكروا هجوا احد الا علی سبيل الانتصار ممن يهجوهم وهو قوله: وانتصروا من بعد ما ظلموا ''70

(ب) قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں:

قال اكثر المفسرين اراد به شعراء الكفار الذين يهجون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

پھر ان شعراء کے نام لکھے اور کہا۔

فتكلموا بالكذب والباطل وقالوا نحن نقول مثل ما يقول محمد۔71

پھر چند احادیث سے استشہاد کیا اور آخر یہ کہا:

ثبت من هذه الاحاديث ان الشعر لا باس به ما اجتنب الكذب واشباهه من المحرمات۔

مزید فرمایا۔

الشعر طاعة ان كان فيه ذكر الله او علما من علوم الدين او نصحاً ووعظاً للمسلمين۔72

قاضی صاحب کا نقطہ نظر ہے کہ ان آیات سے کافر شاعر مراد ہیں جو اپنے اشعار کو رسول اللہ ﷺ کی تلاوت کی گئی آیات کے مشابہ سمجھتے تھے۔ احادیث سے

ثابت ہے کہ اگر شعر میں کذب وافتراء اور دیگر محرمات نہیں تو وہ مباح ہے بلکہ اگر شعر میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے علوم دین کی وضاحت یا مسلمانوں کے لئے نصیحت وخیر خواہی ہے تو وہ شعر سراپا اطاعت شعاری ہے۔

(ج) علامہ البیضاوی (م 791ھ) الم ترانهم فی كل واد يهيمون کی وضاحت میں رقمطراز ہیں "لان اكثر مقدماتهم خيالات لا حقيقة لها واغلب كلماتهم النسيب بالحرم والغزل والابتهار و تمزيق الاعراض والقدح فی الانساب والوعد الكاذب والافتخار الباطل ومدح من لا يستحقه والاطراء فيه ''۔73

باطل خیالات، صاحب حرمت خواتین سے تشبیب، غزل، ابتذال، عزتوں پر حملہ، انساب میں الزام، جھوٹے وعدے، بے جا افتخار اور ایسے کی مدح جو مدح کا حق دار نہیں اور اس میں مبالغہ آرائی یہ وہ خیالات فاسدہ ہیں جن کی بناء پر انہیں ہر وادی کا آوارہ خرام کہا گیا ہے۔

تشریحات مذکورہ سے واضح ہوا کہ آیات کا ہدف شعر نہیں مضمون شعر ہے۔ اسلام حسن ظاہر کو ناپسند نہیں کرتا مگر وہ داخلی حسن کا زیادہ متلاشی ہے کہ مقصود جوہر ذات ہے جس پر خارج کا ہیولہ مرتب ہوا ہے اگر شعر فی نفسہ قابل مذمت ہوتا تو اِلَّا الَّذِیْنَ کے بعد آیات نہ آتیں۔ اِلَّا کے استثناء نے مضامین شعر کی نسبت سے شعر کو محمود اور غیر محمود میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس لئے عمدہ خیالات اور بہتر تراکیب کا حامل شعر مرغوب ٹھہرا اور ایسے ہی شعر دربار رسالت میں باریاب ہوئے۔ علامہ ابن رشیق نے فیصلہ کن رائے دیتے ہوئے لکھا کہ ان آیات سے شعر کے خلاف حجت پکڑنا

گیا تھا، ایسے بدحواسی کے عالم میں وہ قرآن مجید کی پرتاثیر عبارت کو شعر کے سوا کہہ بھی کیا سکتے تھے، انسان اپنے دائرہ معلومات کے اندر ہی سوچتا ہے، عربوں کے ہاں کسی کلام کا نقطہ عروج شعر تھا اس لئے وہ قرآن مجید کو شعر اور رسول اللہ ﷺ کو شاعر کہہ کر اپنے طور پر ان کو مناسب مقام دے رہے تھے مگر خالق کا کلام اور علیم و خبیر پروردگار کا تعلیم یافتہ نبی ان کے اندازوں سے بہت بڑھ کر تھا شاعر کہہ کر نبی ﷺ اور شعر کہہ کر قرآن مجید کا مرتبہ گھٹاتا تھا (اگرچہ وہ شاید ارادی طور پر ایسا نہ کر رہے تھے) پھر جاہلی دور کے اثرات شعر کو وراثت میں ملے تھے۔ عرب ان اثرات کے حوالے سے ہی شعر کا مرتبہ متعین کرتے تھے ایسے میں قرآن مجید کو شعر اور آنحضرت ﷺ کو شاعر کہنا ان خصوصیات اور حدود کا پابند کرنا تھا جو شعر کے وجود کا حصہ بن چکے تھے اس لئے ضرورت تھی کہ ایسی سوچ کی نفی کر دی جائے تا کہ ماحول کے بداثرات آنے والوں کو بھی انہیں کے حوالے سے سوچنے پر مجبور نہ کر دیں۔ اس سیاق میں قرآنی ارشاد کی تفسیر کہے گئے الفاظ کا جائزہ حقیقت حال کی وضاحت کا سبب بنے گا۔

علامہ الرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بحث میں یہ نکتہ اٹھایا کہ آخر شعر کی ہی نفی کیوں کی گئی حالانکہ مشرکین تو آپ ﷺ کو ساحر اور کاہن (نعوذ باللہ) بھی تو کہتے تھے اور یہ صریحاً جسارت تھی، بے ادبی تھی مگر کیوں نہ فرمایا وَمَا عَلَّمْنٰهُ السِّحْرَ امام موصوف کے نزدیک قرآن، ذات رسالت مآب ﷺ کا سب سے بڑا اور ہمیشہ رہنے والا معجزہ تھا اس لئے ایسے معجزے کو روایات کے غبار میں گرد آلود کر دینا دین اسلام کی دائمی حیثیت پر ضرب لگانا تھا۔ معجزات کے وقتی اثرات ظاہر بین نظروں

کو ساحر نظر آئے تو فریب نظر ضرور ہے مگر یہ دائمی فساد کا باعث نہ تھا اس لئے اس کی تردید میں وہ شدت نہ تھی جو شعر کی نفی میں استعمال ہوئی کہ یہ دائمی اور ابدی خطرے کا الارم تھا فرماتے ہیں۔

"اما الشعر فکانوا ینسبونه الیه عندما کان یتلوا القرآن علیهم لکنه صلی الله علیه وآله وسلم ماکان یتحدی الا بالقرآن کما قال تعالیٰ: وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورة من مثله ۔الیٰ غیرذلك ولم یقل ان کنتم من شك من رسالتی فانطقوا الجذوع اواشبعوا الخلق العظیم او اخبروا الغیوب فلما کان تحدیه صلّی الله علیه وسلم بالکلام وکانوا ینسبونه الی الشعر عند الکلام خص الشعر بنفی التعلیم ۔78

حضور ﷺ کا چیلنج ہی یہ تھا کہ اگر تم اس نازل ہونے والی کتاب پر شک کرتے ہو تو اس کی مثل ایک سورت لاؤ۔ یہ تو نہ کہا تھا کہ اگر تم کو میری رسالت پر شک ہے تو درخت کے تنوں کو گویائی دو، بہت زیادہ مخلوق کو کھانا کھلا کر سیر کر دیا غیب کی خبریں بتاؤ۔ اس لئے کہ چیلنج کلام کا تھا اور وہ اس کلام کو شعر کہتے تھے اس لئے اس کی تعلیم کی نفی کی گئی۔

بعض مفسرین نے اس نفی تعلیم شعر سے یہ استنباط کیا کہ شعر جاہلی دور میں خواہشات نفسانی اور خیالات باطلہ کا موثر ترین ذریعہ تھا اور شعر بدی کے فروغ میں اہم کردار انجام دے رہا تھا اس لئے ذات رسول ﷺ کے لئے یہ وصف مناسب نہ تھا چنانچہ افصح العرب ہوتے ہوئے بھی آپ شعر گو نہ تھے۔ علامہ البیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے

کفی بالاسلام والشیب للمرء ناھیا۔

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ

انما قال الشاعر: کفی الشیب والاسلام لمرء ناھیا

مگر رسول اکرم ﷺ نے

کفی الاسلام والشیب للمرء ناھیا

ہی کہا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔

اشھد انک رسول اللہ ماعلمک الشعر وماینبغی لہ (85)

دوسری روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے العباس بن مرداس کا شعر پڑھا۔

اصبح نھبی ونھب العبید بین الاقرع وعیینۃ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا شاعر نے یوں نہیں کہا۔ فرمایا کیسے کہا تو حضرت ابوبکر صدیق نے پڑھا۔

اصبح نھبی ونھب العبید بین عیینۃ والاقرع

حضور ﷺ نے فرمایا۔

سواء مایضرک بدأت بالاقرع اوبعیینۃ فقال ابوبکر رضی اللہ عنہ بابی انت ماانت بشاعر ولاراویۃ ولاینبغی لک (86)

ان روایات سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ آپ ﷺ چونکہ شاعر نہ تھے اس لئے شعر بھی درست نہ پڑھتے تھے حالانکہ شاعر نہ ہونے سے یہ کبھی ثابت نہیں ہوتا کہ جو شاعر نہ ہو وہ شعر بھی درست نہ پڑھے۔ شعر درست نہ پڑھنا ایک عیب ہے اور

نبی اکرم ﷺ ہر عیب سے منزہ تھے اس لئے کہ شعر پڑھنے کی صلاحیت کی نفی افصح العرب ہونے کی بھی نفی ہوگی۔ شعر کے کلمات میں ردوبدل شعر پڑھنے کی صلاحیت کی نفی پر ہی نہیں ناپسندیدگی کلام پر بھی دلیل ہوسکتی ہے۔

کفی الشنیب والاسلام للمرء ناھیا

میں الشیب اور الاسلام کی ترتیب بدل کر آپ نے اول کو اولیت عطا کی ہے کہ منصب رسالت اور داعی اسلام ہونے کا یہی تقاضا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے الفاظ بھی شاعر ہونے یا راوی شعر ہونے کی نفی پر محمول ہیں۔ صلاحیت شعرخوانی کی تردید نہیں۔ اس کی دلیل وہ روایات ہیں جن میں آپ کا پورے شعر یا کم از کم ایک مصرعہ کا ادا فرمانا ثابت ہے اور یہ کہ آپ نے نہ صرف یہ کہ شعر کے مصرعہ کو ادا فرمایا بلکہ اس پر تبصرہ بھی فرمایا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اشعار سماعت فرمانا اور برمحل دعائیہ جملوں سے نوازنا حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے اشعار کو اسرع فیھم من نضح النبل کی قوت کا حامل قرار دینا۔ امیہ بن الصلت کے اشعار کا تقاضا کرنا، عنترۃ کے شعر پر شاعر کو ملنے کی خواہش کا اظہار کرنا۔ حضرت لبید رضی اللہ عنہ کے مصرعہ کو اشعر کلمۃ تکلمت بھا العرب کہہ کر سرفراز فرمانا۔ یہ دلیل ہے کہ آپ عربوں کے کلام سے آشنا تھا اس لئے تو بہتر قرار دینے کا اعلان کررہے ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ النابغۃ الجعدی، ابوجرول عامر بن الاکوع کے اشعاء پر تحسین شعرفہمی کے مظاہر ہیں حضرت کعب بن زھیر رضی اللہ عنہ کے مدحیہ شعر میں سے سیوف الھند کو سیوف اللہ سے بدلنا اور قصیدہ کی قدروقیمت میں اضافہ فرمانا، یہ تبدیلی ذوق ادبی اور شعرفہمی کی عمدہ ترین مثال ہے اور کلمات بدل کر بھی وزن

"ای ما علمناہ بتعلیم القرآن الشعر علی معنی ان القرآن لیس بشعر 91

علامہ البیضاوی فرماتے ہیں۔

قیل الضمیر للقرآن وما یصح للقرآن ان یکون شعرا 92

یعنی علمناہ میں ضمیر قرآن مجید کی طرف ہے کہ قرآن شعر نہیں۔ یہی بات قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر المظہری میں کہی۔93

صاحب روح المعانی کے نزدیک۔

اظهر القول بانه ضمیر له للقرآن المعلوم من السیاق 94

علامہ المراغی مزید وضاحت فرماتے ہیں۔

فالمراد من نفی تعلیمه الشعر نفی ان یکون القرآن شعرا لان اللہ علمه القرآن واذالم یکن المعلم شاعر الم یکن القرآن شعرا البتة وهذا ردقولهم ان القرآن شعروان محمداً شاعر 95

امام الزہری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔

انه قال معناہ ما الذی علمناہ شعر وما ینبغی له ان یبلغ منا شعرا 96

یعنی ہم نے آپ کو شعر سکھایا ہی نہیں تو جو وہ پہنچا رہے ہیں وہ شعر کیسے ہوا۔

ان روایات وتشریحات سے صاف ظاہر ہے کہ نفی تعلیم شعر کی اس حیثیت سے ہے کہ قرآن مجید کو شعر نہ سمجھا جائے۔ قرآن مجید شعر نہیں اور اللہ تعالی نے اپنے

نبی ﷺ کو قرآن تعلیم کیا ہے شعر نہیں۔ آپ کے مقام بلند کے لئے یہ مناسب بھی نہ تھا کہ آپ کو شعراء کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا۔ یہ اندازِ تردید آپ کی عظمت اور قرآن مجید کی تنزیلی حیثیت پر دال ہے لیکن اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ شعر فی نفسہٖ معتوب ہے اور یہ بھی نہیں کہ شعر فہمی معیوب ہے اور یہ کہ لسان رسالت سے اس کی ادائیگی ممنوع ہے نفی کا مرکز یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات کو شاعرانہ خیال کا حوالہ دے کر صرف ذوق ادبی کی چیز نہ بنا دیا جائے۔ یقیناً قرآن مجید کی زبان، اسلوب اور لہجہ پرتاثیر اور دلکش ہے۔ اس میں شعر سے کہیں زیادہ جذب کی قوت ہے مگر یہ اس کا ایک پہلو ہے اصل مقصد تعلیم ہدایت ہے جو ان الفاظ میں ودیعت ہے۔ قرآن مجید کا اصرار ہے کہ اسے شعر کی سطح پر رکھ کر صرف حظ اٹھانے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ کیونکہ جس دور میں قرآن مجید اپنی ابدی تعلیمات واضح کر رہا تھا اس دور میں شعراء کی پریشان خیالی عام تھی۔ علامہ المراغی نے اسی خدشے کا حوالہ دیا ہے کہ شعراء کی خام خیالی اس واضح مربوط اور مستحکم تعلیم پر اثر انداز نہ ہو سکے اسلئے برملا تردید کی گئی کہ تلازمہ خیال راستہ نہ روکے۔

ان وضاحتوں سے مقصود یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا شاعر نہ ہونا یہ دلیل نہ بن جائے کہ شعر مذموم فی الذات ہے۔ شعر کی عظمت و رفعت کا اندازہ اس کے مضامین سے لگایا جائے گا۔ درست اور صادق جذبات پر مشتمل اشعار اسلامی معاشرے میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ ماھو بقول شاعر قلیلا ما تومنون (الحاقۃ:41) سے بھی یہی مراد ہے کہ قرآن کسی شاعر کے خیالات کا عکس یا جذبات کا پرتو نہیں جن کی استقامت حتمی اور لازمی نہیں یہ تو رب العالمین کا کلام ہے جس کے مقابلے میں مخلوق کا کلام خواہ کیسا ہی عمدہ اور اثر آفرین ہو کیسے لایا جا سکتا ہے؟

احادیث کے بارے میں چندگزارشات:

شعر اور روایت شعر کی تردید میں عموماً یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب کسی شاعر کو بے تحاشا پڑھتے دیکھا تو نفرت کا اظہار فرمایا۔ شیطان کہا اور

لان یمتلی جوف رجل قیحاً خیر له من ان یمتلی شعراً

کہ آدمی کا پیٹ پیپ سے بھر جائے تو اس سے بہتر ہے کہ شعر سے بھرا ہو ارشاد فرما کر شعر سے اجتناب کی ترغیب دی۔ یہ حدیث معمولی اختلاف لفظی کے ساتھ البخاری مسلم الترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ میں موجود ہے بعض روایات میں قیحاً کے بعد حتی یریہ کا اضافہ بھی ہے۔ حدیث کے الفاظ اور شدت تردید کے انداز سے عیاں ہے کہ وہ کوئی غیر مسلم شاعر تھا۔ امام النووی لکھتے ہیں۔

واما تسمیة هذا الرجل الذی سمعه ینشد شیطاناً فلعله کان کافرا او کان الشعر هو الغالب علیه او کان شعره هذا من المذموم 97

شیطان کہہ کر گنہگار سے گنہگار انسان کو پکارنا لسان نبوت سے متوقع نہیں۔ یمتلی کے اشارے نے واضح کر دیا کہ شعر ہی مقصود تھا اور یہی کائنات تھی اس میں خارج ہوجانے کا بھی مفہوم ہے وگرنہ فساد کا سبب بنے گا اور اس سے شعری مواد کے ناقص اور غیر محمود ہونے کی طرف اشارہ بھی ہے۔ علامہ ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ وضاحت فرماتے ہیں۔

لکن وجهه عندی ان یمتلی قلبه من الشعر حتی یغلب علیه فیشغله عن القرآن وذکر الله فیکون الغالب علیه فاما اذا کان القران

والعلم الغالبین علیه فلیس جوف ممتیلاً من الشعر 98

علامہ بدرالدین العینی (م 855ھ) رقم طراز ہیں۔

توخذ من معناه لان امتلاء الجوف بالشعر کنایة عن کثرة الاشتغال به 99

امام البخاری رحمۃ اللہ علیہ۔ (م 256ھ) نے باب کے نام سے ہی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔

باب مایکره ان یکون الغالب علی الانسان الشعر حتی یصده عن ذکر الله والعلم والقرآن 100

امام النووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ شعر سب حسنات کے لئے سد راہ نہ بن جائے کہ وہ قبضہ جمالے وگرنہ جہاں تک عمومی شعری حالت ہے تو فیصلہ یہ ہے:

وقال العلماء کافة هو مباح مالم یکن فیه فحش ونحو قالوا وهو کلام حسنه حسن وقبیحه قبیح وهذا هو الصواب۔

پھر رسول اکرم ﷺ کی سماعت کے حوالے دیئے ہیں اور استثناء کیا ہے 101

ابن رشیق کہتے ہیں۔ ”مذمت شعر کے غلبے کی ہے کہ دین کے فرائض اور ذکر اللہ سے طبیعت منقطع رہے وگرنہ شعر کے جواز پر کوئی قید نہیں۔“102

ان اقتباسات سے واضح ہوا کہ تردید اس کیفیت کی ہے کہ شعر انسانی قلب وذہن پر یوں مستولی ہوجائے کہ اسے دین ودنیا کے دیگر ضروری معاملات سے بے خبر کر دے۔ دینی فرائض سے کوتاہی اور معاملات ضروریہ سے اغماض ہونے

لگے تو بیشتر مباح اعمال بھی قابل مذمت ٹھہرتے ہیں۔ صرف شعر پر ہی کیا منحصر ہے۔ عرب ماحول میں اس قدر غلو قرین امکان تھا اس لئے اس کی سخت لہجے میں تردید کی گئی مگر اس سے شعر کی نہیں غلو الشعر کی نفی مقصود تھی اسلام دین اعتدال ہے افراط وتفریط کا ہر عمل اسلامی تعلیمات سے انحراف ہے اس لئے شعر ہی نہیں ہر فعل میں راہ اعتدال ہی مناسب اور قابل قبول ہے۔ بعض روایات میں آخر پر ایک جملے کا اضافہ ہے جیسا کہ الطبقات الشافعیہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے "ھجیت بہ" کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ اس سے بعض شارحین نے یہ استخراج کیا کہ مذمت ایسے اشعار کی ہوئی جن میں آنحضرت ﷺ کی ہجو کی گئی۔ اس طرح یہ احادیث خاص ماحول اور مخصوص حالات کی نشاندہی کرتی ہیں اور یہ کہ یہ تردید عمومی نوعیت کی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ توضیح ہمارے موقف کی تائید کرتی ہے مگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس سے جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے وہ اپنے مفاہیم میں مبنی برصداقت نہیں ہوتا، رسول اللہ ﷺ کی ہجو کی مذمت کے لئے امتلاء کی قید غیر ضروری ہے۔ ہجو رسول ﷺ کے ضمن میں کہا گیا کہ ایک شعر یا ایک مصرعہ بھی قابل گرفت اور لائق مذمت ہے اس میں کمیت کا کچھ اعتبار نہیں۔

علامہ الآلوسی نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ۔

فان الکثیر والقلیل ممافیہ فحش اوھجو لسید الخلق صلی اللہ علیہ وسلم سوا۔ 103

علامہ ابن حجر العسقلانی فرماتے ہیں۔

لان ماھجی بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کان شطر بیت لکان کفرا 104

یہی رائے امام النووی (م 676ھ) کی ہے فرماتے ہیں۔

وقد اجمع المسلمون علی ان الکلمۃ الواحدۃ من ھجاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم موجبۃ الکفر 105

ثابت ہوا کہ ھجیت بہ سے اس تردید شعر کو مخصوص کرنا ممکن نہیں اس لئے یہی توجیہ مناسب ہے کہ اس میں غلو شعر اور کثرت روایت شعر کی مذمت بیان ہوئی ہے شعر پوری زندگی کو محیط نہیں اس کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔

بعض اوقات شعر کی تردید میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے کہ اسے غیر شرعی عمل قرار دیتے ہوئے اسے ایسا گناہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ جسے کم از کم مسجد میں نہ ہونا چاہیے۔ موافق روایات کے جزو' کی بحث میں اس پر تفصیلی تبصرہ کیا جا چکا ایک بحث یہ بھی ہے کہ شعر خوانی میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے یہ بحث دراصل اسی خیال کا حصہ ہے کہ شعر معتوب ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے۔ ڈاکٹر زکی مبارک نے اس سلسلے میں علماء ازھر کے مختلف خیال ہونے کا تذکرہ کیا ہے کہ امر یہ خطیر نہیں جس پر بسم اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وھذا کلہ اثر الحملۃ التی وجھت الی الشعر والشعرا 106

ابوجعفر النحاس (م 332ھ) نے بھی اس اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ

اکتب بسم اللہ الرحمن الرحیم امام الشعر 107

تمام مخالف روایات کی نفی کے لئے کافی ہے۔

ایک اور تردیدی بحث وہ روایت ہے جس میں جاہلی شاعر امرء القیس کی نسبت قیادتِ دوزخ کی وعید ہے۔ مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امراء القیس صاحب لواء الشعراء الی النار 108

خطیب بغدادی (م 463ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے امراء القیس کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

یجیی یوم القیامۃ معہ لواء الشعر یقودھم الی النار 109

کہ وہ قیامت کے روز شعراء کا علمبردار بن کر ان کی دوزخ کی طرف قیادت کرتا ہوا آئے گا۔ امرء القیس کے بارے میں اس ارشاد کو شعر کی مذمت کے لئے بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو شعر پر ہی جنت کی بشارت مل چکی ہے۔ یہ نفرت (اس روایت پر بھی پورا اعتماد نہیں کیا جاسکتا) دراصل امرء القیس کے باطل نظریات اور فاسد خیالات کا نتیجہ ہے اس سے تو بقول ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی فنی و ادبی تخلیق کی اہمیت اور قدر و قیمت اس کے فنی و ادبی حسن ہی سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کے مضامین اور معانی کی حیات بخشی اور حیات افروزی کی خاصیت سے متعین ہوتی ہے 110

اس سلسلے میں علماء کے متعدد اقوال نقل ہوئے ہیں بعض نے اسے رفث القول کہا تو بعض نے شعر پڑھنے پر وضو ٹوٹنے کا حکم لگایا جس پر علامہ ابن سیرین نے عملاً تردید کی کہ شعر پڑھا اور نماز کی امامت شروع کردی 111

حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سے شعر سے پہلے بسم اللہ تحریر کرنے کی

کراہت کا ذکر بھی موجود ہے مگر انہیں سے یہ بھی روایت ہے کہ عراق کے کچھ لوگوں نے کراہت شعر کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا۔

نسکوا نسکا اعجمیا 112

کہ عجمی طریق پر چلے۔

علامہ بدرالدین العینی نے عمدۃ القاری میں امام ابوجعفر الطحاوی کا طویل اقتباس نقل کیا ہے جس میں مخالفین شعر اور مجوزین کی ایک معتبر فہرست دی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمہ امت کی کثیر تعداد کا جواز شعر پر حتمی فیصلہ نقل کیا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ شعر ھجو، بے ہودگی اور عزتوں کی پامالی کا باعث نہ ہو۔ 113

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام اور ائمہ عظام کی کثرت جواز شعر کی قائل ہے اور جن علماء اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے مذمت شعر کے سلسلے میں کچھ روایت ہوا ہے وہ بھی شعر کے عمومی رویے کے بارے میں نہیں شعر کے مضامین کی نسبت سے ہے کہ برے خیالات جب شعر کا دامن اوڑھتے ہیں تو اپنے اثرات میں کئی گنا شدید ہوجاتے ہیں۔ اسی لئے شعر جیسا تیز آلہ کسی بدکردار اور بداعمال کے ہاتھ آجائے تو خطرہ بھی بہت ہوتا ہے کہ کہیں وہ اپنی اس صلاحیت سے معاشرے میں بدی کو پھیلنے کے مواقع فراہم نہ کردے۔ کاٹ دار شعر کو تو خود حضور ﷺ نے تیر سے زیادہ مہلک قرار دیا ہے۔ شعر گوئی کی کثرت کو اس لئے بھی روکا گیا کہ شعر اپنے اسلوب میں نثر سے مختلف ہونے کی بناء پر قوت فکر کا متقاضی ہے۔ شعر فہمی بھی ایک صلاحیت چاہتی ہے مگر عوام الناس میں یہ قوت نہیں ہوتی اس لئے مغالطے پیدا ہونے کا امکان بھی ہوتا ہے۔ پھر شعر تشبیہات واستعارات کے ذریعے سے حقائق بیان کرتا ہے جبکہ

سامعین اور قارئین کی بہت بڑی تعداد ان کی تفہیم کی صلاحیت نہیں رکھتی، مجاز سے حقیقت تک کا سفر شعر کو مشکل بنا دیتا ہے اور عین ممکن ہوتا ہے کہ قاری، شاعر کے ساتھ چلنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو اور اپنے ناقص خیالات کو شاعر کے الفاظ میں تلاش کرنے لگے۔ ان مشکلات کی وجہ سے شعر کے استعمال میں احتیاط کا درس دیا گیا کہ بعض اشعار اچھے خیالات اور پاکیزہ نظریات پر مبنی ہونے کے باوصف اچھے اثرات مرتب نہیں کرتے اسی لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے واعظین کے لئے کثرت شعر کو نامناسب قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ عوام جن کے اندر خواہشات کا ہنگام بپا ہوتا ہے اور جن کے دلوں میں حسن و جمال کی نازک صورت گری بھی نہیں ہوتی وہ جب عشق و محبت کے اشعار سنتے ہیں تو ان کے اندر کا سفلہ پن اور جذبہ شہوت بیدار ہو جاتا ہے اس طرح فساد برپا ہوتا ہے۔114

مگر امام موصوف خواص کی محفل میں شعر خوانی کی اجازت دیتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ شعر کے مضامین عمدہ ہوں، محل شعر مناسب ہو اور سامعین باصلاحیت ہوں تو شعر پڑھا اور سنا جا سکتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ شعر فی نفسہٖ اسلام کی نظر میں مردود نہیں بلکہ اسلام اسے ایک بہتر انداز تکلم اور عمدہ اسلوب کلام کے طور پر تسلیم کرتا ہے مگر جیسے اسلام ہر معاملے میں

خذ ما صفا و دع ما کدر۔

جو بہتر ہے لے لو اور جو گندہ ہے اسے چھوڑ دو

کا داعی ہے، شعر میں بھی اسی معیار کو برقرار رکھنا چاہتا ہے تا کہ اس موہبت سے عمدہ نتائج نکلیں اور معاشرتی حسن کی افزائش ہو۔ ڈاکٹر شوقی ضیف نے سچ کہا تھا

فالقرآن لم یہاجم الشعر من حیث ھو الشعر 115

کہ قرآن مجید نے شعر پر بحیثیت شعر کوئی حملہ نہیں کیا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مذمت شعر کی بعض روایات کی اسناد قابل اعتماد نہیں ہیں۔

امام ابن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ (م 310ھ) نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کہ

"الشعر مزامیر الشیطان"

اور حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کہ۔

انہ تمثل باوّل بیت شعر ثم سکت فقیل لہ فقال اخاف ان اجد فی صحیفتی شعرا

شعر کے بیت اول کا حوالہ دیا پھر خاموش ہو گئے پوچھا گیا تو کہا کہ میں ڈرتا ہوں کہ میرے صحیفہ میں شعر آئے۔

اور یہ کہ شیطان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا۔

قرانك الشعر

شعر تیرا قرآن ہے

کو غیر ثقہ قرار دیا بلکہ کہا

بانہا اخبار واھیة۔ 116

کہ یہ داہی باتیں ہیں

یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان سے لیکر آج تک مسلم دنیا میں شعر ایک زندہ قوت ہے۔ شعراء کی طویل فہرست اس صنف ادب کی طرف متوجہ اور اس کی خدمت کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ اس فہرست میں صحابہ کرام، ائمہ عظام، فقہاء ذی احتشام،

مفسرین ومحدثین غرضیکہ عالم اسلام کی تمام برگزیدہ ہستیاں شامل ہیں۔اور ان میں بیشتر علماء کے دیوان موجود ہیں۔مگر ہر صاحب ایمان اور اہل علم و دانش اس میدان میں احتیاط سے قدم اٹھاتا رہا ہے کہ تردید روایات کا پہرہ بہر صورت موجود رہا ہے۔ زبان کے لئے احتیاط کا حکم تو نثر میں بھی ہے اور نظم میں بھی مگر نظم میں یہ خیال دلیر بناتا رہا کہ شاعر کو وہ کچھ کہنے کی بھی اجازت ہے جو نثر نگار کہنے کا مجاز نہیں۔ضرورتِ شعری جب اسلوب سے مضامین شعر تک ممتد ہوتی ہے تو شاعر حدود معاشرت اور پابندی شریعت سے قدم باہر نکالنے لگتا ہے۔پھر یہ کہ لفظوں پر ماہرانہ دسترس نہ ہو تو خیال کا لبادہ بدنما صورت لیتا ہے،غیر محتاط الفاظ،غیر سنجیدہ اظہار اور غیر متعین خیالات بدی کو خوشنما بنا کر معاشرتی فساد کے محرک بنتے ہیں۔خیال پر شرافت کا سایہ نہ ہو،اسلوب پر آداب کا گھیرا نہ ہو اور کلمات پر اخذ و اختیار کے ضابطے نہ کسے جائیں تو نتیجہ غیر محمود نکلتا ہے۔تاریخ انسانی کا طویل دورانیہ شاہد ہے کہ اس صلاحیت کو جنس فروخت بنایا جاتا رہا،حرفوں کے کشکول ہر صاحب اختیار و دولت کے سامنے پیش کئے گئے،بدکرداری مزین ہوتی رہی۔بدفطرتی شعر کی پناہ میں سماج کو مسموم کرتی رہی، شاعر ہونے کا فخر ہر تہذیبی رویہ کا رہزن بنا،جاہلی دور کا شاعر تو عزتوں سے کھیلتا تھا، تہذیبی منافقت کے دور میں عزت و ناموس بھی پامال ہوا اور بے گناہی بھی لائق تعزیر ٹھہری،نااہل کے ہاتھ میں تلوار ہلاکت کا باعث ہوتی ہے اور شعر تلوار سے زیادہ گھاؤ ڈالتا ہے۔اس لئے اسلامی تعلیمات میں اسے پابند آداب بنایا گیا،رسول اکرم ﷺ نے عمدہ شعر کی تحسین فرما کر شعر کی حلت کا اعلان کیا تو بدترین اشعار پر گرفت فرما کر اس کی شیطنیت کو لگام دی اس لئے ایک متوازن راستہ دریافت ہوا۔حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا یہ

ارشاد کہ شعر کو جھوٹ زینت دیتا ہے اور اسلام جھوٹ کی اجازت نہیں دیتا۔جاہلی شاعری کے رویوں کی نشاندہی کرتا ہے۔شعر دل کی آواز ہو،عصمت آدم کا محافظ ہو،فروغ حسنات کا ذریعہ ہو اور معاشرتی بہبود کا محرک ہو تو موہبت ہے،سرفرازی ہے۔اور اگر شعر خواہشات کا غلام،بدفطرتی کا عکاس اور سماجی اضطراب کا موید ہو تو لائق نفرت ہے۔مسلمان امت کی خوش قسمتی ہے کہ نعت کی شکل میں شعری احساس کا نورانی پیکر اسے نصیب ہوا ہے کہ جہاں صلاحیت فن کا اہتمام بھی ہوتا ہے اور لائق مذمت رویوں سے اجتناب کی راہ بھی نکلتی ہے کہ شعر تو انداز اظہار ہے۔

"حسنہ حسن وقبیحہ قبیح"

حواشی

1 محیط الدائرہ ص:3

2 العمدہ الجزء الاول ص 77_80

3 حوالہ مذکورہ ص:74

4 المفردات فی غریب القرآن مادہ شعر ص 262

5 العقد، الفرید لابن عبدربہ الجزء الثالث ص:413

6 A Literary History of the Arabs ص:72

7 تمدن عرب ڈاکٹر لی بان اردو ترجمہ ص:494

8 جامع الترمذی المجلد الثانی:126۔ سنن ابی داود المجلد الثانی ص:684 سنن ابن المجلد ماجۃ الثانی: ص:274۔ تاریخ بغداد جلد 3 ص 98

9 جامع الترمذی المجلد الثانی ص 126۔عن ابن عباس سنن ابن ماجہ المجلد الثانی ص275

10 سنن ابی داؤد المجلد الثانی ص 684 عن ابن عباس۔طبقات الشافعیۃ الکبری الجزء الاول ص:116

11 مشکوۃ المصابیح۔کتاب الاداب باب البیان والشعر الفصل الثالث ص410۔411

12 العمدۃ الجزء الاول ص9

13 صحیح البخاری الجلد الاول باب الشعر فی المسجد ص:64۔65

14 یہ روایت مسلم باب فضائل حسان رضی اللہ عنہ میں ہے کہ عن البراء بن عازب قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اھجھم واحاجھم وجبریل معک اور صحیح البخاری الجلد الثانی ص591

15 صحیح مسلم المجلد الثانی باب فضائل حسان رضی اللہ عنہ ص300۔301

16 جامع الترمذی المجلد الثانی ص 126۔سنن نسائی الجلد الثانی باب انشاد الشعر فی الحرم ص29

17 صحیح مسلم المجلد الثانی کتاب الشعر ص939۔طبقات الشافعیۃ الکبری الجزء الاول ص118

18 الموازنہ بین الشعراء زکی مبارک ص25

19 اسد الغابۃ الجزء الثالث ص39

20 صحیح البخاری المجلد الاول کتاب المناقب ص500

21 صحیح مسلم الجلد الثانی کتاب الفضائل ص:300

22 جامع الترمذی الجلد الثانی باب ماجاء فی انشاد الشعر ص126۔سنن ابی داؤد الجلد الثانی باب ماجاء فی الشعر ص684

23 صحیح البخاری المجلد الاول ص456۔سنن النسائی المجلد الاول باب الرخصۃ فی انشاد الشعر ص118

24 صحیح البخاری المجلد الثانی ص 597۔المجلد الاول ص:500

25 کتاب الاغانی المجلد الثانی ص

26 جامع الترمذی المجلد الثانی باب ماجاء فی انشاد الشعر ص:126

27 دیوان حسان شرح البرقوقی ص8

28 طبقات الشافعیۃ الکبری الجزء الاول ص 121۔الاصابہ الجزء الثالث ص279

29 العمدہ الجزء الاول ص7

30 الاستیعاب الجلد الاول ص 161۔الملل والنحل الجزء الثالث ص289 حاشیہ

31 الاستیعاب الجلد الاول ص310۔311۔یہ روایت الاصابۃ الجزء الثالث ص 509۔510 اسد الغابۃ الجزء الخامس ص 3 اور کئی دیگر مصادر میں موجود ہے۔

32 طبقات ابن سعد الجزء الثالث ص527

33 طبقات الشافعیۃ الکبری الجزء الاول ص128۔الاستیعاب الجلد الاول ص199 تاریخ بغداد المجلد السابع ص106

34 صحیح البخاری المجلد الاول کتاب الصلوٰۃ ص61

35 طبقات ابن سعد الجزء الاول ص 71 تاریخ بغداد المجلد الرابع ص: 271

36 جامع الترمذی الجزء الاول ص126

37 صحیح البخاری المجلد الاول کتاب الجھاد ص427

38 صحیح البخاری المجلد الاول باب ھجرۃ النبی واصحابہ الی المدینۃ ص555

39 اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 15 ص 529 مقالہ فن شعر وشاعری۔

40 العمدہ الجزء الاول ص10

41 العمدۃ الجزء الازل ص11

42 العقد الفرید الجزء الاول ص90

44 العمدہ الجزء الاول ص16

45 ایضاً ص15

46 ابجد العلوم ص309

47 العقد الفرید الجزء الثالث ص388

48 ابجد العلوم ص208

49 الموازنۃ بین الشعراء زکی مبارک ص28

50 سنن ابن ماجہ الجزء الثانی باب الحکمۃ ص317

51 مراۃ الشعر، عبدالرحمن ص65_66

52 احیاعلوم الدین، الجزء الثانی ص270_271

53 ابجد العلوم ص208

54 مراۃ الشعر ص66

55 الشعراء 224_227

56 یٰسن 69

57 الحاقۃ 41

58 الحاقۃ 43

59 صحیح البخاری المجلد الثانی کتاب الاداب ص909

60 صحیح مسلم المجلد الثانی کتاب الشعر ص240

61 سنن ابن ماجہ الجلد الثانی باب، مایکرہ من الشعر ص:275

62 جامع الترمذی الجلد الثانی ابواب الاستیذان والاداب ص127

63 صحیح البخاری المجلد الثانی کتاب الاداب ص909

64 جامع الترمذی الجلد الثانی ابواب الاستیذان والاداب ص:127

65 سنن ابی داؤد الجلد الثانی باب ماجاء فی الشعر ص683

66 طبقات الشافعیۃ الکبری الجزء الاول ص120

67 حوالہ مذکورہ

68 حوالہ مذکورہ ص119

69 صحیح مسلم الجلد الثانی کتاب الشعر ص240

70 مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) الجزء السادس ص396

71 التفسیر المظھری المجلد الرابع ص89

72 التفسیر المظھری المجلد السابع ص92

73 انوار التنزیل واسرار التاویل (التفسیر البیضاوی) الجزء الثانی ص134

74 العمده الجزء الاول ص12

75 سنن ابی داؤد الجلد الثانی کتاب الادب باب ماجاء فی الشعر ص484

76 تفسیر القرآن العظیم ۔ لابن کثیر الجزء الثالث ص354

77 مشکوٰۃ المصابیح کتاب الاداب باب البیان والشعر الفصل الثانی ص410

78 مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) الجزء السابع ص110

79 انوار التنزیل واسرار التاویل (التفسیر البیضاوی) الجزء الثانی ص226

80 التفسیر المظہری الجزء الثانی ص9

81 الکشاف للزمخشری الجزء الثانی ص593

82 فتح الباری شرح البخاری الجزء العاشر ص411

83 الکشاف الجزء الثانی ص593

84 روح المعانی الآلوسی الجزء الثالث والعشرون ص45

85 طبقات ابن سعد الجزء الاول ص382_384

86 حوالہ مذکورہ

87 روح المعانی الجزء الثالث والعشرون ص43_44

88 حوالہ مذکورہ ص45

89 ابجد العلوم ص210

90 المواہب اللدنیۃ بحوالہ روح المعانی الجزء الثالث والعشرون ص44

91 الکشاف الجزء الثانی ص593

92 انوار التنزیل واسرار التاویل (التفسیر البیضاوی) الجزء الثانی ص226

93 المظہری المجلد الثانی ص97

94 روح المعانی الجزء الثالث والعشرون ص45

95 المراغی الجزء الثالث والعشرون ص31

96 العمده الجزء الاول ص6

97 صحیح مسلم المجلد الثانی کتاب الشعر ص240 حاشیہ شرح النووی

98 فتح الباری شرح البخاری الجزء العاشر ص418

99 عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری الجزء الثانی والعشرون ص188

100 صحیح البخاری المجلد الثانی کتاب الادب ص909

101 صحیح مسلم المجلد الثانی کتاب الشعر حاشیہ شرح النووی ص240

102 العمده الجزء الاول ص12

103 روح المعانی الجزء التاسع عشر ص136

104 فتح الباری شرح البخاری الجزء العاشر ص418

105 صحیح مسلم المجلد الثانی کتاب الشعر ص240 حاشیہ شرح النووی

106 الموازنہ بین الشعراء ص29

107 العمده الجزء الثانی ص237

108 طبقات الشافعیۃ الکبری الجزء الاول ص119

109 تاریخ بغداد المجلد الثانی 374

110 ادب کا اسلامی نظریہ ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی ص23_24

111 الموازنہ بین الشعراء ڈاکٹر زکی مبارک ص28

112 حوالہ مذکورہ
113 عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری الجزء الثانی والعشرون ص 189
114 دیکھئے تفصیل۔ احیاء علوم الدین الجزء الاول ص 42
115 تاریخ الادب العربی (4) العصر الالوی ص 34
116 فتح الباری شرح صحیح البخاری الجزء العاشر ص 310۔311

رسول اللہ ﷺ کا نظام تعلیم

رسول اکرم ﷺ نے ایسا نظام تعلیم پیش کیا جس میں تدبیر منزل سے لے کر سیاست مدن تک کے لئے راہنمائی موجود ہے، دنیاوی واُخروی کامرانیوں کے لئے مکمل اور جامع اصول وضوابط ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے اس محبت اور محنت سے اسے نافذ فرمایا کہ چند ہی سالوں میں اس کے اثرات محسوس ہونے لگے آج بھی اس میں انسانیت کے لئے بے مثال راہنمائی موجود ہے۔ ہمیں یہ جائزہ لینا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو نظام تعلیم مرتب فرمایا اُس کے بنیادی اوصاف کیا ہیں اور آپ نے کون سے طریقے اپنائے کہ یہ نظام مطلوبہ نتائج پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد تعلیم امت ہے۔ قرآن پاک آپ کی بعثت کا تعارف یوں کراتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (الجمعۃ:2)

”وہ ذات جس نے ان پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا کہ وہ ان پر اُس کی آیات پڑھتے ہیں اور اُنہیں پاک کرتے ہیں اور اُنہیں کتاب وحکمت کا علم عطا فرماتے ہیں اور بے شک وہ اس سے پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے۔“

اس ارشاد ربانی میں نبوت کے چار بنیادی فرائض کا ذکر ہے۔ ”تلاوت آیات“ ”تزکیہ نفوس“، ”تعلیم کتاب“ اور ”تعلیم حکمت“ انہیں چار عناصر پر اسلامی نظام تعلیم

کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ یہاں یہ بات خوب یاد رہے کہ اسلامی نظام تعلیم پیش کرنی والی ہستی ایک معلم کی ہے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ اکثر نظام ہائے تعلیم انتظامیہ کی سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں اور نظام تعلیم کے نفاذ کی ذمہ داری اُن افراد کو سونپی جاتی ہے جن کا اس نظام کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ رسول اکرم ﷺ کا نظام تعلیم ایک معلم کا وضع کردہ نظام تعلیم ہے جسے واضع نے عملی طور پر خود نافذ کر دکھایا اس لئے اس نظام تعلیم میں تھیوری اور پریکٹس کی وہ ثنویت پیدا نہ ہوئی جو دیگر نظاموں کا ایک بنیادی نقص ہے۔ آنحضرت ﷺ نے نظام تعلیم کا ایک مضبوط ڈھانچہ فراہم کیا۔ خود عملی میدان میں اس کا نفاذ فرمایا اور ایک پریکٹسنگ ٹیچر کی حیثیت سے اس پر عمل کر کے دکھایا۔

کسی ''نظام تعلیم'' کے بارے میں گفتگو سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ اس نظام تعلیم کا علم کے بارے میں رویہ کیا ہے۔ یہ حقیقت تو محتاج تعارف نہیں ہے کہ ''علم'' کا حصول ایک نیک مقصد ہے۔ ہر قوم و ملت میں علم و آگہی کو شرف حاصل رہا ہے۔ مگر رسول اکرم ﷺ کے نظام تعلیم کا بنیادی وصف علم کی فرضیت ہے۔ اکثر نظاموں میں حصول علم کی حیثیت اختیاری رہی ہے۔ اسلام کے ہاں یہ اختیاری نہیں لازمی ہے۔ علم کا حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے جو اسلامی معاشرے میں زندگی گزار رہا ہے۔ قرآن پاک کا حکم ہے۔

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل:43)

اے لوگو! علم والوں سے دریافت کرو اگر تمہیں علم نہیں ہے۔

حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واضح ارشاد ہے۔

طَلَبُ العلمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ مقدمۃ)

علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

علم اور حاملین علم کی عظمت کا اظہار فرماتے ہوئے قرآن ارشاد فرماتا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر:9)

آپ فرما دیں کیا برابر ہیں جاننے والے اور انجان۔

آخرت کی زندگی میں علم کی عظمت کا یوں اظہار فرمایا۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (المجادلہ:11)

اللہ تم میں سے ایمان والوں کے اور جن کو علم دیا گیا درجے بلند فرمائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ خیر رکھتا ہے جو تم کرتے ہو۔

علم کے ممکنہ اثرات میں خشیت الٰہی ہے جو مقصد حیات ہے قرآن مجید فرماتا ہے۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔ (الفاطر 28)

اللہ سے اُس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

تخلیق انسانی کے ساتھ اس کے گہرے ربط کا ذکر یوں فرمایا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (الرحمن:3)

''انسان کو اُس نے پیدا کیا اور بیان کی تعلیم دی۔''

ان ارشادات سے واضح ہو گیا کہ اسلامی تعلیمات میں علم کا حصول افراد کا ذوقی معاملہ نہیں بلکہ اس کا حاصل کرنا ہر فرد امت پر فرض ہے۔ معاشرے میں

عظمت و بزرگی کا معیار علم ہے افراد کی قدر منزلت کا تعین اسی کے حوالے سے کیا جائے گا اس لئے اس کے حصول کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ تمام افراد کے لئے اس کے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ سب کو طلب علم کی ترغیب دی جائے گی اور کوشش کی جائے گی کہ علم کا نور سب تک پہنچے۔

رسول اکرم ﷺ کے نظام تعلیم کا دوسرا بنیادی وصف یہ ہے کہ اس میں علم ایک امانت ہے جسے حاصل کرنا بھی فرض ہے اور دوسروں تک منتقل کرنا بھی فرض، علم کو منتقل نہ کرنا معاشرے کا ایک بھیانک جرم ہے جس کے بارے میں قرآن روز ازل کے حوالے سے یاد دلاتا ہے۔۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔ (ال عمران 187)

اور یاد کرو جب اللہ نے عہد لیا ان سے جنہیں کتاب عطا ہوئی کہ تم ضرور اسے لوگوں سے بیان کر دینا اور نہ چھپانا۔

علم ایک بہتا دریا ہے جس کے آگے بند باندھنا اسلام کے نزدیک غیر انسانی حرکت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے انسانی معاشرے کے اس نازک پہلو پر نہایت واضح ہدایات ارشاد فرمائی ہیں۔ کبھی پاکیزہ نفس لوگوں کو اس کی اہمیت کا یوں احساس دلایا۔

خیرکم من تَعَلّم القراٰنَ وعَلَّمَهٗ

(سنن ابن ماجہ: باب فضل من تعلم القران وعلمہ)

تم میں بہتر انسان وہ ہے جو قرآن کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور پھر اسے

دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

کہیں اس نیک عمل کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا۔

اَفْضَلُ الصدقة اَنْ یَتَعَلّم المرالمسلم عِلْمًا ثُمَّ یُعَلِّمه اَخاہ المسلم (سنن ابن ماجہ باب ثواب معلم الناس الخیر)

بہترین صدقہ یہ ہے کہ مسلمان علم سیکھے اور پھر اپنے مسلمان بھائی کو وہ علم سکھائے۔

کہیں لہجے میں وعید کا رنگ ابھر آیا اور تہدیدا فرمایا۔

مَنْ علّم عِلْمًا فکتمه الجمه اللّٰهُ یوم القیامة بلجام من النّار

من سئل عن علم یعلمه فکتمه الجم یوم القیامة بلجام من نار

(سنن ابن ماجہ باب من سئل عن علم فکتمہ)

یعنی جس سے ایسے علم کے بارے میں پوچھا گیا جو وہ جانتا تھا پھر اُس نے اُسے چھپالیا۔ وہ قیامت کے روز لوہے کی لگام ڈال دی جائے گی۔

ایک اور مقام پر فرمایا۔

مَن سُئل عن علم فکتمه اُلجم یوم القیامة بلجام من نار

(سنن ابن ماجہ، باب من سئل عن علم فکتمہ)

یعنی جس سے کسی علم کے بارے میں پوچھا گیا اور وہ اُسے چھپا گیا قیامت کے روز اُسے لوہے کی لگام ڈال دی جائے گی۔

ان روایات وارشادات سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے عطا کردہ نظام تعلیم میں علم کا حصول کوئی طبقاتی مسئلہ نہیں اور نہ ہی چند افراد کے لئے عظمت وجلال کے اظہار کا ذریعہ بلکہ یہ پورے معاشرے کا مشترک وصف ہے۔ علم

ایک مسلسل عمل ہے جسے نسل درنسل منتقل ہوتے رہنا ہے۔ یہ امانت ہے اوراس کا روکنا بدترین خیانت، ان ہدایات کی روشنی میں علم جلب زر کا ذریعہ نہیں تکمیل ذات کا سبب ہے۔ یہ قابل فروخت جنس نہیں لائق ہدیہ متاع ہے۔ اس کے دام نہیں چکائے جاسکتے بلکہ فرض سمجھ کر پھیلایا جاتا ہے۔ علم کا حصول اوراس کی تعلیم کاروبار نہیں بنیادی انسانی فریضہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اس نورانی تعلیم کے زیر اثر جہاں علم کے متلاشی کوہ وصحرا میں اس گوہر مراد کے جستجو میں سرگرداں رہے وہاں اس کے پہلو بہ پہلو اصحاب علم اسے امانت سمجھتے ہوئے دوسروں تک پہنچانے کے لئے بے چینی سے مواقع کی تلاش کرتے رہے دونوں طرف کی اس سچی تڑپ نے پورے معاشرے پر علم کی سطوت قائم کردی جس کے سامنے مال وزر کی حاکمیت دم توڑتی نظر آتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ نظام تعلیم کا تیسرا بنیادی وصف یہ ہے کہ اس کے مقاصد واضح ہیں۔ ہر قوم اور ہر معاشرے کا ایک نظریہ حیات ہوتا ہے جو دوسری اقوام کے نظریہ ہائے حیات سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح ہر قوم کا نظریہ تعلیم بھی دوسری اقوام سے مختلف ہوگا۔ یہ ممکن نہیں کہ مختلف الخیال اور متضاد نظریات کی حامل اقوام ایک جیسے نظریہ تعلیم کو اپنا سکیں۔ ایسا کرنے سے قوموں کا مابہ الامتیاز وصف مٹ جائے گا۔ اور کوئی قوم بحیثیت قوم زندہ نہ رہ سکے گی۔ قوم کو بحیثیت قوم زندہ رہنے کے لئے اپنے نظریہ حیات کے مطابق اپنا نظریہ تعلیم مرتب کرنا ہوتا ہے کیونکہ نظریہ تعلیم کا مقصد نظریہ حیات کی محبت کا فروغ ہے تا کہ اپنے نظریہ حیات کی محبت کو دوام اور مخالف نظریات کی محبت کو زوال نصیب ہو۔ تعلیم کے اس طرح دو پہلو ہیں مثبت اور منفی، مثبت یہ کہ اپنے نظریہ حیات کی محبت کی ترسیخ اور منفی یہ کہ ہر مخالف نظریہ زندگی کی

نفی اور بطلان۔ جب تک اپنے نظریہ زندگی پر کامل ایمان نہ ہوگا منفی رجحانات حملے کرتے رہیں گے اور جب تک اپنے نظریہ زندگی کی تعلیم کے لئے مناسب نظام تعلیم مرتب نہ کیا جائے گا لغزش قدم کا خطرہ ہر وقت موجود رہے گا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب تک اُسے تسکین حاصل نہ ہو وہ پادر ہوا رہتی ہے معمولی سے معمولی جھونکا بھی اُسے مقصد سے منحرف کرسکتا ہے جیسے عمدہ غذا حاصل نہ ہونے کی صورت میں وہ انسان جس کی اشتہا کو تسکین نصیب نہ ہو مجبوراً ہر ایسی غذا استعمال کر گزرے گا جس سے اس کی بھوک ختم ہو سکے اسی طرح جب کسی انسان کے دل ودماغ کو اپنے نظریہ زندگی سے سکون حاصل نہ ہو تو وہ سکون کی تلاش میں ہر باطل نظریے کو اپنانے لگتا ہے یہ مرحلہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ ایک مربوط اور مکمل نظام تعلیم کے بغیر اس ذہنی آوارگی اور قلبی پراگندگی کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ ان گزارشات کی روشنی میں قلب ونظر کے اُس عظیم انقلاب کو دیکھئے جو آج سے چودہ سو سال قبل حضور ختمی مرتب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے برپا کیا تو محسوس ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے تعلیم کے اس بنیادی پتھر کو کس عمدگی سے بنیاد ملت بنایا۔ آپ نے ایک نظریہ حیات پیش کیا اور اپنے قول وعمل سے اُس کی وضاحت فرمائی اور اس پر نظام تعلیم کی ایک فلک بوس عمارت تعمیر کی۔ آپ کی زندگی شاہد عادل ہے کہ آپ نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا اور ہر متلاشی حق کو ایمان وایقان کی دولت سے مالا مال کردیا۔ آج چودہ سو سال بعد بھی اُن طالبان حق وصداقت کے کردار کے سب پہلوؤں کا ظالمانہ تجزیہ کرنے کے باوجود کوئی اُن کے کردار کی پختگی اور نظریہ حیات سے لگن کو چیلنج نہ کرسکا اس راسخ العقیدگی کے بعد وہ متلاشیان علم حصول علم کے لئے دن رات سرگرداں رہے

اپنوں اور غیروں کے نظریات کا تجزیہ کرتے رہے مگر مرکز سے اُن کا ربط کبھی نہ ٹوٹ سکا۔ ہر نئی ایجاد اور ہر نئے انکشاف سے انہیں مزید استقامت حاصل ہوئی۔

تعلیم بذات خود نہ اچھی چیز ہے اور نہ بُری بلکہ یہ نظریات زندگی کی خادم ومعاون ہے اور یہ ہر نظریے کی خدمت واعانت یکساں جذبے سے کرتی ہے جب نظریہ زندگی صحیح ہوگا تو یہ اچھے نتائج پیدا کرے گی اور مستحسن قرار پائے گی اور جب نظریہ زندگی باطل ہوگا تو یہ بُرے نتائج پیدا کرکے خود بھی بدنام ہوگی۔ تعلیم کی خوبی یا خامی دراصل اُس نظریے کے حوالے سے دیکھی جاتی ہے جس کی ترویج کی یہ ذمہ داری قبول کرتی ہے آنحضرت ﷺ نے جہاں اِزدیادِ علم کے لئے ''رب زدنی علما'' کی دعائیں مانگیں وہاں اس کی نوعیت کا تعین کرتے ہوئے یہ دعا بھی آپ کی دعاؤں کا حصہ رہی۔ آپ اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے۔

اللھم انی اعوذبك من علم لا ینفع (سنن النسائی کی کتاب الاستعاذہ)

اے اللہ میں ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو نفع بخش نہیں ہے۔

علم نافع وہ علم ہے جو مقصدِ زندگی کے حصول میں معاون بنے اور جس سے اپنے نظریہ حیات کی محبت فزوں تر ہوجائے۔ اور علم غیر نافع وہ ہے جو مقصد حیات کو نظروں سے اوجھل کرنے کا سبب بنے۔ علم کی ایک شاخ ایک انسان کے حق میں علم نافع اور دوسرے کے لئے غیر نافع ہوسکتی ہے۔ علم طب، علم مفید ہے، انسانیت کے درد کی درمانی کے لئے اس کو حاصل کرنا مستحسن ہے اس صورت میں یہ علم نافع ہوگا لیکن لوگوں کی مشکلات اور مصائب سے فائدہ اٹھا کر جلبِ زر کے لئے اس کی تعلیم غیر نافع قرار پائے گی۔ اسی طرح سامان حرب وضرب کا علم نظریہ حیات کے دفاع کے لئے

مبارک اور قابل ستائش ہے مگر جب قوت کا مقصد دوسروں پر سطوت جمانا اور اُن کے حقوق کو پامال کرنا ہو تو یہ علم غیر نافع بلکہ شیطانی علم کہلائے گا۔

دیکھنا یہ ہوگا کہ نظام تعلیم میں مقصد کی وضاحت کیسے کی گئی ہے اور کہاں تک طلباء پر مقصد کی عظمت آشکارا ہوئی ہے۔ مستقبل میں طلباء کا کردار، نظام تعلیم کی افادیت یا مضرت رسانی کا صحیح پیمانہ ہوگا۔ اس نقطہ نظر سے جب ہم آنحضرت ﷺ کے نظام تعلیم پر غور کرتے ہیں تو ایک لمحے کے توقف کے بغیر پکار اٹھتے ہیں کہ آپ نے مقصد کو اسقدر مبرہن اور مجلی فرما دیا تھا کہ آپ کے تربیت یافتہ اصحاب میں ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ اس استعداد سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی شعوری کوشش کی گئی ہو۔ مکتب رسالت کے طلباء نے ہر ہر موقعہ پر اپنی اعلیٰ تربیت کا ثبوت دیا جس کے اپنے اور بیگانے سب معترف ہیں۔ یہ اُس نظام کی کامیابی کی نمایاں دلیل ہے۔

نظام تعلیم سے نصب العین اور مقصد حیات کی محبت نشوونما پاتی ہے اور طالب علم کے قلب ونظر میں یہ محبت اس قدر راسخ کردی جاتی ہے کہ کوئی غلط نظریہ اُسے گمراہ نہ کرسکے۔ ان مطلوبہ نتائج کے حصول تک کوئی غلط اور گمراہ کن نظریہ طالب علم تک پہنچنے نہیں دیا جاتا تاکہ یہ غلط نظریہ اُس کے ناپختہ ذہن میں وسوسوں کو راہ پانے کا موقع مہیا نہ کردے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس تورات کا تراشا لے کر آئے اور اُس کے مندرجات کا ذکر کیا تو باوجودیکہ تورات الہامی کتاب تھی اور اس میں ہدایت ونور کی موجودگی کا قرآن مجید نے اعتراف کیا تھا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خشمگیں نظروں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا اور فرمایا اے عمر تم تورات کی بات کرتے ہو سنو۔

لو کان مُوسیٰ حیًّا بین اظھر کم مَا حَلّ لہ اِلاّ آن یّتبِعَنِی

(مسند امام احمد)

اگر آج موسیٰ علیہ السلام بھی تمہارے سامنے زندہ ہوتے تو وہ بھی میری تعلیمات پر عمل کرتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بنیادی نقطہ سمجھا دیا کہ تعلیم صرف یہ نہیں کہ مقررہ اوقات تعلیم میں حاضری دے دی جائے۔ اور تعلیمی ماحول میں اپنی ذمہ داریاں نبھا کر یہ سمجھا جائے کہ فریضہ ختم ہو گیا ہے۔ نہیں بلکہ مدرسے کی فضا سے لیکر پورے معاشرتی ماحول تک ایسے عوامل بروئے کار لانے ہوں گے جن سے غیر نظریات کے اثرات کا ہر حملہ روکا جا سکے تا کہ فساد نظری کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے، اسلامی نظام حیات میں تعلیم ایک مسلسل عمل ہے۔ مھد سے لیکر لحد تک۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے اور اس میں جامعیت ہے۔ یہاں یہ خیال پریشان نہ کرے کہ اسلام طالب علم کو بسم اللہ کے گنبد میں بند رکھنا چاہتا ہے اور آزادانہ روش پر پہرے بٹھاتا ہے۔ اسلام کا یہ مقصد ہرگز نہیں۔ اسلام ترجیحات کا قائل ہے اور ہر عمل کا دائرہ کار متعین کرتا ہے۔ اس قدغن کا مقصد صرف یہ ہے کہ پہلے اپنے نظریہ حیات کی تعلیم کے تمام پہلوؤں پر اعتماد پیدا ہونا چاہیے۔ اسلامی تعلیمات کی حقانیت اور مقصد حیات سے الفت واضح نہ ہو تو خارجی تعلیمات فساد کا باعث بنیں گیں، اس طرح آپ نے یہ راہ سمجھا دی کہ دوران تعلیم، غلط تصورات سے طلباء کو بچانا اور اپنے نظریہ حیات کو راسخ کرنا لازمی ہے جب ایقان حاصل ہو جائے اور بھٹکنے کے خطرات معدوم ہو جائیں تو عام تعلیم اور دیگر نظریات کا مطالعہ مباح ہے بلکہ بعض اوقات ضروری ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بعد میں عبرانی سیکھنے کی ترغیب دی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نظام تعلیم کا چوتھا بنیادی وصف اس کی جامعیت

ہے۔ انسان کے وجود سے لیکر کائنات کے ذرے ذرے تک اس نظام تعلیم میں سب کو مناسب مقام دیا گیا ہے۔ قرآن پاک بار بار انفس و آفاق کے بارے میں تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس نظام میں خدا کی حاکمیت کے تصور کو اصل قرار دیا گیا اور پھر معاشرے کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہر جائز اور مستحسن ذریعہ اختیار کیا گیا اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ جسمانی و مادی علوم کی تعلیم کو ضروری قرار دیا گیا۔ قوموں کی امامت کے لئے روحانی بالیدگی کے ساتھ جسم کی صحت مندانہ نشوونما بھی لازم ٹھہری یہانتک کہ قرآن پاک نے جناب طالوت کی حاکمیت کے لئے اسے ایک دلیل کے طور پر استعمال کیا۔ ارشاد ہوا۔

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۔ (البقرہ:247)

یعنی جناب طالوت کو یہ اعلیٰ منصب اُن کی علم میں برتری اور جسمانی قوت کی بنا پر عطا کیا گیا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ علم کی بنیادی حیثیت کے باوجود جسم کی صحت اور قوت معاشرے میں بلندی مقام کے لئے شرط ہے۔ قرآن پاک مسلمانوں کو اولوالایدی والابصار کہہ کر متعارف کراتا ہے۔ یعنی صاحبان قوت ونظر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جسم کی حفاظت کے اصول ارشاد فرمائے۔ خوراک کے بارے میں واضح ہدایات دیں، ان تمام ہدایات پر غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ مسلمان دیگر انسانوں سے ممتاز تھے۔ روحانی طور پر بھی اور مادی طور پر بھی، اُن کی غذا سب سے الگ اور منتخب ہے۔ اس مادی عمل میں روحانی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ حلت وحرمت جائز و ناجائز، مستحسن و مکروہ کی تفریق سے اسلام مادہ اور روح کی یکساں ترقی کے سامان پیدا کرتا ہے۔ اُس کے ہاں روحانی عمل رہبانیت پر منتج نہیں ہوتا اور

مادی عمل حیوانی افعال کو جنم نہیں دیتا۔ اس نظام تعلیم نے روح اور مادہ دونوں کی ترقی کے مواقع پیدا کئے اور اپنے اپنے دائرہ کار میں ہر دو کے لئے آسائشیں مہیا کیں تاکہ کہیں بھی ان میں نامقبول تصادم کا موقع نہ آئے۔ آج کل کے تعلیمی نظاموں پر غور کیا جائے تو اکثر و بیشتر ان دو انتہاؤں کا شکار ہیں۔ کہیں روحانی تعلیم ہی مطمع نظر بنی اور جسم گھٹ کر رہ گیا اور کہیں جسم کی نشوونما ہی مرکز خیال رہی اور روح سکڑ کر دم توڑ گئی آنحضرت ﷺ کی تعلیمات نے ان میں دلکش ربط اور حسین توازن پیدا کیا کہ ایک کی قوت دوسرے کے لئے تقویت کا موجب بنی۔

رسول اکرم ﷺ کے نظام تعلیم میں ہر شعبہ حیات کو مناسب نمائندگی دی گئی مختلف النوع تعلیمی شعبے ایک دوسرے کے ساتھ خوبصورتی سے پیوست کئے گئے۔ طبیب، تاجر، دوکاندار، صنعتکار، مزدور، آجر، کاریگر، ملازم غرضیکہ تمام پیشہ ور مختلف عملی میدانوں میں مصروف کار نظر آتے ہیں مگر سب کا رخ ایک ہے۔ تعلیم کے بے شمار شعبے قائم ہیں اور ملکی و قومی ضرورت کے تحت قائم کئے جا سکتے ہیں۔ ہر شعبہ حیات میں نصاب تعلیم بھی مختلف ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ایک ڈاکٹر کو اپنے پیشے میں مہارت کے لئے جو نصاب تعلیم دیا جائے گا وہ اُس نصاب تعلیم سے مختلف ہو گا جو ایک ماہر معاشیات کے لئے مقرر کیا جائے گا جسے ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کاری پر تحقیق کرنا ہے۔ جو طالب علم بھی اپنے مقررہ نصاب کو دلجمعی اور خلوص سے نہ پڑھے گا وہ اپنے شعبے میں ناقص رہے گا۔ اسلامی نظام تعلیم میں ہر شعبہ حیات کے ماہرین کی آفزائش کی حوصلہ افزائی ہوگی اور وہ سب اپنے اپنے پیشے کے اعتبار سے مختلف گروپ بنائیں گے مگر اسلام کے نزدیک یہ تقسیم صرف پیشہ ورانہ ہوگی۔ بحیثیت انسان اُنہیں

ایک نصاب پڑھنا ہو گا جو سب میں قدر مشترک بنے گا۔ اسلام کے نزدیک یہ مشترک اساس دوسری پیشہ ورانہ اساسوں سے زیادہ اہم ہے۔ ایک انجینئر کے لئے انجینئرنگ کی تعلیم اُس کی پیشہ ورانہ تعلیم ہے اسی طرح میڈیکل کی تعلیم ایک ڈاکٹر کے لئے اُس کے پیشے کے اعتبار سے اہم ہے مگر ان سب کا بنیادی وصف انسان ہونا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس ہمہ گیر بنیادی وصف کو امتیازی عارضی اوصاف سے زیادہ اہمیت دی۔ اچھا سائنس دان بننا ایک خوبی ہے مگر اچھا انسان ہونا اس سے بڑھ کر ہے۔ فنی مہارت کی عظمت کا اسلام قائل ہے مگر اس کی حیثیت اسلام کے ہاں ثانوی ہے۔ اسلام کے نزدیک وہ ڈاکٹر کسی کام کا نہیں جو ایک باکردار انسان نہیں ہے۔ یہی وہ خط امتیاز ہے جو بااخلاق ماہرین اور اخلاق باختہ فنی ماہرین میں اسلام کھینچنا چاہتا ہے۔ غور کیا جائے تو آج کی سسکتی ہوئی انسانیت کو ماہرین فن سے کہیں زیادہ باکردار انسانوں کی ضرورت ہے آج انسان اس لئے زبوں حال نہیں کہ طبعی میدان میں اس کی رسائی ناقص ہے بلکہ اُس کے درد کی اصل وجہ انسانیت کا فقدان ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں فنی مہارت، عارضی اوصاف اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا پورا اعتراف ہے بلکہ ان میں مہارت کی ترغیب دی گئی ہے مگر ہر حال میں تعلیم کے مقصدِ اول اور بنیادی وصف کو کسی صورت میں نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا گیا۔ اسلام نے ہر مفید علم کو مناسب مقام دیا، زراعت، تجارت، باغبانی، نور بانی، دستکاری تربیت اولاد اور پرورش حیوانات غرضیکہ معاشرتی، معاشی، اخلاقی و سماجی راہنما اصول ہر شعبہ حیات میں مقرر فرمائے اور عملی طور پر ان کی تربیت کا سامان کیا تاکہ پورا معاشرہ نظریاتی اور عملی میدان میں نیکی کا گہوارا بن جائے۔ محتاجی ختم ہو اور

استغنا کی دولت حاصل ہو۔ خودداری کا جوہر نمو پائے اور انسان دوستی کے جذبات ابھریں تاکہ سب انسان ایک دوسرے کے معاون ومددگار بن جائیں۔

رسول اللہ ﷺ کے نظام تعلیم کے بنیادی اوصاف کے ساتھ ساتھ چند ضمنی مباحث بھی توجہ طلب ہیں۔

اس نظام تعلیم میں مردوعورت کو برابر کا شریک بنایا گیا ہے۔ جواب وہی، افعال کی ذمہ داری ہردو کے لئے ہے۔ اس لئے تعلیم بھی دونوں کا حق ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے نظام تعلیم میں عورت کی فلاح وبہبود اُس کا روحانی ومادی ارتقاء اور معاشرہ میں اس کی ممتاز حیثیت کو ہمیشہ اولیت دی گئی اُسے معاشرے کا عضو معطل نہیں بنایا گیا بلکہ وہ ہرمیدان عمل میں شریک وسہیم رہی۔ مگر اس اشتراک کے باوجود اُسکی خصوصی ذمہ داریوں کا خیال رکھا گیا، اُس کا میدان عمل متعین تھا اس لئے نظام تعلیم میں بھی اُسکی اس خاص حیثیت پر پوری توجہ دی گئی بحیثیت انسان دونوں کی تعلیم یکساں تھی مگر بحیثیت معاشرتی افراد اُن کی حدود مقرر تھیں۔ عورت کی تعلیم ایک اچھی مشیر، ایک بہتر ماں اور ایک باوقار خاتون خانہ بننے کے لئے تھی۔ یہ مناسب نہ سمجھا گیا کہ بلاضرورت عورت تلوار تھام کر میدان میں کودے اور یہ بھی مستحسن نہ تھا کہ ایک باصلاحیت مردعورتوں کی طرح گھر میں گھسا بیٹھا رہے۔

رسول اللہ ﷺ کے نظام تعلیم میں ایک اور اہم بات یہ تھی کہ قومی ضروریات کے تحت آپ نے موجود وسائل پر انحصار کرتے ہوئے ہروہ قدم اٹھایا جو اُس ماحول میں ممکن تھا اس طرح تعلیم کو وسائل کے حصول تک ملتوی نہ رکھا گیا۔ غزوۂ بدر میں فتح وکامرانی کے بعد ذرا موقعہ ملا تو مدینہ میں اٹھتے ہوئے جوانوں کی تعلیم کے لئے وہ

ذریعہ استعمال کیا جو قدرت نے مہیا کردیا تھا۔ پڑھے لکھے قیدیوں سے دس دس جوانوں کی تعلیم کا وعدہ لیا اور اس کے عوض اُن کی جان بخشی کردی گئی۔ فتح کے نشے میں اُن محبوس لوگوں کو تیغ کے گھاٹ اتارنے کے بجائے ایسے ہیجانی موقعے پر بھی تعلیم امت کا وہ عظیم مقصد حاصل کیا جو صرف پیغمبرانہ دوراندیشی سے ہی ممکن تھا اور آنے والی نسلوں کو درس دیا کہ وسائل کی کمی اور مواقع کی محدودیت کا رونا رونے سے بہتر ہے کہ موجود وسیلوں کو بروئے کار لایا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کے نظام تعلیم میں استاد کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ صرف چند اسباق کی تفہیم اور کچھ فنی مشکلات کی تحلیل کا ہی ذمہ دار نہیں بلکہ وہ آئندہ نسل اور پورے معاشرے کے بگڑنے اور سنورنے کا ذمہ دار ہے۔ اُس کے فرائض انتہائی نازک اور اُس کی ذمہ داریاں نہایت دقیع ہیں اس لئے اس قدر نازک ذمہ داری ہرکس وناکس کو سونپی نہیں جاسکتی، اس نظام تعلیم میں ''علم'' کے ساتھ ساتھ تربیت کا فریضہ بھی استاد کو انجام دینا ہے اور اُسے نائب رسالت کے طور پر تلاوت آیات وتعلیم کتاب کے ساتھ ساتھ حکمت کی تعلیم بھی دینا ہے اور تزکیہ نفوس بھی کرنا ہے۔ اس لئے اُسے خود باکردار، بااخلاق ہونا چاہیے۔ نظریاتی طور پر مضبوط فنی طور پر کامل اور اخلاقی طور پر قابل فخر ہونا ضروری ہے اسلامی نظام تعلیم میں ''ڈگری'' کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اخلاق کو اہمیت حاصل ہے۔ ایک اخلاق باختہ ڈگری یافتہ استاد سے وہ استاد اسلامی نظام میں زیادہ قابل قدر ہے جو اگرچہ اتنی بلند ڈگری کا حامل نہ ہو مگر کردار کا پختہ اور ایمان کا پکا ہو۔ اسلامی نظام تعلیم میں خالص ٹیکنیکل مضامین میں دیگر مذاہب کے علماء سے استفادہ کیا گیا۔ مگر اس کے لئے طلباء میں اپنے نظریہ حیات کی پختگی

شرط اول ہے وگرنہ فنی مہارت کی مرعوبیت ایمان ویقین کی دولت لوٹ لے جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ نظام تعلیم میں حاکم نہیں خادم پیدا کئے جاتے ہیں اس میں صرف حکومت کے اہلکار ہی کی تربیت کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ نوکر شاہی کی موجودہ روش کا اسلامی نظام میں کوئی مقام نہیں ہے۔ اسلام محنت کا وقار پیدا کرتا ہے اور ہر پیشے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور پیشوں کی بنیاد پر بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں کرتا۔ جو پیشہ بھی کوئی اختیار کرے اس کا حق ہے اور اپنے پیشے میں لگن سے کام اُس کے لئے معاشرے میں عزت کا سبب ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اس بنیاد پر کبھی ترجیحی سلوک نہیں کیا گیا۔ اس طرح جغرافیائی حد بندی کی اسلام نظام تعلیم میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ رنگ ونسل کی برتری کا کوئی تصور نہیں۔ اسلام کے ہاں علوم بعض خاندانوں یا نسلوں کے لئے نہیں ہیں بلکہ یہ سب افراد امت کا مشترکہ حق ہیں۔ انفرادی صلاحیت اور ذاتی کاوش ہی سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

ان تمام گزارشات سے یہ امر واضح ہوگیا کہ رسول اکرم ﷺ نے ایسا نظام تعلیم وضع فرمایا جس میں علم کی فرضیت، مقصد کی عظمت، تعلیم کی اہمیت نظریہ تعلیم کی عملی افادیت اور انسان کی بنیادی حیثیت کو اس طرح سمودیا گیا کہ ایک قابل فکر نظام معرض وجود میں آیا جس کے اثرات چند ہی سالوں میں نمایاں ہوگئے اور جس میں آج بھی بھٹکتی ہوئی انسانیت کے لئے روحانی ومادی عروج کا سامان ہے۔

اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ مسلمان ممالک اسلامی نظام تعلیم کے مطابق اپنے علمی ماحول کو ڈھال سکیں۔ آمین!

پاکستان کے لئے مثالی نظامِ تعلیم کی تشکیل

تعلیماتِ نبوی (ﷺ) کی روشنی میں

قرآن مجید میں معلم انسانیت ﷺ کی بعثت کا تعارف کراتے ہوئے نبوت کے چار بنیادی فرائض کا بیان ہوا۔ تلاوتِ آیات، تزکیہ نفوس، تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت، یہی وہ چار بنیادیں ہیں جن پر اسلامی نظامِ تعلیم کی تعمیر ہوئی ہے۔ ان ارشادات سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا فرستادہ رسول، معلم انسانیت ہے اسی کے حوالے سے ارشاد ہوا۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (سنن ابن ماجہ مقدمہ)

میں معلم بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں۔

یہ اعلان واضح کررہا ہے کہ اسلامی نظامِ تعلیم کی تشکیل کرنے والی ذات معلم کی ہے، یہ ایک انقلابی رویہ ہے کیونکہ تجربہ یہ رہا ہے کہ اکثر نظام ہائے تعلیم، حکمرانوں یا منتظمین کی سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس نظام کے نفاذ کی ذمہ داری اُن افراد کو سونپی جاتی ہے جن کا نظام کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ رسول رحمت ﷺ کا دیا ہوا نظام تعلیم ایک معلم کا وضع کردہ ہے جسے واضع نے خود ہی عملی طور پر نافذ کیا۔ اس لئے اس نظامِ تعلیم میں نظریہ اور عمل کی ثنویت نہیں ہے۔

نظامِ تعلیم کے حوالے سے گفتگو کی اساس، پیش کاروں کا "علم" کے بارے میں رویہ ہوتا ہے، علم کا حصول ہر دور اور ہر نسل میں محبوب رہا ہے مگر اسے اکثر وپیشتر

ایک زیور سمجھا گیا کہ اس سے انسانی زیب وزینت میں اضافہ ہوتا ہے، اسلام کا رویہ اس سے یکسر مختلف ہے۔

دریافت علم کے لئے سوال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں فرضیت علم کا بھی ذکر ہوا اور صاحبانِ علم کی منزلت کا بھی بیان ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق علم کا حصول افراد کا ذاتی مسئلہ نہیں، یہ ہر فرد کے لئے فرض ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم میں علم کی فرضیت کے ساتھ دوسرا اساسی فرض تعلیم ہے اس لئے کہ علم ایک امانت ہے اس کا حاصل کرنا بھی فرض ہے اور اسے دوسروں تک منتقل کرنا بھی فرض ہے، اس امانت کی پاسداری کرنے والوں کی فضیلت بھی بیان ہوئی اور اسے ذاتی کاوش کا ثمر سمجھ کر روک لینے والوں کو تنبیہ بھی ہوئی، ثابت ہوا کہ علم چند آسودہ حال افراد کی برتری اور تفاخر کا وسیلہ نہیں، یہ تو امانت ہے اس کا روکنا بدترین خیانت، یہ جلبِ زر کا ذریعہ نہیں تکمیلِ ذات کا وسیلہ ہے علم کی اشاعت کاروبار نہیں بلکہ یہ ایک بنیادی انسانی فریضہ ہے جس کے بغیر تعمیر انسانیت کی ہر جدوجہد خام ہے۔

ہر قوم وملت کو اپنے نظریہ حیات کے مطابق نظریہ تعلیم مرتب کرنا ہوتا ہے اس لئے کہ نظریہ تعلیم کا اساسی مقصد نظریہ حیات کا فروغ ہے، اگر اس تعلق کی عظمت اور ضرورت کا خیال نہ رہے تو ذہنی آوارگی اور قلبی پراگندگی جنم لیتی ہے اور قوم غیر محمود میلانات کے تناؤ کا شکار ہو کر انتشار کا ہدف بن جاتی ہے، اس لئے نظریہ حیات کو نظریہ تعلیم کی اساس بننا چاہیے۔

اسلامی نظامِ تعلیم میں علم کا حصول اور علم کی اشاعت ایک مسلسل عمل ہے،

مہد سے لحد تک، تعلیم کو نہ مکانی حد بندیاں میں اسیر کیا جاتا ہے اور نہ زمانی قید کا پابند بنایا جاتا ہے، پھر یہ بھی کہ وسائل کی موجودگی اور عدم دستیابی کو تدریس کے التوا کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا اور نہ ہی افراد کی کمی کو بہانہ بنایا جاتا ہے۔ اسیرانِ بدر کا حوالہ اور اصحاب صفہ کا روّیہ اس سلسلے میں مشعلِ راہ بن سکتا ہے یہ بھی یاد رہے کہ اسلام طالب علم کی پیش رفت پر پہرے نہیں بٹھاتا۔ یہ ضرور ہے کہ مقصدِ حیات کے حوالے سے ترجیحات کا قائل ہے۔

ان بنیادی مباحث کی روشنی میں وطنِ عزیز کے نظامِ تعلیم پر نظر ڈالیں تو ایک بے کیف تسلسل محسوس ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم کے حوالے سے نظامِ تعلیم تثلیث کا شکار تھا، یعنی۔

1 سرکاری تعلیمی ادارے جہاں نصابِ تعلیم اور طریقہ تدریس، حاکموں کی خواہشات کا عکاس تھا۔ اس کا مقصد حکمرانوں کی اطاعت کو یقینی بنانا تھا۔

2 مقامی تعلیمی ادارے جن کی پیشانی پر امت مسلمہ کے لئے کوئی دلکش لاحقہ تو موجود تھا مگر یہ ادارے بھی اُسی مشن کی تکمیل کے لئے کوشاں تھے جس کے لئے سرکاری ادارے قائم تھے۔

3 دینی تعلیم کے ادارے جن کا مقصد تحفظ ماسلف تھا تا کہ قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے استوار رہے، یہ دراصل وہ پناہ گاہیں تھیں جہاں مستقبل کے لئے ماضی کی تابناکیوں کو محفوظ کیا جارہا تھا۔

پاکستان ایک اسلامی ریاست کے طور پر وجود میں آیا۔ وقت کا تقاضا تھا کہ اس تدریسی تثلیث کا مداوا کیا جاتا اور وحدت افکار کی افزائش کے لئے مشترک پیش رفت

کی جاتی مگر بوجوہ ایسا نہ ہوسکا۔ اس کے لئے اربابِ دانش، صاحبانِ بصیرت اور حاملینِ کتاب وحکمت کو بھرپور توجہ دینا چاہیے۔

اسی سلسلے میں چند تجاویز پیش کی جارہی ہیں جو اگرچہ ابتدائی نوعیت کی ہیں مگر عملی اقدامات کے لئے اساس کا کام دے سکتی ہیں۔

1 حصولِ علم کی فرضیت کا اعلان کیا جائے تا کہ منزل کا تعین ہو سکے۔

2 ترویجِ علم اور شرح خواندگی کا گراف بلند کرنے کے لئے ایصالِ علم یعنی تعلیم کو بھی لازمی قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں تعلیم اداروں کے ساتھ ہر شعبہ حیات کو پابند کیا جائے تا کہ پوری قوم اس مشن میں شریک ہوسکے۔

3 نصابِ تعلیم کو ملی تقاضوں، عصری ضرورتوں اور معاشی کفالتوں کے مطابق ترتیب دیا جائے۔

4 سرکاری تعلیمی اداروں اور دینی تعلیم کے اداروں میں اشتراکِ عمل کو فروغ دیا جائے تا کہ باہمی اتحاد وتعاون کی فضا قائم ہو۔ وطنِ عزیز کے اسلامی تشخص، اہالیانِ وطن کی ذہنی وفنی بالیدگی اور ریاست کے وقار کے حوالے سے نظامِ تعلیم کا جائزہ لیا جائے۔

5 تعلیمی وتدریسی عمل میں یکانگت کی فضا قائم کی جائے تا کہ علم کی تقدیس بحال ہو، وحدتِ قومی اور اسلامی اخوت کا تقاضا ہے کہ علم کی بارگاہ میں سب کو یکساں مقام حاصل ہو، مراعات یافتہ طبقہ کی انانیت کے حصار میں پرورش پانے والے نوخیز اذہان، ذاتی برتری کے ایسے فریب میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ افتراق کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

6 تعلیمی اخراجات کو عام شہری کی معاشی حیثیت کے مطابق متعین کیا جائے اس سلسلے میں دینی مدارس کے ایسے طلبہ جو معاشی جبر یا معاشرتی ناہمواری کا شکار ہیں اُن کی کفالت کی جائے کہ یہ بھی قوم کا سرمایہ ہیں۔

7 نجی تعلیمی اداروں کی سرپرستی کی جائے۔ اس کے لئے فراخدلانہ مگر محتاط روّیہ اپنایا جائے تا کہ تعلیم کا سارا بوجھ حکومت پر نہ پڑے۔ یہ احتیاط لازم ہے کہ معیار تعلیم برقرار رہے اور یہ کہ نجی تعلیمی ادارے نفع بخش کارخانوں کو صورت نہ لے لیں۔

8 سائنسی ترقی کے لئے خصوصی توجہ دی جائے، کمپیوٹر کے حوالے سے آئی ٹی کے تمام شعبوں کو مربوط کیا جائے اور اس کی تعلیم کو قومی ضرورت گردانتے ہوئے سرپرستانہ راہنمائی کی جائے۔

الغرض یہ کہ تعلیم کے سارے نظام کو قومی یک جہتی، ملی وقار، دینی تشخص اور تعمیر کردار کا وسیلہ بنایا جائے یہ ضرور یاد رہنا چاہیے کہ قوموں کی عظمت کا گراف، تدریسی اداروں کی کارکرگی کے حوالے سے ہی تیار ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ملی جہاد میں بھرپور شرکت کی توفیق عطا فرمائے آمین

قبل از اسلام عربوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی

عرب ایک جزیرہ نما ہے جس کے تین اطراف میں پانی ہے، صرف ایک جانب عراق وشام کی سرزمین سے خشکی کا رابطہ ہے۔ ملک عرب کا وہ حصہ جو دینِ اسلام کے آغاز کی وجہ سے تاریخ انسانی کے ہر قاری کی توجہ کا مرکز ہے ایک صحرائی علاقہ ہے جس کے جنوب میں دنیا کا ایک عظیم صحرا واقع ہے جسے عرب "الربع الخالی" کہتے ہیں۔ شمال کی جانب بھی ایک وسیع صحرا ہے جس کی زبان ملک شام تک دراز ہے پانی جو زندگی کا اصل جوہر ہے عرب میں بہت کم تھا، بارش نہ ہونے کے برابر تھی اور ندی نالوں کا بھی کوئی مربوط سلسلہ نہیں تھا، پانی کی کمی نے ملک عرب کی چھاتی کو روئیدگی کی ہر نعمت سے محروم رکھا تھا، لق ودق صحرا، ویران بادیئے اور جھلسی ہوئی سیاہ چٹانیں عرب کی کل کائنات تھیں، قرآن مجید نے اسے وادِ غیر ذی زرع یعنی زراعت اور کاشت کاری سے محروم وادی قرار دیا ہے۔ پانی کی تلاش عربوں کا سب سے بڑا مسئلہ تھا، وہ اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے جہاں کہیں بارش کی وجہ سے کوئی سبزہ نمودار ہوجاتا عرب وہیں ڈیرے ڈال دیتے اور جب سبزہ ختم ہوجاتا تو پھر رواں دواں ہوجاتے، اس مسلسل سفر نے ان میں جفاکشی اور بلند ہمتی کا جوہر پیدا کردیا تھا۔ حالات کی ناسازگاری نے انہیں مایوس اور بے ہمت نہیں بنایا تھا بلکہ وہ اسے اپنی بقا کے لئے ایک چیلنج سمجھتے تھے۔ وہ حالات کی اس سختی پر قانع تھے اور اپنی ہمت سے اسی میں زندگی گزارنے کا عزم کرچکے تھے، اس پیہم سفر میں اونٹ اُن کا ساتھی تھا اور انہیں کی

طرح جفاکش، یہی ان کا سرمایہ تھا اور یہی زر مبادلہ، صحرا میں کھجور کا بلند وبالا درخت اُن میں بلند حوصلگی بلکہ خودسری پیدا کرنے کا موجب بنا تھا۔ ان کی نگاہ بلند تھی مگر اس حسین خصلت نے اُن میں انانیت اور تکبر کو بھی جنم دیا تھا، وہ نہ جھکنے والے، ضدی اور بات بات پر اَڑ جانے والے تھے۔

مسلسل سفر نے اُن کے نظام حیات کو عسکری رخ دے دیا تھا، وہ سیارگانِ فلک کی طرح مسلسل متحرک رہتے تھے اس صحرا نوردی میں قبائل سے وابستگی اُن کی اپنی ضرورت تھی، قبیلہ ان کی پہچان تھا، حالات کی سخت کوشی نے ان میں قبائلی عصبیت تیز تر کردی تھی، وہ قبیلے کی خاطر ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے کیونکہ قبیلہ ہی اُن کی شناخت تھا، وہ اپنے قبیلے کی حمایت میں نیک وبد، خوب یا ناخوب کا فرق نہ سمجھتے تھے، قبیلے کا رُخ جدھر ہے تمام افراد اسکے ساتھ ہیں وہ بھائی کے مددگار تھے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، ہر قبیلے کا اپنا دائرہ اثر تھا جس میں کسی کی مداخلت انہیں پسند نہ تھی اور اگر کوئی ایسی جسارت کرتا تو جنگ وجدال تک نوبت آجاتی تھی، قبیلے کا سردار عموماً عمر رسیدہ، تجربہ کار اور جہاں دیدہ انسان ہوتا تھا جس کی اطاعت سب پر لازم ہوتی تھی، وہ ان کے داخلی مسائل کا حل تلاش کرتا اور دیگر قبائل سے تعلقات کی نوعیت متعین کرتا تھا، ہر قبیلے کا اپنا شاعر تھا جو اُن کی عزت کا محافظ اور عظمتوں کا قصیدہ گو تھا۔ اپنوں کی مدح اور دیگر مخالف قبائل کی ہجو اُس کے فرائض میں شامل تھی، شعراء کا باہمی مقابلہ ہوتا اور ایسے مقابلوں کے لئے خاص محفلیں برپا ہوتیں، شاعر اس قدر معزز اور محترم تھا کہ سردار کے لئے شاعری کا وصف لازمی سمجھا جاتا تھا، شاعر کی لگائی ہوئی آگ نے ہزاروں انسانوں کو جنگ کی بھینٹ چڑھایا، خاندانی تعصب نے انہیں

آپس میں بر سر پیکار رکھا، وہ اپنی ہٹ کے اتنے پکّے تھے کہ کٹ جاتے مگر سر جھکانے کا نام نہ لیتے، تاریخ عالم گواہ ہے کہ عربوں نے کئی چالیس، چالیس سال کی جنگیں لڑیں، حرب داحس وغبراء، حرب بسوس ایسی جنگیں ہیں جو مسلسل چالیس سال لڑی جاتی رہیں اور دونوں اطراف کے ہزاروں انسان ان میں لقمۂ اجل بنے۔

عرب زندگی سے پیار کرنے والے تھے مگر زندگی باوقار ہونی چاہئے تھی، ذلت کی زندگی پر وہ موت کو ترجیح دیتے تھے، عزت کا مفہوم بھی ان کے ہاں خود ساختہ تھا، وہ بات بات پر عزت کا خطرہ محسوس کرتے تھے اور خیالی خطرے پر جان کی بازی لگا دیتے تھے، اس طرح کشت وخون اُن کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا، عورت اس بادیہ گردی میں مردوں کی ہمراز ودمساز تھی، وہ صحراؤں میں اُن کے اونٹ چراتی، گھریلو کام کاج کرتی اور جنگوں میں کئی مفید خدمات انجام دیتی تھی مگر اُن کے ہاں عورت کی حیثیت ثانوی تھی، تلاش معاش میں انہیں سردھڑ کی بازی لگانا ہوتی تھی وہ اس تگ ودو میں عورت کو کمزور پاتے تھے اس لئے ہر وقت اس کی حفاظت وعزت اُن کے پیشِ نظر تھی، حالات کی سنگینی کبھی انہیں اتنا مجبور کر دیتی کہ وہ بچیوں کو زندہ درگور کر دینے میں ہی عافیت محسوس کرتے، اس طرح وہ غربت کے خوف سے بھی خود کو محفوظ خیال کرتے اور اسے اپنی بگڑی ہوئی غیرت کا مظہر بھی قرار دیتے، غربت کا خوف اور غیرت کا بگڑا ہوا تصور اس مکروہ حرکت کا سبب بنتا تھا، اس کمزور حیثیت نے عورت کو پست مقام پر کھڑا کر دیا تھا، وہ حصۂ وراثت بن گئی، سوتیلی ماں اُن کے نزدیک کسی عزت کی مستحق نہ تھی بلا تکلف گھر ڈال لی جاتی تھی، بدوی ماحول کی وجہ سے عرب علم وفن سے بے بہرہ تھے، تعلیم جو انسانیت کا جوہر ہے، عربوں کے ہاں ناپید تھی۔ اس بے علمی نے انہیں

توہم پرست بنا دیا تھا۔ شراب وکباب کے عام رواج نے اُن میں کئی اخلاقی برائیاں پیدا کر دی تھیں، جاہلی دور کے عرب معاشرے مین بدکرداری وبداعمالی کی کئی بھیانک صورتیں نظر آتی ہیں۔ عربی شاعری ان سرمستیوں کی ایک طویل داستان کی امین ہے۔

مذہبی لحاظ سے بت پرستی اُن کا عمومی رویہ تھا، قبائلی تعصب کی کارفرمائی نے ہر قبیلے کو اپنا الگ بت تراشنے پر مجبور کر دیا تھا، بت اس قدر محترم تھے کہ اُن پر قربانیاں دی جاتی تھیں اور انہیں خوش کرنے کے خبط میں کئی بے سروپا حرکتیں کی جاتی تھیں، اس بت پرستی کے جنون کے باوجود خانہ کعبہ کو شرف وعظمت حاصل تھی، کعبے کا طواف کیا جاتا، حجر اسود کو بوسے دیئے جاتے، صفا ومروہ کی سعی ہوتی، سر منڈھائے جاتے اور قربانیاں پیش کی جاتیں مگر ان تمام مناسک میں بت پرستی کی جھلک بھی نمایاں تھی، کعبہ کی شرافت کے اعتراف کے باوجود اسے بتوں کی لمبی قطاروں سے مزین کیا گیا تھا۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ اسلام کی آمد کے وقت تین سو ساٹھ بت کعبہ میں ڈیرہ جمائے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے روز انہیں ہٹانے کا حکم دیا اور اس طرح کعبہ کا تقدس بحال فرمایا، اس بت پرستی کے باوجود انہیں خدا کے وجود کا احساس تھا اور یہ احساس بعض اوقات شدت بھی اختیار کر لیتا اور اُن میں بعض لوگ بت پرستی سے نفرت کا اظہار بھی کرنے لگتے چنانچہ تاریخ نے چند ایسے مقدس نفوس کے نام محفوظ کئے ہیں جو بت پرستی چھوڑ کر دینِ حنیف پر عمل پیرا ہو گئے تھے اور انہوں نے خدائے واحد کے اقرار کا برملا اظہار بھی کیا۔

أربًا واحدًا أم ألف ربٍّ	أدِينُ إذا تقسمتِ الأمور
تركت اللّات والعزّى جميعًا	كذلك يفعل الرجل البصير

"کیا میں ایک خدا پر ایمان لاؤں یا ہزار پر، میں نے تو لات وعزّیٰ سب کو چھوڑ دیا ہے اور ایک صاحب بصیرت وصاحبِ نظر انسان ایسا ہی کیا کرتا ہے۔"

دین حنیف کے علاوہ یہودیت اور نصرانیت کا بھی کہیں کہیں وجود نظر آتا ہے، بعض تاجر پیشہ اہل کتاب اُن بستیوں پر قابض ہو گئے تھے جہاں پانی کی موجودگی نے چند سہولتیں مہیا کر دی تھیں، یثرب، خیبر اور تیما کی بستیوں میں پانی موجود تھا، یہود کا ان پر قبضہ تھا۔ اہل کتاب کی خوشحالی اور تعلیمی برتری کے اثر سے چند عرب قبائل بھی یہودیت اور نصرانیت اختیار کر چکے تھے، ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو بت پرستی سے متنفر تھے مگر درست راہ عمل اُن کے سامنے نہ تھی، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایک قریبی عزیز ورقہ بن نوفل انہیں لوگوں میں شامل تھے، بنو تغلب میں بھی ایسے اثرات ملتے ہیں مگر عرب کے عمومی معاشرے میں ان کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی اور وہاں بت پرستی ہی کا دور دورہ تھا، بت پرستی اور کوتاہ نظری نے آخرت کے تصور کو دھندلا دیا تھا وہ اسی زندگی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ مر کر کیسے دوبارہ پیدا ہونا ممکن ہے۔ قرآن پاک نے اُن کی اس غلط سوچ اور پست خیالی کا بار بار ذکر کیا ہے۔

الغرض اسلام سے قبل عرب معاشرتی لحاظ سے منتشر اور متحارب گروپوں میں بٹے ہوئے تھے جن کے درمیان فتنہ وفساد کی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی تھی اور قریب تھا کہ پورے معاشرے کو بھسم کر دے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اُن کو تھاما اور رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے قرآنی تعلیمات نے اُن میں اخوت ومحبت پیدا کی اور وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے بھائی بھائی بن گئے۔

عہد نبوی کا پہلا جمعہ۔۔۔۔تاریخی پس منظر

اسلام ایک دین ہے جو بنی نوعِ انسان کی حیات کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے اسلام کی دعوت ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے کی دعوت ہے جہاں ہر فرد معاشرہ ایک قانون کا تابع ہو، جہاں ہر انسان اصولوں کا پابند اور ایک دوسرے کے لئے جانثاری کا جذبہ رکھتا ہو، رسول اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ کی سرزمین پر ایسا ہی معاشرہ قائم کرنے کا اہتمام کیا مگر ظلم کے خوگر، بدی کے رسیا اور گناہ کے عادی بپھر گئے، یہ پیغام تو اُن کی خودسری کے لئے پیغامِ فنا تھا، وہ تکبر وغرور کی بداندیشی کے اسیر تھے، برتر وکم تر کی تقسیم پر کاربند تھے، انہیں اسلام کی دعوت پسند نہ آئی کہ حق کا بول بالا ہو گیا تو اُن کے استبداد و اقتدار پر زوال آجائے گا، مظلوم کی اعانت ہونے لگی تو ظلم کا ہاتھ بے توفیق ہو جائے گا، زیردستوں کو شعورِ حیات عطا ہو گا تو زبردستوں سے حقِ تحکم چھن جائے گا، روشنی کی آمد تاریکی کے لئے پیغامِ فرار ہوگی، شفا کا نزول مرض کے خاتمہ کا اعلان ہوگا، سب کچھ بدل جائے گا، تکریم کے پیمانے اور تعظیم کے رویئے یکسر تبدیل ہو جائیں گے، اہلِ مکہ اس انقلاب کے ظہور کو محسوس کرنے لگے تھے اس لئے ہر قیمت پر اس انقلاب کے داعی کا راستہ روکنے کا سامان کرنے لگے، ماحول کو ابھی تیار ہونے کے لئے وقت درکار تھا اور دین کی سربلندی کسی اور مرکز کی متلاشی تھی۔

یہ مرکز مدینہ منورہ تھا جہاں اسلام کی روشنی پھیل چکی تھی، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی

محنت رنگ لا رہی تھی، گھر گھر میں نبی اکرم ﷺ کے ارشادات سنائے جا رہے تھے، اہل مدینہ جابروں کا جبر برداشت کرتے رہے تھے، نفاق وافتراق نے اُن کو آپس میں دست وگریباں کر رکھا تھا، ماضی کا تجربہ، اہل کتاب کی ہمسائیگی اور ظلم وجور سے نفرت انہیں اسلام کے قریب لے آئی تھی، جذبہ بیدار ہو جائے تو فاصلے سمٹ جایا کرتے ہیں، وہ لمحہ آ گیا تھا کہ انقلاب اسلامی کا مرکز مدینہ منورہ منتقل ہو جائے، داعی حق ﷺ نے ہجرت کی اجازت دے دی تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ جانے لگے تھے، یہ سفر بتدریج طے پایا اور آخر وہ موقع بھی آیا کہ خود حضور اکرم ﷺ نے ہجرت کا فیصلہ کر لیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لئے چھوڑ دیا کہ دشمنوں کی امانتیں واپس کر دی جائیں، دشمنی کی حد ہو گئی تھی، اہل مکہ جان لینے پر تل گئے تھے مگر نبی رحمت ﷺ اسلامی تعلیمات کے اجراء ونفاذ سے سرمو اغماض پر تیار نہ تھے، مخالفت اصولوں کا سودا کرنے کا باعث نہ بن سکی تھی، جان کا خطرہ مگر دیانت کا مظاہرہ اسلام کا امتیازی نشان بنا، گردن کٹ سکتی تھی، ضابطے نہ ٹوٹ سکتے تھے۔

سرور کائنات ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لئے مکہ مکرمہ کو الوداع کہہ رہے تھے، جان کے دشمن تلاش میں نکلے، وادیوں میں تلاش ہوئی، پہاڑوں وکوہساروں کی پہنائیاں سرکیں مگر انہیں یہ خبر نہ تھی کہ:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ:72)

"اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے پناہ دینے والا ہے۔"

کا حصار بڑا قوی ہوتا ہے، جو وادی مکہ میں اپنے ارمان پورے نہ کر سکے، راستوں میں کیسے روک سکیں گے، یہ قافلۂ نجات رواں دواں تھا، سُراقہ کا تعاقب راہ حق کے

مسافر کے آڑے نہ آ سکا، بنو اسلم کا گروہ انعام کی طلب لے کر نکلا تھا مگر انہیں دنیا ہی نہیں دین کا انعام حاصل ہو گیا تھا، یہ مختصر قافلہ نور وہاں جا رہا تھا جہاں دین کو معاشرے کی سروری حاصل ہونے والی تھی، مکہ مکرمہ سے مہاجرین ایک ایک فرد کی حیثیت سے نکلے تھے کہ انہیں مدینہ منورہ کے اجتماع میں ضم ہونا تھا، مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا سفر، افراد کا اجتماع کے ربط میں پیوست ہونے کا سفر تھا۔

تعاقب ناکام ہوا کہ تاریکیاں روشنی کی لہر کو روکنے کی ہمت نہیں رکھتیں، نور پیدا ہونے کا عزم کر لے تو دبیز اندھیرے بھی پسپا ہو جایا کرتے ہیں، مدینہ منورہ سراپا استقبال تھا کہ نور نبوت کی شعاعیں اہل مدینہ کے قلب ونظر کو جلا بخش چکی تھیں، آفتاب آمد دلیل آفتاب، روشنی نظر آنے لگے تو طلوع آفتاب کا انتظار ہونے لگتا ہے، مدینہ منورہ سے باہر وادی قباء میں مہاجرا کٹھے ہو چکے تھے تاکہ مدینہ منورہ میں رسول عالمین ﷺ کے داخل ہونے کے جشن کا نظارہ کر سکیں، چودہ روز قباء میں قیام رہا، وہاں وہ مسجد تعمیر ہوئی جس کی اساس تقویٰ پر تھی جسے پہلی مدنی مسجد ہونے کا شرف ملا تھا اور جسے آمدِ حق کی یادگار کے طور پر دائمی فضیلت حاصل ہو گئی تھی۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابھی مکہ مکرمہ ہی میں تھے کہ جمعہ کی اجازت ہو گئی تھی، جمعہ اجتماع کا تقاضا کرتا ہے اس لئے ادا نہ ہو سکا اگرچہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں اس کی ادائیگی کا پیغام مل چکا تھا جمعہ سیّد الایام ہے کہ اس کی فضیلت عیدین سے بھی زیادہ ہے، اس لئے کہ یہ دین کی عظمت کا حوالہ اور اجتماعی ربط کا وسیلہ ہے، حضور اکرم ﷺ قباء سے جمعہ کے روز شہر کی جانب روانہ ہوئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ساتھ تھے اور ہر بستی والے استقبال کو حاضر

تھے، بنو سالم کی وادی میں پہنچے تو نماز جمعہ کا وقت ہوا، آج عجیب منظر سامنے تھا، مواخات ویگانگت کا درس دینے والا، شہر محبت میں داخل ہوا چاہتا تھا، کثیر تعداد ساتھ تھی، مکہ مکرمہ میں ملنے والی اجازت کے عملی نفاذ کا سامان بہم تھا، ارشاد ہوا اسی وادی میں نماز جمعہ ادا ہو گی، خطبہ ارشاد فرمایا، نماز ادا ہوئی، مسجد جمعہ یا مسجد الوادی اسی عظیم دن کی یادگار کے طور پر قائم ہوئی، ایک مختصر سی مسجد مگر اجتماع کے قیام کا نقطہ آغاز۔

یہ پہلا جمعہ تھا جو مدینہ منورہ کے مضافات میں ادا ہوا، یہ اعلان تھا کہ مدینہ منورہ اہل اسلام کے لئے ایک ایسا مرکز بننے والا ہے جہاں سب ایک دوسرے سے کندھا ملا کر آگے بڑھیں گے، یہ وہ لمحہ تھا جب اسلام کے معاشرتی انقلاب کی بنیاد رکھی گئی، اب چھپ چھپ کر نیکیاں نہ ہوں گی، نیکی معاشرے کا مزاج بن جائے گی، سطوتِ اسلامی کا اظہار ہو گا، اعلائے کلمۂ حق کے آوازے گونجیں گے اور

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (الاسراء:18)

''حق آگیا اور باطل نابود ہوا۔''

کے زمزمے دل ونظر کو تسخیر کریں گے، یہ پہلا جمعہ ہی نہ تھا، معاشرے کی خشتِ اول تھی، یہی روح جب مسجد نبوی میں بیدار ہوئی تو اسلام کی سلطانیت آشکار ہو گئی۔

غزوہ بنی قینقاع وغزوہ بنی نضیر

مکہ مکرمہ میں کفار و مشرکین کا جور و ستم انتہا کو پہنچا اور مسلمانوں کے لئے تبلیغ دین تو در کنار اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہونے لگا تو آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت مدینہ کی نوید سنائی، مدینہ کلمۂ توحید کی اشاعت کے لئے سازگار ثابت ہوا کہ انصارِ مدینہ اس آوازۂ توحید کے مدت سے منتظر تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرداً فرداً راہی مدینہ ہوئے اور بالآخر خود سرور کائنات ﷺ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لئے کعبۃ اللہ پر الوداعی نظریں جماتے دکھی دل کے ساتھ غار ثور کی تنہائیاں کاٹتے ہوئے دار الامن یعنی مدینہ منورہ میں جلوہ افروز ہوئے، اوس وخزرج کے قبائل ماضی کی تلخیاں فراموش کر چکے تھے اور سلکِ وحدت میں متحد ہو کر طاقت بننے والے تھے مگر یہ پیش رفت مدینہ منورہ کے اُن یہودی قبائل کے لئے قابل برداشت نہ تھی جو صدیوں سے عرب قبائل کی باہمی منافرت کی وجہ سے اپنا تحکّم قائم کر چکے تھے رسول اکرم ﷺ یہود کے ارادوں سے بے خبر نہ تھے اور نہ ہی ان کی منافقانہ روش سے صرفِ نظر کیا جا سکتا تھا مگر اتمامِ حجت کے لئے وقت دینا اور اصلاحِ احوال کے لئے عملی اقدام بھی ضروری تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے یہود مدینہ کے ساتھ تاریخ اسلام کا وہ پہلا معاہدہ کیا جسے ''میثاق مدینہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس میں فریقین کے جذبات کا خیال رکھا گیا تھا اور ساتھ ہی جانبین کے تحفظ کے لئے پروگرام وضع کیا گیا تھا، چاہیے تو یہ تھا کہ اس مثالی معاہدے کی موجودگی میں مدینہ منورہ کی سیاسی فضا

امن وسکون کا گہوارہ بنتی اور ہر دو فریق مکمل آزادی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کار میں مصروف رہتے مگر یہود اپنا تحفظ تو چاہتے تھے لیکن مسلمانوں کے خلاف ان کے دل بغض وعناد سے بھرے ہوئے تھے، اس لئے درپردہ سازشیں ان کا وطیرہ بن گیا تھا، انہیں اعتماد تھا کہ قریش مکہ اپنے اس حریف سے غافل نہیں ہیں اور وہ ضرور ایک منظم قوت کے ساتھ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوں گے، وہی وقت ہوگا جبکہ یہود اپنے مذموم سازشی کردار کا بھرپور مظاہرہ کر کے مسلمانوں کے لئے داخلی مشکلات پیدا کرسکیں گے اور یہ عدم اعتماد قریش مکہ کے حملے کے لئے معاون بنے گا اور اس طرح داخل و خارج کی معاندت کے اشتراک سے شجرِ اسلام کی بیخ کنی ممکن ہو سکے گی، کفر ملت واحدہ بن کر ہر طرح ملت اسلامیہ کی تباہی کے خواب دیکھ رہا تھا مگر قدرت کا فیصلہ نافذ ہوا چاہتا تھا، آنحضرت ﷺ کی قیادت میں مٹھی بھر مسلمانوں کا عزم ویقین تائید ایزدی حاصل کر چکا تھا، بدر کا میدان قریش مکہ کے ارمانوں کا قبرستان بنا تو یہودی اپنے مقاصد میں ناکامی پر بوکھلا اٹھے، خواہشات کی شکست وریخت انہیں کمینگی کی سطح پر لے آئی اور وہ ایسی حرکات کرنے لگے جو صرف معاہدے کی روح کے ہی منافی نہ تھیں بلکہ شرف انسانیت سے بھی گری ہوئی تھیں، غزوہ بنی قینقاع ہوا اور غزوہ بنی نضیر اسی بوکھلاہٹ کے اثرات اور اسی بے ضمیری کے شاخسانے تھے۔

مدینہ منورہ میں اوس وخزرج کے یمنی قبائل جنہیں تاریخ اسلام میں انصار مدینہ کا معزز لقب ملا، کے علاوہ یہود کے بعض قبیلے آباد تھے جو اپنی امارت وسیادت کے باعث شہر سے باہر مگر قریبی محفوظ قلعوں میں رہائش پذیر تھے اور اپنی ان کمین گاہوں سے اندرونِ شہر کے متحارب قبائل پر اپنی سطوت قائم کئے ہوئے تھے، ان میں

بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ مشہور ومعروف تھے، ان یہودی بستیوں میں خوشحالی کا دور دورہ تھا اور یہ بستیاں مدینہ منورہ کی طرز معیشت سے قطعاً مختلف بلکہ برتر معاشی نظام کو اپنائے ہوئے تھیں، اس مادی عظمت کی وجہ سے وہ اہل مدینہ کو کمزور اور فروتر خیال کرتے تھے، میثاق مدینہ کے باوجود اُن کی طرف سے ایسی حرکات ہوتی رہتیں جن سے اُن کا بغض وحسد نمایاں ہوتا، آنحضرت ﷺ ہر ممکن طریق سے اصلاحِ احوال کے لئے کوشاں رہتے مگر غزوہ بدر کے بعد یہود تلملانے لگے اور کھلے بندوں اسلام کے خلاف سازشیں کرنے لگے، اُن کی اسلام دشمنی انہیں ہر وقت مضطرب رکھتی وہ حضور اکرم ﷺ کی ذات ستودہ صفات کے خلاف ہرزہ سرائی پر اُتر آئے، یہودی شاعر برملا ہجویہ اشعار کہنے لگے، بنو قینقاع کا سردار کعب بن اشرف، پاکدامن مسلمان خواتین پر الزام تراشیاں کرنے لگا جس سے مدینہ منورہ کی پُرامن فضا میں ارتعاش پیدا ہوا، کعب نے اسی پر اکتفا نہ کیا وہ مکہ کے قریش کو پُرسہ دینے مکہ پہنچا اور وہاں انہیں ایک بار پھر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی اور اپنی حمایت کا یقین دلانے لگا، یہ طرزِ عمل معاہدے کی صریحاً خلاف ورزی تھا، ضرورت تھی کہ ان بدعہدوں کو سزا دی جائے تاکہ دوسروں کے لئے عبرت بنے مگر رحمت عالمین ﷺ نے ایک بار پھر دعوت وارشاد کی مسند بچھائی اور بنو قینقاع کے سربرآوردہ انسانوں کو اپنے طرزِ عمل پر غور کا موقع فراہم کیا، نصیحت بھی فرمائی اور انجام سے خبردار بھی کیا، اپنا پیغام امن بھی سامنے رکھا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کا سبق بھی دیا۔ قرآن مجید نے اسی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ

(آل عمران:12)

"اے نبی ﷺ کفر کرنے والوں کو کہہ دیجئے کہ تم عنقریب مغلوب ہوجاؤ گے اور جہنم کی جانب لے جائے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔"

ان قرآنی اشارات کے باوجود یہود کا رویہ نہ بدلا بلکہ وہ اور دیدہ دلیر ہو گئے حتیٰ کہ مسلمان مستورات کو نشانہ تضحیک بنانے لگے، روایت ہے کہ ایک بادیہ نشین عورت نقاب اوڑھے یہودی بستی میں گئی، وہ ایک سنار کی دکان پر زیور کی خرید کے سلسلے میں گئی تھی یا دودھ بیچنے کے لئے، بہرکیف یہودی دوکاندار نے اس سے دست درازی کی اور اس کا نقاب نوچا جس پر وہ پاکدامن دہائی دینے لگی، قریب گزرتے ہوئے کسی مسلمان جوان سے نہ دیکھا گیا اور وہ الجھ پڑا، بات بڑھی اور یہودی قتل ہوگیا، پھر کیا تھا یہودی بستی پل پڑی اور مسلمان کو شہید کردیا، حالات اس قدر دگرگوں ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے بنوقینقاع کا محاصرہ کرلیا، اپنی شجاعت پر اترانے والے مسلمانوں کی یلغار کو نہ روک سکے اور ہتھیار ڈال دیئے، عبداللہ بن ابی کی سفارش پر رحمت عالمین ﷺ نے کوئی انتقامی اقدام نہ کیا، حکم ہوا کہ بستی خالی کردی جائے اور بنوقینقاع کا علاقہ مسلمانوں کے حوالے کردیا جائے چنانچہ یہود بنی قینقاع اپنے قلعوں کو چھوڑ کر جان بخشی کی اجازت پاتے ہی شام کی جانب اُذرِعات کے مقام پر چلے گئے اور اس طرح یہ فتنہ فرو ہوا۔ غزوۂ بنی قینقاع میں مسلمانوں نے یہود کے قلعوں کا پندرہ روزہ محاصرہ کیا، ان ایام میں بشیر بن عبدالمنذور انصاری رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں آنحضرت ﷺ کے نائب کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔

خیال تھا کہ ایک یہودی قبیلے کے انجام سے دیگر قبائل عبرت حاصل کریں

گے اور میثاقِ مدینہ کی پاسداری کریں گے مگر دل کا مرض، جو بغض وحسد سے پروان چڑھتا ہے دیر پا ہی ہوتا ہے اور مہلک بھی، اس عملی تنبیہ کے باوجود یہود اسلام دشمنی کا ہر موقع تلاش کرنے اور پوری قوت سے مسلمانوں کو تنگ کرنے اور مدینہ کی اسلامی ریاست میں بدامنی پھیلانے میں کوشاں رہتے، ایک سال مزید گزر گیا مگر ان کی ریشہ دوانیاں بڑھتی ہی گئیں، اس اثنا میں ایک واقعہ پیش آیا کہ عمرو بن امیہ نے بنی عامر کے دو انسان قتل کردیئے جنہیں رسول ﷺ کی پناہ حاصل تھی، یہودی قبیلے بنی نضیر اور بنی عامر کے درمیان معاہدہ تھا اس لئے آنحضرت ﷺ بنونضیر کے علاقے میں گئے تاکہ مقتولین کی دِیت کا مطالبہ کیا جائے اور بات کو مزید بڑھنے سے روک لیا جائے، بنونضیر اس خواہش امن کا احترام نہ کرسکے، حضور اکرم ﷺ اُن کے ہاں ایک دیوار کے قریب فروکش ہوگئے اور معاملے کو سلجھانے کے لئے گفتگو کا آغاز کیا، یہود بظاہر آمادہ گفتگو تھے مگر مختلف بہانوں سے بات کو موخر کررہے تھے، یہ تاخیر ایک سازش کا حصہ تھی کہ وہ اپنی بستی میں سرورِ کائنات ﷺ کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر قتل کی سازش کرنے لگے تھے چنانچہ انہوں نے ایک یہودی جوان کو تیار کیا کہ وہ ملحقہ چھت پر چڑھ جائے اور اوپر سے ایک وزنی پتھر سرکارِ ابد قرار ﷺ پر گرادے، اس یہودی کا نام عمرو بن جحّاش تھا، پروگرام مرتب ہوگیا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس وقت حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی رضی اللہ عنہم تھے، اِدھر شیطانی قوتیں شریک سازش تھیں اُدھر

"وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" (المائدہ: 17)

اور اللہ آپ (ﷺ) کو لوگوں سے بچانے والا ہے۔ کی قوت پناہ گاہ رسالت تھی آپ ﷺ دیوار کے قریب سے اچانک اٹھے اور چل دیئے، صحابہ رضی اللہ عنہم منتظر رہے کہ

ابھی واپس آئیں گے مگر وقت گزرتا گیا اور آپ ﷺ واپس نہ آئے تو صحابہ کبار تلاش میں نکلے یہود اپنے پروگرام کو یوں ناکام ہوتا دیکھ کر گھبرا گئے، معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ واپس مدینہ لوٹ آئے ہیں اور اس غداری پر یہود کو قرار واقعی سزا کا ارادہ کر چکے ہیں۔

چنانچہ مدینہ منورہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جمعیت نکلی اور بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا گیا، ربیع الاوّل میں یہ محاصرہ ہوا جو چھ روز تک جاری رہا، قلعہ نشین یہود کو مجبور کرنے کے لئے درخت کاٹے گئے یا جلا دیئے گئے، اسلامی لشکر کی گرفت ناقابل برداشت تھی اس لئے یہود نے ہتھیار ڈال دیئے، اس معاندانہ رویہ کے باوجود آنحضرت ﷺ نے کسی کی جان نہ لی بلکہ حکم دیا کہ وہ بستی خالی کر دیں اور جس قدر اونٹ اٹھا سکے سامان بھی لے جائیں، بنو نضیر سامان اٹھائے خیبر کی جانب روانہ ہو گئے اور بعض شام کو چلے گئے اس طرح یہ دوسری دشمن بستی بھی فراست مومنانہ کے کمال کی بنا پر بغیر حرب وضرب خالی ہو گئی اور مدینہ منورہ دشمنوں کے حلقے سے آزاد ہو کر اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ بھی بنا اور ملت اسلامیہ کے لئے دارالامن بھی، بنو نضیر کا اخراج ایک ایسا واقعہ تھا جس کے اثرات دیر پا ثابت ہوئے چنانچہ مسلمان شعراء جن میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور کئی دیگر انصاری شاعر شامل تھے، نے اس کو موضوع شعر بنایا اور متعدد قصائد کہے۔

الغرض چار ہجری کے ربیع الاول تک یہود کے دو اہم قبائل مدینہ منورہ سے نکالے جا چکے تھے اور اب صرف بنو قریظہ باقی تھے جن کے بارے میں قدرت کا فیصلہ موخر ضرور تھا مگر شدید تھا، تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کمال سیاسی بصیرت اور قابل تقلید انتظامی صلاحیت سے مدینہ منورہ کو دشمنوں کے نرغے سے آزاد کرایا اور اس شہر مقدس کو ہر لحاظ سے تا ابد اسلامی قوتوں کو امین اور اشاعت دین کا مرکز بنا دیا اور امت کے لئے ایک درخشاں مثال قائم کی کہ اپنے مرکز کو معاند قوتوں سے محفوظ رکھنا اور ہر سازش سے بچانا تحفظ ملت کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

صلح حدیبیہ

حدیبیہ مکہ مکرمہ سے کوئی دس میل جانب مغرب ایسا مقام ہے جہاں کوئی باقاعدہ آبادی نہ تھی، ایک کنواں اس کی کل کائنات تھی جس کی بدولت کچھ شادابی کے آثار ہویدا تھے۔ صحرائے عرب کے راہ نورد سفر کی تھکن کو دور کرنے کے لئے یہاں چند روز آرام کرتے اور پھر روانہ ہو جاتے، کسے معلوم تھا کہ یہ عارضی پڑاؤ کسی روز تاریخ عالم پر ایسا گہرا نقش ثبت کرے گا کہ قوموں کے عروج وزوال کی داستان میں اس کا حوالہ بھی شامل ہوگا۔ آب شیریں کی موجودگی نے ریتلے میدان کو کچھ روئیدگی عطا کر دی تھی اور کہیں ببول کا ایک سخت جان پودا بھی پیدا ہو گیا تھا۔ بظاہر یہ بے توفیق درخت تھا مگر قدرت اسے تاریخ انسانی کے ایک قیمتی اثاثے کے طور پر محفوظ رکھنے کا عزم کر چکی تھی۔ ذوالقعدہ 6ھ کو اسی درخت کے سایے میں بقائے باہمی کا ایک انمول صحیفہ تحریر ہوا۔

اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح:18)

کے قرآنی ارشاد نے اس واقعہ کو حیات ابدی عطا کر دی اور جان سپاری کے عہد وپیماں کو بیعت الشجرہ کا منفرد لقب عطا ہوا۔

مکی زندگی میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اہل مکہ کے تشدد کا سامنا تھا، ایذا رسائی اور مخالفت کا ہر انداز اپنایا گیا تھا ظلم حد سے بڑھا تو ہجرت کا حکم ہوا تا کہ اہل ستم سے نجات حاصل کی جائے، مدینہ گوشۂ عافیت تھا وہاں جانثاروں کی

تعداد بڑھتی جا رہی تھی اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا آسان ہو گیا تھا مگر ظلمت کے بادل اب بھی نہ چھٹے تھے، دارالامن کی تخریب کے سامان ہونے لگے، مدینہ منورہ کی دفاعی حیثیت کو تباہ کرنے کے پروگرام بنے۔ طاقت اور حیلہ سازی کا ہر حربہ آزمایا گیا مدینہ منورہ کے یہودی شہریوں سے مل کر سازشیں کی گئیں، بدر واحد میں اپنی قوت کے مظاہرے کئے غرضیکہ چھ سال مدینہ منورہ اہل مکہ کے حملوں کی زد پر رہا۔ پانچ ہجری میں غزوہ احزاب اُن کی قوت کا آخری اور فیصلہ کن معرکہ تھا۔ وہ فتح کے نشہ میں چور تھے مگر قدرت اپنا فیصلہ کر چکی تھی آندھی کیا چلی اہل مکہ کی ہوا ہی اکھڑ گئی وہ اس مرتبہ یوں پسپا ہوئے کہ دوبارہ حملے کی ہر خواہش دم توڑ گئی۔ اب وہ حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے بلکہ اپنے مدفاع کی تدبیریں کرنے لگے تھے وہ چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح مکہ مکرمہ میں عافیت کی زندگی گزارنے پر قادر ہو جائیں مگر ہزیمت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اُن کا دور ختم ہو چکا تھا اب اہل مدینہ کی باری تھی۔ اسلام حرب وضرب میں بھی شائستگی کے اصول عطا کرتا ہے۔ وہ مخالفت برائے مخالفت اور بے مقصد دشمنی کی اجازت نہیں دیتا اس لئے یہ تو ممکن نہ تھا کہ مکہ والوں کی حماقتوں کا جواب اُنہیں کے رنگ میں دیا جائے، ہاں اب اُنہیں یہ اجازت بھی نہ دی جا سکتی تھی کہ وہ مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات پر کاربند ہونے سے روکنے کی پرانی روش برقرار رکھیں۔ حدیبیہ کا سفر اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی خواہش کا مظہر تھا۔ نیک ارادوں میں اللہ کی توفیق شامل ہوتی ہے اس لئے یہ دینی سفر اثر آفرین نتائج کا حامل بنا۔

مسلسل چھ سالوں سے مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کا داخلہ ناممکن بنایا گیا تھا۔ اب حرم کعبہ کے دیدار کی خواہش کی تکمیل کی صورت نکلی، چودہ سو صحابہ کی

جماعت آنحضرت ﷺ کی قیادت میں مدینہ منورہ سے روانہ ہوئی۔ عمرہ کی ادائیگی پیشِ نظر تھی اہل مکہ پر اپنی قوت کا اظہار مقصود نہ تھا اس لئے حکم ہوا کہ ہتھیار ساتھ نہ لئے جائیں صرف عربی روایات کے مطابق تلوار ساتھ ہو مگر وہ بھی نیام میں رہے۔ یہ صرف خود حفاظتی کی خاطر اجازت تھی۔ یہ نورانی قافلہ مختلف پڑاؤں پر ٹھہرتا مکہ مکرمہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچا اور حدیبیہ کو آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے قیام کا شرف حاصل ہوا۔ اس خیال سے کہ عمرہ کی ادائیگی بھی ممکن ہو جائے اور کسی قسم کا ذہنی تناؤ بھی پیدا نہ ہو نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ کہتے ہیں باطل کم نظر بھی ہوتا ہے اور اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا بھی، مسلمانوں کے شریفانہ طرزِ عمل کو بھی دشمنی کی آنکھ سے دیکھا گیا۔ آنحضرت ﷺ چونکہ کوئی سیاسی یا جنگی مقصد لے کر نہ آئے تھے اس لئے اتمام حجت کرتے گئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ معزز خاندان کے نمایاں افراد میں سے تھے اس لئے اُنہیں بطور ایلچی مکہ مکرمہ روانہ کیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ بہتری کی کوئی صورت نکل آئے مگر اہل مکہ کا رویہ معاندانہ ہی رہا۔ درین اثنا یہ افواہ پھیلی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے، اس خبر نے سب کو مشتعل کر دیا اور غیرت وحمیت کے ایوانوں میں زلزلہ بپا ہو گیا، آنحضرت ﷺ نے ببول کے درخت کے سایے میں شہادت عثمانی کے قصاص کی خاطر صحابہ رضی اللہ عنہم سے عہد لیا کہ اہل مکہ کو اپنی اس حرکت پر ضرور سزا دی جائے گی خواہ اس کے لئے کیسی بھی قربانی دینا پڑے، یہ بیعت الشجرہ، بیعت رضوان کہلائی اور اس بیعت پر شریک افراد کے لئے قرآنی بشارتیں نازل ہوئیں، اہل مکہ کو مسلمانوں کے اس اضطراب کی خبر ملی تو پریشان ہوئے، افواہ غلط ثابت ہوئی اور نامہ و پیام کا سلسلہ سنجیدگی سے دوبارہ شروع

کیا گیا۔ سہیل بن عمرو قریش مکہ کے نمائندے کی حیثیت سے حدیبیہ آیا۔ وہ گفتگو کا کھردرا مزاج رکھتا تھا ابتداء میں اُس کا انداز بھی جارحانہ تھا کہنے لگا، اے محمد یاد رکھو کہ اگر تم لڑائی میں کامیاب بھی ہو گئے تو اس سے تمہاری ہی قوم تباہ ہو گی اور اگر رُخ بدل گیا تو یہ تمہارے ساتھی تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ یہ ایک دھمکی تھی اور جانثاروں سے بدظن کرنے کی عیارانہ کوشش بھی۔ حملہ اسقدر نامناسب تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے متین اور نرم دل انسان بھی پکار اٹھے۔ ''کم بخت'' کیا کہا ہم اور رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیں۔ سہیل کا یہ حربہ ناکام ہوا کیونکہ ہر مسلمان اعتماد کا کوہ گراں تھا ان کے ایمان کو متزلزل نہ کیا جاسکتا تھا۔ اہل مکہ پہلی مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بے پناہ اعتماد کا مشاہدہ کررہے تھے اس لئے فوراً معاہدہ کی شرائط طے کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ سہیل اس قدر ذہنی تحفظات کا شکار تھا کہ کبھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر معترض ہوا کہ اسے جاہلی آداب کے مطابق باسمك اللھم کر دیا جائے اور کبھی محمد رسول اللہ پر بدگماں کہ رسول اللہ کا کلمہ حذف کیا جائے اور محمد بن عبداللہ تحریر کیا جائے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم بار بار اُس کی بات رد کرتے حتکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے قلم سے رسول اللہ کے کلمات کے کاٹنے سے معذوری ظاہر کی تو آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اسے کاٹ دیا۔ مقصد یہ تھا کہ گریز کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ معاہدہ مشرکین مکہ سے ہو رہا تھا جو رسول اللہ تسلیم نہ کرتے تھے اس لئے اصرار ضروری بھی نہ تھا۔

کافی بحث وتمحیص کے بعد صلح کی شرائط طے پا گئیں۔ دونوں فریقوں نے دستخط کئے اور اس طرح دس سال تک کے لئے قتال وجدال کو ملتوی کر دیا گیا۔ شرائط یوں تھیں۔

1 مسلمان اس سال عمرہ کئے بغیر واپس لوٹ جائیں۔

2 آئندہ سال آئیں مگر صرف تین دن قیام کریں۔

3 مکہ مکرمہ میں ہتھیار بند ہو کر داخل نہ ہوں، صرف تلوار ساتھ ہو اور وہ بھی نیام میں اور نیام بھی تھیلے میں۔

4 مکہ مکرمہ میں مقیم کسی مسلمان کو ہمراہ نہ لے جائیں بلکہ مکہ سے ہجرت کرنے والوں سے اگر کوئی مکہ آنا چاہے تو اُسے ایسا کرنے سے نہ روکا جائے۔

5 مکہ مکرمہ سے اگر کوئی کافر یا مسلمان بھاگ کر مدینہ منورہ چلا جائے تو اُسے واپس کر دیا جائے لیکن اگر مدینہ سے ایسا کوئی پناہ گزین آئے گا تو واپس نہ کیا جائے گا۔

6 قبائل عرب کو فریقین میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی معاہدہ کرنے کا اختیار ہو گا۔

یہ شرائط اہل مکہ کے تحکمانہ رویے کی مظہر تھیں، شرائط میں اُنہیں برتری حاصل تھی اس لئے مسلمانوں میں قدرے اضطراب پیدا ہوا۔ نوجوان تو پریشان تھے ہی صحابہ کبار رضی اللہ عنہم بھی مشوش ہوئے۔ یہ بے چینی اسی کا مظہر تھی مگر آنحضرت ﷺ نے جب ان شرائط کو تسلیم کر لیا تو سب نے سر جھکا دیئے۔ نگاہ نبوت دیکھ رہی تھی کہ یہ معاہدہ مستقبل قریب میں کتنی برکات کا باعث بننے والا ہے۔

عمرے کو ایک سال کے لئے ملتوی کر دینا کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا جبکہ آئندہ سال کے لئے عمرے کی ضمانت حاصل کر لی گئی تھی، ہتھیار حرم میں ویسے بھی پسندیدہ نہ تھے اور مسلمان تو اس سفر میں بھی بجز تلوار کچھ ساتھ نہ لائے تھے اس لئے یہ شق تسلیم کرنے میں کوئی الجھن حائل نہ تھی۔ مکہ مکرمہ میں مقیم مسلمان اُس وقت اسلام قبول

کرنے کا اعلان کر چکے تھے جبکہ مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کا کوئی وجود نہ تھا اُن کا ایمان کسی مادی منفعت یا دنیاوی مفاد کے لئے نہ تھا اس لئے مکہ مکرمہ میں رہنے سے اُن کے ایمان کو کوئی کمزوری لاحق نہ ہوسکتی تھی وہ اہل مکہ کے ظلم برداشت کر چکے تھے اور مزید حوصلہ رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ سے اگر کوئی مسلمان مکہ مکرمہ میں اقامت کو ترجیح دے کر ترک وطن کرتا ہے تو وہ ایک چیلنج قبول کرتا ہے۔ اس لئے اُس کی جرأت وہمت قابل داد ہے تشویش کا باعث نہیں بلکہ ایسے اصحاب کا مکہ مکرمہ میں درود مکہ مکرمہ کے مظلوم مسلمانوں کے لئے خیر کا باعث بنے گا۔ اور اُن کی قوت میں اضافہ ہوگا، عزیمت کے یہ پیکر مکہ مکرمہ میں اسلامی طرز حیات کو استحکام عطا کرنے کے موجب ہوں گے اس لئے شرط کو مان لینا ہی مناسب تھا، مکہ مکرمہ سے اگر کوئی کافر بھاگ کر مدینہ آتا ہے تو یقیناً اُسے دنیاوی مفاد عزیز ہے وہ دین کی خاطر نہیں بلکہ دنیا کی خاطر ایسا کر رہا ہے اور بہتر ہے کہ ایسے مطلب پرستوں سے مدینہ منورہ محفوظ رہے۔ ہاں اگر کوئی مسلمان مدینہ منورہ کا رُخ کرتا ہے تو اس کا یہ عمل قابل قدر ہے مگر اس طرح مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کے وجود کو ایک اور دھچکا لگنے کا احتمال ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان مہاجرین کی مسلسل آمد سے مکہ مکرمہ کی پوری فضا توحید کی برکات سے محروم ہوجائے اس لئے ہزار مشکلات کے باوجود مکہ مکرمہ میں رہنا ہی مناسب ہے تاکہ نیکی کے یہ جزیرے برقرار رہیں مدینہ منورہ سے کوئی مسلمان بھاگ کر مکہ مکرمہ والوں کی پناہ میں جاتا ہے تو وہ ایمان کی کمزوری کا اعلان کر رہا ہے اور ایسا اُس دور میں ممکن نہ تھا اور اگر وہ منافق ہے تو پھر خس کم جہاں پاک اُسے چلا جانا چاہیے۔

معاہدے کے الفاظ کی خشونت کے ورے جھانکا جائے تو معاہدے کی ہر

شق مسلمانوں کے حق میں دکھائی دیتی ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کے اپنے صحابہ پر اعتماد کے اظہار کا ثبوت ہے۔ معاہدے کی سیاسی حیثیت تھی کہ اہل مکہ نے پہلی مرتبہ مدینہ والوں کو عرب کے جزیرہ نما میں ایک قوت کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ شرائط کا ہر لفظ اہل مکہ کی بوکھلاہٹ اور مسلمانوں کے ایقان کا مظہر تھا۔ معاہدے سے معاشرتی زندگی میں ٹھہراؤ آیا اور جنگ کے بادل چھٹے، اسلامی تبلیغ کے دروازے کھلے اور فریقین کی آمد و رفت سے نفرت ومخالفت کی شدت کم ہوئی اور دبی ہوئی نیکی اپنا وجود منوانے لگی ،حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر سپہ سالار اسی وقفے میں دامنِ اسلام میں آئے۔ کفر کی طاقت گھٹنے لگی، دو سال ہی گزرے تھے کہ کفر سرنگوں ہوا اور حرم پاک کفر وشرک کی دستبرد سے آزاد ہوکر اسلامی تعلیمات کا منبع وماخذ قرار پایا۔

الغرض صلح حدیبیہ تاریخ اسلام میں مقہوریت سے نجات کا پروانہ اور آزاد اسلامی ریاست کے قیام کا پیش خیمہ تھی اس معاہدے نے مخالفوں کو بے دست وپا کیا اور تبلیغ اسلام کی سب مشکلات کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا اور آئندہ کے لئے ایک مثال قائم ہوئی کہ کس طرح کفر سے نبرد آزمائی میں شعوری قوتوں کا استعمال کیا جاتا ہے اور کیسے وقتی مشکلات سے صرف نظر کر کے مستقبل کی برکات کو معیار بنایا جاتا ہے۔

غزوہ بنی مُصطلق

کفرواسلام کی آویزش اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسان کے وجود کی کہانی مگر یہ ستیزہ کاری اُس وقت شدید تر ہو جاتی ہے جب ہدایت ہمہ گیر ہو اور دائمی اثرات کی حامل ہو، دنیائے باطل ایسی ہدایت کو اپنے وجود کے لئے خطرہ محسوس کر کے شدید ردعمل دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری پر بھی ایسا ہی ہوا، کفر مستقل طور پر حملہ آور ہونے کی راہیں تلاش کرنے لگا، پے در پے حملے اور مسلسل جنگ وجدال اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ ہے کہ کفر اپنی پسپائی کی آخری جنگ لڑ رہا ہے۔ سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ کیا جائے تو متعدد غزوات اور سرایا سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے مکہ مکرمہ کی فضا تبلیغِ اسلام کے لئے تنگ کر دی گئی کہ رسول اکرم ﷺ کو مرکز مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف منتقل کرنا پڑا مگر فاصلوں کے باوجود کفر اپنی پوری قوت کے ساتھ بار بار حملہ آور ہوا اگرچہ کاتب تقدیر کا فیصلہ صادر ہو چکا تھا کہ کفر کو ہر بار ہزیمت ہی اٹھانا پڑی، غزوہ بدر، احد، خندق ابتدائی دور مدنی کے وہ غزوات ہیں جن میں مدینہ منورہ پر یلغار ہوتی رہی اور رسول اکرم ﷺ دفاعی جنگ لڑتے رہے لیکن یہ سلسلہ آخر کار ختم ہوا، اب مسلمان مدینہ منورہ سے باہر تک اسلامی لشکر کے ساتھ حملہ آور ہونے لگے تھے ہوا کا رخ بدل چکا تھا، ضرورت تھی کہ کفر کا ناسور جہاں جہاں پک رہا ہے وہاں ہی اُسے کاٹ دیا جائے، غزوہ بنی مصطلق ایسی ہی کوشش تھی کہ اس

قبیلے کی جانب سے خودسری کی خبریں آ رہی تھیں۔

عرب قبائل میں سے ایک بڑا قبیلہ ''بنوخزاعہ'' بھی تھا جو کچھ عرصہ حجاز کے علاقے پر بڑا پر جوش رہ چکا تھا اس قبیلے کی ایک شاخ کا نام بنو مصطلق تھا جس کا سردار حارث بن ابی ضرار اہل مکہ سے محبت کا دم بھرتا تھا اور اُن کی پے در پے شکست پر سیخ پا تھا اپنے جوانوں اور ارکانِ قبیلہ کو مسلمانوں کے خلاف اکساتا تھا اور انہیں مدینہ منورہ پر حملے کی ترغیب دیتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کو اُس کے اضطراب اور جنگ کی تیاری کی اطلاع ملی تو آپ نے خود بڑھ کر حملے کا فیصلہ کر لیا، بیشتر مورخین غزوہ بنی مصطلق کے بارے میں متفق الرائے ہیں کہ یہ پانچ ہجری میں ہوا اگرچہ بعض نے چھ ہجری بھی لکھا ہے مگر بعض دیگر قرائن کی بنیاد پر 5 ہجری ہی معتبر ہے شعبان کو اسلامی لشکر مدینہ منورہ سے روانہ ہوا۔ بنو مصطلق کا قیام ایک ایسے چشمے کے قریب تھا جسے مریسیع کہتے تھے اس لئے غزوہ بنی مصطلق کو غزوہ مریسیع بھی کہا جاتا ہے جب مجاہدین وہاں پہنچے تو وہ لوگ جنگ کے لئے تیار تھے مقابلہ ہوا ایک صحابی شہید ہوئے جبکہ دس کافر مارے گئے چھ سو قیدی بنا لئے گئے، بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ لگا جس میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں بھی تھیں اسیروں میں بنو مصطلق کے سردار حارث کی صاحبزادی برّہ بھی تھیں جنہیں بعد میں حضور اکرم ﷺ نے جویرہ کا نام دیا۔ حضرت جویریہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب گرفتار ہو کر آئیں اور معلوم ہوا کہ سردار قبیلہ کی صاحبزادی ہیں تو حضور اکرم ﷺ نے انہیں اپنے عقد میں لے لیا اور اس کی خبر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہوئی تو انہوں نے بنو مصطلق کا تمام غنیمت کا مال واپس کر دیا کہ یہ ام المومنین کے قبیلے کا مال تھا۔

غزوہ بنی مصطلق اپنے بعض ضمنی واقعات کی بنا پر تاریخ اسلام میں نمایاں طور پر ہر محفوظ ہے روایت ہے کہ اس لشکر اسلام کے ساتھ عبداللہ بن ابی بھی تھا اُس نے جب مسلمانوں کی اس شاندار فتح کو دیکھا تو اُس سے نہ رہا گیا کہنے لگا ہم مدینہ واپس جا کر ان کو نکال دیں گے اُس کا جملہ تھا کہ معزز ذلیلوں کا نکال باہر کریں گے یہ جملہ حضور اکرم ﷺ تک پہنچا مگر آپ نے مدینہ واپسی پر اس کے بارے میں کوئی اقدام کا ارادہ کیا، عبداللہ کا بیٹا مسلمان تھا وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا حضور آپ مجھے اجازت دے دیں کہ میں اپنے باپ کا سر کاٹ دوں، گستاخی یقیناً بہت بڑی تھی مگر رحمت عالم ﷺ نے بیٹے کے ہاتھوں باپ کا قتل پسند نہ فرمایا اور نظر انداز کرنے کو کہا اگرچہ بعد کے واقعات نے مدینہ منورہ حاضری پر اُسے سمجھا دیا کہ ذلیل کون ہے اور عزت والا کون۔

واقعہ افک جس کا قرآن مجید میں بھی ذکر ہوا اسی غزوے سے متعلق ہے، غزوہ بنی مصطلق میں حضرت ام سلمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں، واپسی پر سفر کے دوران حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک مقام پر آرام کرنے لگیں قافلہ چل پڑا اور آپ اپنا ایک گمشدہ ہار تلاش کرنے لگیں اور قافلے کے پیچھے ایک صحابی صفران کے ساتھ لشکرِ اسلام تک پہنچیں۔ یہ ایک عام سا واقعہ تھا مگر منافقین نے اس کو اس قدر پھیلایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگا دی جس سے مدینہ منورہ کے اسلامی معاشرے میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی، غلط فہمیاں بڑھیں اور ام المومنین نے چند ایام نہایت کرب سے گزارے مگر یہ صبر پھل لایا اور قرآن مجید کی سورہ نور آپ کی پاک دامنی کی گواہ بن گئیں قیامت تک ہر قاری قرآن اس پاک دامنی کا اعلان کرتا رہے گا حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا کا اس عرصہ میں کردار آپ کے اعلیٰ اخلاق اور بھرپور اعتماد کا غماز ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پروقار رویہ مرد مومن کے بلند ترین مقام کی نشاندہی کرتا ہے۔

الغرض غزوہ بنی مصطلق تاریخ اسلام کا اہم ترین واقعہ ہے جو اپنے دامن میں کردار واعمال کے کئی درخشندہ باب لئے ہوئے ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع

انسانیت پر احسانِ عظیم

اسلامی تعلیمات کا آغاز غارِ حراء میں اقراء کے حکم سے ہوا اور فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (جو حکم دیا گیا اُسے واضح طور پر بیان کیجئے) سے تبلیغِ دین کے احکامات نافذ ہوئے، پھر آنحضرت ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ کا ہر لمحہ اس کے لئے وقف کردیا۔ کبھی گھر والوں کو مخاطب فرمایا تو کبھی اہل شہر کو اور کبھی باہر سے آنے والوں کو دعوت دی۔ مخالفت کے طوفان اُٹھے، مقاطعہ اور ہجرت کی مشکلات سدِّ راہ بنیں مگر حق کی آواز قلوب واذہان کو مسخر کرتی چلی گئی، آخر وہ دن بھی آیا جب پورا جزیرہ نمائے عرب اسلام کی روشنی سے منور ہوگیا، رحمت کے سایے اطرافِ عالم کو محیط ہوگئے اور لوگ گروہ درگروہ دامنِ اسلام میں داخل ہونے لگے، غارِ حراء سے اٹھنے والی آواز اب ہر دل کی آواز بن گئی، کوہِ بوقبیس سے نشر ہونے والا پیغام دلوں میں گھر کرگیا، منصبِ نبوت، تکمیل کی حدوں کو چھونے لگا تو آنحضرت ﷺ نے مکہ مکرمہ کا قصد فرمایا تاکہ فریضہ حج کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اپنے تیئیس سالہ نبوی کردار کا ماحصل انسانیت کی فلاح وبہبود کی ضمانت کے طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر واضح کردیا جائے۔

سننِ ابن ماجہ کی روایت کے مطابق یوں تو آپ ہجرت سے قبل دو مرتبہ حج ادافرما چکے تھے مگر ابھی تک حج فرض نہ ہوا تھا۔ 9 ہجری کو حج کی فرضیت کے احکام

نافذ ہوئے تو دس ہجری میں آپ نے پہلا حج فرمایا جو آخری بھی ثابت ہوا اس لئے حجۃ الوداع کہلایا۔ حجۃ الوداع اور خطبہ حج کی تفصیلات مختلف کتب حدیث میں موجود ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں باب حجۃ النبی ﷺ اور سنن ابی داؤد میں باب الاشھر الحرم وحجۃ النبی ﷺ میں بعض تفصیلات منقول ہیں، جامع الترمذی، سنن ابن ماجۃ اور مسند احمد میں مختصر تذکرہ موجود ہے جبکہ سنن دارقطنی میں قدرے تفصیل ہے۔ سیرت ابن ہشام میں خطبہ حجۃ الوداع کے اکثر مندرجات مذکور ہیں جبکہ الجاحظ نے کتاب البیان والتبیین میں مکمل متن تحریر کیا ہے۔

26 ذی قعدۃ 10ھ کو آپ 90 ہزار جانثاروں کے ساتھ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، یہ خبر پورے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل چکی تھی کہ رحمت عالم ﷺ فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے تشریف لارہے ہیں اس لئے ہر ہر منزل سے عقیدت مند اس نورانی قافلے میں شامل ہوتے گئے یہاں تک کہ یہ تعداد کم وبیش ایک لاکھ چوالیس ہزار ہوگئی، 5 ذوالحجۃ کو آنحضرت ﷺ حدودِ حرم میں داخل ہوئے، نگاہِ نبوت حرم پاک کی جانب اٹھی تو یوں ارشاد ہوا: ”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، عبادت وبندگی کی مستحق وہی ذات گرامی ہے، فرماں روائی صرف اُسے سزاوار ہے، حمد وستائش فقط اُسی کو زیبا ہے، وہی حیات بخشتا ہے اور وہی موت طاری کرتا ہے، ہر چیز پر وہی قادر ہے، اُس کی ذات کے سوا کوئی معبود نہیں، اُس نے اپنا وعدہ پورا کردیا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی، مخالف قوتوں کو شکست دی۔“ (مشکوٰۃ المصابیح)

پھر دعا فرمائی ”اے اللہ اس گھر کو اور زیادہ شرف وعزت عطا فرمایا۔“

9 ذی الحجۃ کو میدانِ عرفات میں تشریف آوری ہوئی، سہ پہر کے قریب

قصواء اونٹنی پر سوار ہو کر وہ معروف خطبہ دیا جسے تاریخ انسانی کبھی فراموش نہیں کر سکتی، افصح العرب ﷺ نے فصاحت و بلاغت کے بے بہا موتی لُٹائے، نپے تلے الہامی الفاظ میں تمام اسلامی تعلیمات جو تیئس سالہ عہد نبوت پر محیط تھیں کا خلاصہ پیش کر دیا۔ اجمال و تفصیل میں وہ مناسب توازن تھا کہ بڑے بڑے زبان دان اس روانی طبع پر مرحبا اور احسنت کہہ اٹھے۔ حیاتِ انسانی کے ہر پہلو پر واضح اشارات اور حتمی احکامات صادر فرمائے۔ تمام قومی مسائل پر خواہ وہ سیاسی ہوں یا دینی، معاشرتی ہوں یا معاشی نہائت بلیغ انداز میں اظہار خیال فرمایا اور پیغمبرانہ رہنمائی دی۔ خطبہ کے تمام مشتملات کا احاطہ تو ممکن نہیں صرف چند پہلوؤں کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

خطبہ چونکہ تمام تعلیمات کا نچوڑ تھا اس لئے ابتداء ہی میں اس کی اہمیت و عظمت کے اظہار کے لئے ارشاد فرمایا۔

اَیُّھا النَّاس، اسْمَعُوا قَوْلِی فَانِّی لَا اَدْرِی لَعَلِّی لَا اَلْقَاکُمْ بَعْدَ عَامِی ھٰذَا بِھٰذَا الْمَوْقِفِ اَبَدًا۔

اے لوگو میری بات پر توجہ دو، ہوسکتا ہے کہ میں اس سال کے بعد تمہیں اس جگہ دوبارہ کبھی نہ مل سکوں۔ یہ الفاظ خطبہ کی الوداعی حیثیت واضح کر رہے تھے۔

پھر انسان کی اُن مجبوریوں کا تذکرہ فرمایا جن کی کڑی بندشیں انسان کی آزادروی کی راہ میں سنگ گراں بنتی ہیں اور کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی بے عملی اُس کا مقدر ہو جاتی ہے، فرد جب معاشرتی مشین کا ایک پرزہ بن کر مجبور محض ہو جاتا ہے تو اُس کی تمام صلاحتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ آپ نے جبر کا یہ بت توڑتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

اَلَا کُلُّ شیءٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاھِلِیَّۃِ تَحْتَ قَدَمِی۔ (مسند احمد)

جاہلیت کے تمام رسوم و دستور میرے پاؤں تلے ہیں۔

ایک ہی جملے نے انسانی شرف کو بحال فرما کر نوعِ انسانی پر ایک احسانِ عظیم فرما دیا۔ خالقِ کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، یہ مقام بلند مقتضی تھا کہ انسان اپنے اس شرف کی حفاظت کرے تا کہ دیگر مخلوقات پر اُسے تفوق حاصل رہے مگر بدقسمتی سے جاہ پسندی اور خودنمائی نے اُسے شیطانی راہ پر ڈال دیا، تمیز بندہ و آقا نے حیوانی خواہشات کا غلام بنایا، برتر اور کم تر کی تمیز خود ساختہ بنیادوں پر ہونے لگی، کبھی نسل کے محدود تصور نے دوسروں پر دھونس جمانے پر اُکسایا تو کبھی رنگ و روپ کی ظاہر پرستی نے اُسے اعلیٰ و ادنیٰ میں تقسیم کیا، یہ انحطاط یہاں تک پہنچا کہ جغرافیائی حد بندیاں اونچ نیچ کے تصور کو جنم دینے لگیں، آنحضرت ﷺ نے ان تمام غیر فطری اندازِ تفاخر کو ایک ہی ضرب میں پاش پاش کر دیا۔

یا ایھا الناس انّ ربکم واحد وانّ اباکم واحد کلکم لآدم وآدم من تراب، انّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ لیس لعربی علیٰ عجمی فضل الّا بالتقویٰ۔ (مسند احمد)

لوگو بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک تم سب اولاد آدم ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، یاد رکھو کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضلیت نہیں ہے وجہ شرف تو صرف تقویٰ ہے۔

انّ اباکم واحد'' فرما کر نسلی غرور کے تمام بت توڑ دیئے اس مختصر جملے

نے انسانی سوچ کا رخ بدل دیا، ایک انسان اپنے بھائی سے پیار کرتا ہے اسے دوسروں پر ترجیح دیتا ہے صرف اس لئے کہ وہ اسکا بھائی ہے ایسا اسلئے ہے کہ اس نے اپنائیت اور غیریت کا معیار اپنے باپ کو قرار دیا ہے اگر وہ یہ مقام دادا کو دے دیتا تو چچازاد بھی اپنائیت کے دائرے میں آجاتے، اسی طرح جوں جوں وہ آگے بڑھے گا اسکی اخوت کا دامن وسیع ہوتا جائیگا اور اگر وہ جناب ابوالبشر علیہ السلام سے نسبت کو معیار بنالے تو پوری نسل انسانی کو اپنا بھائی خیال کرنے لگے گا، سوچ مادی ہی سی اور مادی تعلق ہی وجہ افتخار سہی مگر یہ تعلق بھی تو بلند تر سوچ کا حامل ہو سکتا ہے، غور فرمایئے کس حکیمانہ انداز میں ایک عام سوچ کو آفاقیت عطا فرمادی پھر اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ خالق کے حوالے سے بھی یہ بات یاد دلادی کہ رب سب کا ایک ہے اور اگر منتہیٰ مقصود اسکی رضا طلبی ہے تو اس کی ساری مخلوق کو اپنانا ہوگا، بھائی مریض ہو یا اپاہج آخر اپنا ہے تو نادار یا مفلس، اپاہج یا بیمار، گورا یا کالا اپنا کیوں نہیں جو بظاہر دور بستا ہے یا جو ہماری زبان میں بات نہیں کر سکتا، آخر وہ بھی اسی رب کی ربوبیت کا حصہ ہے رب سے پیار اور اسکی ربوبیت کے مظاہر سے نفرت شرف انسانی کی نفی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا یہ اعلان، انسانیت کا چارٹر، اخلاق و آداب کا بنیادی نکتہ اور بین الاقوامی معاشرت کی خشت اول ہے اور آج کی مظلوم و مقہور دنیا کے لئے اس میں کتنا حیات آفریں پیغام ہے، آج رنگ و نسل کی تمیز نے جو فساد برپا کر رکھا ہے اسکا حل اسی ارشاد گرامی میں ہے حضور اکرم ﷺ کے یہ ارشادات جب عملی قالب میں ڈھلے تو اسلامی سلطنت میں ایک بلند معیار قائم ہوا، مدینہ منورہ کے بازاروں سے لے کر اسلامی سلطنت کے دور دراز کے علاقوں تک سب انسان برابر قرار پائے۔ اس مساوات کا اعلان حضرت

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے دربار ایران میں یوں فرمایا۔

"انا معشر العرب لا نَستَعبِدُ بعضنا بعضا"۔

(الکامل فی التاریخ ج2 ص313)

یعنی ہم عرب معاشرے کے لوگ آپس میں سب برابر ہیں ہم ایک دوسرے کو غلام نہیں بناتے۔

اسلامی نظام سے مساوات پر مبنی معاشرے میں احترام انسانیت کو وہ جوہر پیدا ہوتا ہے، جس سے ہر انسان دوسرے کا احترام کرتا ہے اور اس کے متعلقات کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے ایسے معاشرے میں انسانی جان و عزت، مال و دولت محفوظ ہوتی ہے حضور اکرم ﷺ نے احترام انسانیت کا درس دیتے ہوئے فرمایا:

"ایھا الناس ان دماء کم و اموالکم علیکم حرام کحرمة یومکم ھذا فی شھر کم ھذا فی بلد کم ھذا"۔

اے لوگو تمہارے خون اور مال تم پر اسی طرح محترم ہیں جیسے اس مقدس شہر میں اس معزز مہینے میں آج کا دن" اللہ اللہ لوگوں کے جان و مال کو کسقدر احترام بخشا کہ کعبے کی حرمت اور یوم حج کی عظمت کا مثیل قرار دے دیا۔ قتل و غارت، چوری ڈکیتی بدکرداری و بددیانتی احترام انسانیت کی نفی اور طبقاتی کشمکش کے مظاہر ہیں، جب کوئی انسان دوسروں کے مال پر نظر جماتا ہے تو اپنے ناپاک جذبات کی تسکین کے لئے بسا اوقات بہیمیت پر اتر آتا ہے اور جان کا دشمن بن جاتا ہے پھر یہ سلسلہ چل نکلتا ہے اور ہزاروں انسان اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس تسلسل کو توڑتے ہوئے ارشاد فرمایا:

انّ کلّ دم کان فی الجاھلیة موضوع وانّ اوّل دمائکم اضع

دمٌ ابن ربيعة"

یعنی جاہلیت کے تمام خون معاف ہیں اور اس سلسلے میں خود پہل کرتے ہوئے اپنے عزیز ابن ربیعہ کا خون معاف کرتا ہوں۔ اس عام معافی میں یہ اشارہ پنہاں تھا کہ معاشرے کی تعمیر نو کے لئے ماضی کی تلخیاں بھول جانا پڑتی ہیں تا کہ ایک نئی اور خوش کن زندگی کا آغاز ہو سکے۔ ان احکامات کے باوجود اگر کوئی ارتکابِ جرم کرتا ہے تو اس کے بارے میں حکم دیا۔

"العمد قود وشبه العمد ما قتل بالعصا والحجر فيه مئة بعير فمن زاد فهو من اهل الجاهلية"

یعنی قتل عمد میں قصاص ہے مگر جو قتل لاٹھی لگنے یا پتھر مارنے سے ہو جائے تو دیت ہو گی جو سو اونٹ ہے ایسا قتل جس میں صرف ضرب لگانا ہی مطلوب تھا مگر ضرب کی اچانک شدت سے موت واقع ہو گئی حالانکہ عموماً ایسا نہ ہوتا تھا ایسے قتل میں دیت ہو گی دیت بھی مقرر فرما دی تا کہ ذاتی خواہشات اور کسی کی انا سے حکم معلق نہ ہو جائے بلکہ فرمایا کہ زیادتی کا خواہاں جاہلی انسان ہے۔ آج کے دور میں جبکہ قانونی موشگافیاں ذہنی جمناسٹک کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے مختصر اور قابل عمل اصول عطا فرمایا تا کہ مقدمات کا فیصلہ بعجلت ہو سکے اور دونوں گروہوں کو جلد تسکین نصیب ہو اور ایک واقعہ دیگر واقعات کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔

بددیانتی ایک اور معاشرتی مرض ہے، یہ عدم تحفظ اور باہمی بداعتمادی کو جنم دیتا ہے اور پورے معاشرے کو خوف زدہ کر دیتا ہے اس بداطمنانی اور اخلاقی سقم کے علاج کے طور پر فرمایا۔ فمن كانت عنده امانة فليودها الیٰ من ائتمنه عليها

"جس کے پاس امانت ہو تو وہ اسکے مالک کو لوٹا دے" امانت کا دائرہ اسلامی تعلیمات میں بہت وسیع ہے، مال و دولت اس کی عام شکل ہیں فرائض و واجبات یا ذمہ داریاں سب امانتیں ہیں جن کی ادئیگی کا اسلام مطالبہ کرتا ہے، خلافت فی الارض بھی قرآنی ارشادات کے مطابق امانت ہے جس کو اس کی مقررہ شرائط کے ساتھ نبھانا ضروری ہے۔ اس سے افراد قوم میں احساس ذمہ داری اور اعتماد نفس کا جوہر پیدا ہوتا ہے پھر فرمایا۔

"اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ اِخْوَةٌ فَلَا يَحِلُّ لِامْرِيٍ مِنْ اَخِيْهِ اِلَّا مَا اَعْطَاهُ عَنْ طِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ فَلَا تَظْلِمُنَّ اَنْفُسَكُمْ"

بے شک مسلمان بھائی بھائی ہیں کسی کا یہ اجازت نہیں کہ وہ دوسرے کی کوئی چیز ہتھیا لے ہاں جو وہ خود خوشی سے دے دے اور ہرگز اپنے آپ پر ظلم نہ کرو، کسی کے مال کو اڑا لینے کی خواہش اس بھائی پر ہی ظلم نہیں اپنے آپ پر بھی ظلم ہے کیونکہ اس سے جوہر انسانیت دھندلا جاتا ہے۔

سود معاشرے کا وہ ناسور ہے جو حرص و آز کے رجحان کا نتیجہ ہوتا ہے دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا ایک ایسا شیطانی عمل ہے جس کا زہر پورے معاشرے کو ناکارہ بنا دیتا ہے پھر انسان انسان کے لئے بھیڑیا بن جاتا ہے اور ہر طرف نفرت کی وسیع خلیج پیدا ہو جاتی ہے جس میں پرسکون معاشرے کی کشتی ڈگمگانے لگتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس رسم بد پر ضرب ید اللہ لگاتے ہوئے فرمایا۔

"اِنَّ رِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ وَلٰكِنْ لَكُمْ رُؤُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ قَضَى اللّٰهُ اَنَّهُ لَا رِبَا، اِنَّ رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ"

بے شک تمام سود ختم کر دیئے گئے ہاں تم اپنا اصل زر لے سکتے ہو یہ اس لئے کہ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ سود نہیں چلے گا اس سلسلے میں اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب کا سارا سود معاف کرتا ہوں۔

صنف نازک کا معاملہ اکثر معاشروں میں الجھا ہوا ہے کسی کے ہاں تو یہ دوزخ کا دروازہ ہے اور کسی کے ہاں اثاثہ بیت کہیں وہ مجبور محض ہے تو کہیں مادر پدر آزاد، اسلام نے عورت کو اسکا جائز مقام دیا، اس کے حقوق وفرائض کا تعین کیا اور اسے معاشرے کے باعزت فرد کی حیثیت سے رہنے کا حق دیا۔ قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں ان حقوق وفرائض کی طرف مفصل اشارات موجود ہیں۔ میدان عرفات میں تمام احکامات کو سمیٹے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ لَكُمْ عَلَى النِّسَاءِ حَقًّا وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ حَقًّا"

اے لوگو تمہارا اپنی عورتوں پر حق ہے اور ان کا تم پر یعنی حقوق وفرائض دونوں طرف ہیں ہر ایک کو چاہیئے کہ اپنے فرائض بحسن وخوبی ادا کرے اور دوسرا اسکے حقوق کی نگہداشت کرے پھر آپ نے چند تفصیلات کو ذکر فرمایا اور آخر پر ارشاد فرمایا

"فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ وَاسْتَوْصُوْا"

عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور ان کے ساتھ اچھے سلوک کی تمہیں تاکید ہے"۔

عورت کو کردار کی عظمت اور عصمت وعفت کی حفاظت کو سبق دیا تو مرد کو حقوق کی ادائیگی اور معاشی ذمہ داریاں نبھانے کا ارشاد فرمایا تاکہ بلا ضرورت معیشت کا بوجھ عورت پر ڈال کر اس کے فرائض کو گھمبیر نہ بنا دیا جائے پھر ارشاد ہوا۔

"اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَئِسَ اَنْ يُّعْبَدَ بِاَرْضِكُمْ هٰذِهٖ اَبَدًا"

یعنی اب اس سرزمین پر کبھی بھی شیطان کی پرستش نہ ہو سکے گی یہ تعلیمات پر اعتماد کا اعلان تھا مگر ساتھ ہی ایک نفسیاتی پہلو کی طرف بھی اشارہ کر دیا، انسان جب معروف اعمال انجام دے لیتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ حق ادا ہو گیا، اس پر فرمایا کہ یہ درست کہ شیطان اب کبھی نہ پوجا جائے گا۔

"لٰكِنَّهٗ قَدْ رَضِيَ اَنْ يُّطَاعَ فِيْمَا سِوٰى ذٰلِكَ مِمَّا تَحْقِرُوْنَ مِنْ اَعْمَالِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ عَلٰى دِيْنِكُمْ"

لیکن وہ اب اسی پر قناعت کرلے گا کہ تم ان اعمال میں جنھیں تم غیر اہم گردانتے ہو اسکی اطاعت کرتے رہو، خبردار شیطان سے اپنے دین کو بچاؤ۔ انسان ایسے ہزاروں اعمال انجام دیتا ہے جن کے بارے میں وہ سوچتا بھی نہیں کہ دینی احکامات کیا ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جسے وہ معمول کا عمل سمجھ رہا ہے اسمیں شیطانی قوتوں کی رضا شامل ہوتی ہے اور یہ معمولی اعمال درحقیقت ایک خاص رجحان کو پیدا کرنے کا باعث بن رہے ہوتے ہیں جو بالآخر برائی کا خوگر بنا دیتے ہے۔

آخر میں فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ان سے تمسک تمہاری فلاح کا باعث ہوگا اور وہ ہیں "كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ نَبِيِّهٖ" اللہ کی کتاب قرآن مجید اور اللہ کے نبی کا طریق زندگی، جب تک تم ان دونوں کو اپنا مقتدا اور راہنما بنائے رہو گے۔

"فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا"

کبھی گمراہ نہ ہوگے، اس حکم میں یہ اشارہ بھی موجود تھا کہ ان میں سے کسی ایک

سے پہلوتہی بھی گمراہی کا باعث ہے ۔قرآن مجید اپنانے کا دعویٰ اور سنت نبوی ﷺ سے صرف نظر درحقیقت تعلیمات اسلامی کو جھٹلانا ہے اتباع شریعت میں دونوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا وگرنہ قرآن فہمی یا قرآن دانی کا دعویٰ محض جہالت ہوگا جب تمام تعلیمات ارشاد فرما چکے۔تو

"فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ"

کا حکم صادر فرمایا کہ ہر موجود کا یہ فرض ہے کہ ان احکام کو غیر موجود تک پہنچائے تاکہ یہ سلسلہ ہدایت تاقیامت جاری رہے۔خطبہ کا متن متعدد کتابوں میں روایت ہوا ہے خصوصیت سے مسند احمد اور سیرت ابن ہشام میں، خطبہ حجۃ الوداع سے یہ واضح ہے کہ آپ نے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر واضح تعلیمات ارشاد فرمائی ہیں ذاتی کردار، اخلاقی اور عائلی زندگی کی حدود وقیود، معاشرتی روابط وضوابط اور بین المِلّی تعلقات غرضیکہ ہر شعبہ حیات کے لئے مکمل راہنمائی خطبے میں موجود ہے۔ بحیثیت انسان کیسے زندگی گزاری جائے اور وہ کون سے انداز حیات ہیں جن سے دنیا حسین تر اور عقبیٰ کامیاب تر ہوسکتی ہے ان سب کا مفصل بیان فرمایا الغرض خطبہ حجۃ الوداع کامیاب زندگی کا آفاقی منشور اور فلاح دارین کا مکمل دستور ہے یہ خطبہ پوری انسانیت پر احسان عظیم ہے، اللہ کرے کہ ہم ان تعلیمات کو اپنا سکیں تاکہ ہماری زندگیاں دنیوی فلاح اور اُخروی نجات حاصل کرسکیں آمین۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

غزوۂ حنین

مکہ مکرمہ کی فتح پورے جزیرہ نمائے عرب کی فتح کے مترادف سمجھی جاتی تھی کیونکہ عرب میں اہل مکہ ہی زیادہ صاحب حیثیت لوگ تھے ان کی مذہبی اور سماجی برتری نے انہیں سیاسی تفوق عطا کر رکھا تھا۔ہجرت مدینہ کے بعد اسلامی ریاست کو سب سے بڑا خطرہ بھی اہل مکہ ہی سے تھا، وہ کبھی خود اپنی طاقت وقوت کے غرور میں حملہ آور ہوتے تو کبھی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے سہارے دیگر قبائل کو آمادہ جنگ کرتے رہتے ۔آٹھ سال کا عرصہ کفر و اسلام کی ستیزہ کاری کا دور ہے مگر جب آنحضرت ﷺ اسلامی لشکر کے ساتھ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو مخالفت کی سب قوتیں سپر انداز ہوگئیں۔ بظاہر کوئی نمایاں دشمن موجود نہ رہا اس لئے فضا پر اطمینان وسکون طاری ہوا۔حضور اکرم ﷺ مکہ مکرمہ کے سیاسی ومعاشرتی حالات کی ترتیب نو میں مصروف رہے تاکہ حرم کی وادی اعلائے کلمہ حق کی خاطر اپنا کردار ادا کرسکے، اسی اثناء میں اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ کے قرب وجوار کے چند بادیہ نشین قبائل جواب تک خاموش تماشائی بنے حالات کا رُخ دیکھ رہے تھے برسرپیکار ہوا چاہتے ہیں۔ان قبائل کو یقین تھا کہ مکہ کبھی بھی مدینہ کی نئی اسلامی ریاست کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے گا، اُن کے دل مکہ والوں کے ساتھ تھے کیونکہ بت پرستی اور قدیم جاہلی روایات کی پاسداری اُن کے ہاں قدر مشترک تھی ماضی بعید تک پھیلی ہوئی جاہلی تاریخ انہیں باور کرا چکی تھی کہ قریش مکہ ناقابل تسخیر ہیں اس لئے وہ اپنی عملی مشارکت

کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے مگر جب قریش اپنی تمام تر عظمت کے باوجود اسلامی قوت وشوکت کے سامنے سرنگوں ہو گئے تو ان قبائل کو اپنی غیر جانبداری پر غصہ آیا، وہ بددیانہ سرفروشی کے مظاہرہ کے لئے اپنی قوت مجتمع کرنے لگے، ہوازن کا قبیلہ پیش پیش تھا یہ وہی قبیلہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے رضاعت کے دن گزارے تھے، ثقیف کا مالدار قبیلہ جو طائف کی وادیوں میں فطرت کی فیاضانہ عنایتوں سے متمتع تھا بھی ان کے ساتھ تھا، ان دو بڑے قبائل کے علاوہ بعض دیگر قبائل کے ہم مشرب افراد بھی شامل ہو گئے تھے، یہ لوگ بلا کے تلوار زن اور نیزہ باز تھے، جب ایک اچھی خاصی جمعیت کے اکٹھے ہونے کی اطلاع حضور اکرم ﷺ کو ملی تو آپ ﷺ نے وادی حرم کو میدان قتال بنانے کو مناسب نہ سمجھا بلکہ خود آگے بڑھ کر ان قبائل کو روکنے کا عزم فرما لیا، مدینہ منورہ سے ساتھ آنے والے جانثاروں کی تعداد تقریباً دس ہزار تھی، ان میں زیادہ تر وہ سعادت مند لوگ تھے جنہوں نے بیعت رضوان میں شرکت فرمائی تھی ان کے علاوہ مکہ مکرمہ کے نومسلم اور دیگر ہم خیال افراد بھی ساتھ ہو لئے جن کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی اس طرح بارہ ہزار کا یہ لشکر حرم کی حدود سے نکلا، بدوی قبائل کی تعداد چار ہزار تھی اس لئے غیر شعوری طور پر اسلامی لشکر کو اپنی قوت کا احساس ہو رہا تھا، تعداد میں کم ہو کر ان لوگوں نے یادگار معرکے سرانجام دیئے تھے اور اب تو اُنہیں عددی برتری بھی حاصل تھی اس لئے نوجوانوں کے دلوں میں مزعومہ فتح کا خیال راسخ ہو چکا تھا، یہ اعتماد اس حد تک بڑھا کہ بعض کی زبان سے یہ کلمات بھی نکلے "آج عرب میں کون ہے جو ہم پر غالب آسکے۔"

اسلامی لشکر شوال آٹھ ہجری کو وادی حنین میں داخل ہوا، حنین طائف کے

راستے پر ذی المجاز کے پہلو میں واقع ہے جہاں کہتے ہیں جاہلی دور میں بازار لگتا تھا، بدوی قبائل جن کا سردار مالک بن عوف تھا کو جب اسلامی لشکر کی آمد کی اطلاع ملی تو اُس نے تنگ وادی میں اپنے ماہر تیرانداز چھپا دیئے تاکہ بڑھتے ہوئے اسلامی لشکر پر بے خبری میں حملہ کر دیا جائے اور انہیں پڑاؤ ڈالنے کا موقع نہ ملے، ادھر فتح کے یقین اور اپنی قوت کے اعتماد نے جوانوں کو خود حفاظتی کی تمام تدابیر سے بے نیاز کر رکھا تھا اس لئے وہ بے خطر آگے بڑھے کمین گاہوں سے تیراندازوں نے پوری قوت اور شدت سے تیر برسانے شروع کر دیئے، حملہ اس قدر بھرپور تھا کہ جوانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ سراسیمگی کے عالم میں بھاگ اٹھے، اس بھگدڑ نے بڑے بڑے آزمودہ جنگجوؤں کو بھی راہ فرار دکھائی چنانچہ اسلامی لشکر کا بیشتر حصہ پسپا ہو گیا، شکست کے آثار نمایاں تھے، جنگی چال کام کر گئی اور کثرت تعداد پر نازاں بے تدبیری نے میدان سے فرار میں عافیت محسوس کی، ایسے عالم میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ سو کے قریب ہی جانثار باقی رہ گئے تھے، آنحضرت ﷺ خود میدان کی طرف بڑھے، آپ ﷺ کی سواری کو ایک طرف سے آپ ﷺ کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ اور دوسری جانب سے چچازاد بھائی ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ تھامے ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ خود پکار رہے تھے: اِلَیَّ یا عباد اللہ اِنّی انا رسول اللہ۔ "اللہ کے بندو میری طرف آجاؤ ہاں میری طرف، میں اللہ کا رسول ہوں۔" اس آواز میں جلال بھی تھا اور پریشان حال لوگوں کے لئے سہارا بھی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بیعت رضوان کے جانثاروں کو بلند اور واضح لہجہ میں صدا دے رہے تھے، حضور اکرم ﷺ پیغمبرانہ جلال اور ہاشمی وجاہت سے اعلان فرما رہے تھے۔

انا النبی لا کذب

انا ابن عبدالمطلب (صحیح البخاری کتاب الجہاد)

لوگو میں نبی ہوں اللہ کا فرستادہ ہوں جھوٹا تو نہیں ہوں، نہ ماننے والو یہ بھی جان لو کہ میں دوں ہمت بھی نہیں ہوں عبدالمطلب کی اولاد ہوں۔ یہ پُراعتماد رجز سب نے سنی، ماننے والوں کے دلوں کو سہارا ملا اور دشمنوں کے حوصلے پست ہوئے، پھر کیا تھا ہاری ہوئی جنگ کا پانسہ پلٹا، منتشر لشکر مرکز کی طرف رجوع کرنے لگا اور چند ہی لمحوں کے بعد ایک مضبوط جمعیت دشمن پر ضرب کاری لگا رہی تھی، دشمن جو اپنی وقتی کامرانی پر اترانے لگا تھا ایسا رفو چکر ہوا کہ اپنی قوت مجتمع بھی نہ کرسکا، ہتھیار بند افراد طائف بھاگ گئے اور غیر مسلح افراد نے اوطاس میں پناہ لی، حضور اکرم ﷺ خود طائف کی طرف بڑھے اور اوطاس کی طرف حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ طائف والوں نے ہتھیار پھینکے اور اوطاس والے گرفتار ہوئے، بے شمار اسیر ہوئے اور کثیر تعداد میں سامان قبضے میں آیا اور یوں معرکہ حنین سر ہوا۔

غزوۂ حنین کو کئی جہتوں سے امتیازی مقام حاصل ہے ایک تو یہ کہ قرآن پاک نے اس کا بطور خاص ذکر فرمایا ارشاد ہوا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (التوبۃ:25)

''بے شک ہم نے کئی مقامات پر تمہاری مدد فرمائی خاص طور پر غزوہ حنین کے موقعہ پر جبکہ تمہاری کثرت تعداد نے تمہیں نازاں کردیا حالانکہ وہ کثرت تمہارے کسی کام نہ

آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو کر رہ گئی اور تم منہ پھیرے بھاگ اٹھے''۔

اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (التوبہ:25)

کے الفاظ اعلان کررہے ہیں کہ کثرت کے پیمانے کیا ہیں۔ مومن ان سے بے نیاز ہو کر فریضہ جہاد ادا کرتا ہے، وہ فتح کو اللہ کا انعام اور شکست کو آزمائش سمجھتا ہے اور ہر حالت میں راضی برضا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دورِ رسالت مآب ﷺ ہی میں آئندہ کے فتنوں کی جھلک دکھا کر نظریات کا قبلہ درست فرمادیا۔

غزوہ حنین میں ہوازن کا قبیلہ مخالفت میں سب سے آگے تھا اُن کو حضور اکرم ﷺ سے نسبت رضاعت تھی لیکن انہوں نے اس کا لحاظ نہ کیا مگر جب شکست ہوئی اور یہ لوگ اسیران جنگ کی صورت میں سامنے آئے تو اسی رشتے کا سہارا ڈھونڈنے لگے، زہیر بن معاویہ نے دربار رسالت میں رحم کی اپیل کرتے ہوئے کہا ''اے محمد (ﷺ) آپ جانتے ہیں کہ ہم کون ہیں اور جو عورتیں قید میں ہیں وہ کون ہیں یہ سب آپ کی پھوپھیاں، خالائیں اور بہنیں ہیں، وہ ہمارا ہی خاندان ہے جس کا دودھ آپ نے پیا ہے اور وہ ہم ہی ہیں جنہوں نے چھ سال تک آپ کو پالا، کھلایا پلایا اور بڑا کیا ہے آپ تو پھر ہمارے فرزند جلیل ہی نہیں اللہ کے رسول بھی ہیں۔ اگر سلاطین عالم میں سے کسی کو ہم سے یہ رضاعی تعلق ہوتا تو وہ بھی ہم سے رعائت کرتا''۔

اس اپیل سے رحمۃ للعالمین کی آنکھوں میں رحمت کے شبنمی موتی چھلکنے لگے صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا تو پکار اٹھے ''آپ پر ہمارے ماں باپ قربان، آپ کلّی اختیار رکھتے ہیں اپنے ان قرابت داروں سے جو چاہیں سلوک کریں۔'' آپ نے سب کی رہائی کے احکامات صادر فرمادیئے اور ثابت کردیا مسلمان جب غالب ہوتے

ہیں تو کس قدر رحمدل اور صاحب عفو ہوتے ہیں، ان اسیرانِ جنگ میں حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی اور حضور اکرم ﷺ کی رضاعی بہن شیما بھی تھیں آپ نے نہایت محبت سے بلایا، ساتھ رہنے کے بارے میں پوچھا مگر انہوں نے قبیلہ میں واپسی پسند فرمائی اس لئے انعام واکرام کے ساتھ واپس فرمادیا۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت آپ نے نومسلم مکی افراد کو بہت کچھ دیا اس پر نوجوانانِ انصار کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ خون کا نذرانہ ہم پیش کریں اور دولت مکہ والوں کو ملے، آپ نے انصار کو بلایا اور بڑا بلیغ خطبہ دیا کہ یہ دولت تو تالیفِ قلب گی خاطر دی جارہی ہے یادرکھو۔

''اما ترضون ان یذهب الناس بالاموال وتذهبون بالنبی اِلٰی رحالکم فواللہ ما تنقلبون به خیر مما ینقلبون به (صحیح البخاری کتاب المغازی)

کیا تم اس پر راضی نہیں کہ لوگ دولت لے کرلوٹیں اور تم اپنے ساتھ اللہ کا رسول لے کر جاؤ۔ خدا کی قسم جو تم لے جارہے ہو وہ کہیں اُس سے بہتر ہے جو وہ لوگ لے جارہے ہیں اس سے سب کی تسلی ہوگئی اللہ کے رسول کا قرب قیامت تک انہیں حاصل ہوگیا جو ہر شرف سے اعلیٰ ہے۔

الغرض غزوہ حنین مسلمانوں کی عسکری روایت اور اجتماعی زندگی کے لئے ایک نشان راہ ہے۔ اللہ پر بھروسہ نبی علیہ السلام کے قرب کی خواہش، احکامات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش مسلمان کی زندگی کی کامیابی کی ضامن ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ان اصولوں کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

فنِ سیرت نگاری۔ عربی میں

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس تاریخِ انسانی کے ہر طالب علم کی توجہ کا مرکز ہے، آپ ﷺ کی بعثت سے ایک ایسا انقلاب رونما ہوا کہ کوئی تاریخی دستاویز آپ ﷺ کے ذکر اور آپ ﷺ کی ذات وتعلیمات کے اثرات کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

ایک مسلمان کی زندگی میں آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کو جو مقام حاصل ہے اس کی وضاحت قرآن یوں کرتا ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:21)

''یعنی بیشک رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین نمونہ موجود ہے۔''

انسانی خواہشات بے لگام بھی ہوتی ہیں اور ہزاروں بھی، ان منہ زور خواہشات کو ضابطے کا پابند بنانے کے لئے اسوۂ حسنہ کا تفصیلی مطالعہ ہر مسلمان کی ضرورت ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے اس جذبے کے تحت آنحضرت ﷺ کی کتاب زندگی کا ہر ورق تلاش کیا اور آج پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی گوشہ صیغۂ اخفا میں نہیں، یہ وہ شرف ہے جس میں دنیا کی کوئی شخصیت آپ ﷺ کی سہیم وشریک نہیں ہے۔

سیرت کا لغوی معنیٰ چلنا، جانا، چلنے کا انداز وطریق اور حالات وکیفیت ہے،

پھر اس میں اندازِ زندگی اور کردار کا مفہوم بھی شامل ہو گیا، محدثین کے ہاں یہ لفظ ''غزوات'' کا مترادف رہا۔ ''کتاب الجہاد والسیر'' میں جہاد و غزوات کا ہی تذکرہ ہوتا رہا، ابتدائی سیرت نگار غزوات کو بہت اہمیت دیتے رہے اور کتاب المغازی کے عنوان سے غزوات اور زندگی کے دیگر حالات قلمبند کرتے رہے۔ کتب احادیث میں بعض ابواب حضور اکرم ﷺ کے سوانح حیات کے لئے مختص کئے گئے مگر کسی زمانی یا واقعاتی ترتیب کا لحاظ نہ کیا گیا۔ جب کچھ باہمت اہل علم نے آپ ﷺ کی پوری کتابِ زندگی کے احاطے کی کوشش کی تو سیرت نگاری کو ایک فن کا درجہ حاصل ہو گیا۔

ابتدائی سیرت نگاروں میں عروۃ بن الزبیر کا نام ملتا ہے، ان کے بعد عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری اور عبداللہ بن ابی بکر بن حزم نے سیرت الرسول ﷺ پر خصوصی توجہ دی امام شہاب الزہری نے کتاب ''المغازی'' تالیف کر کے اس فن کو مزید تقویت بخشی، امام الزہری کے دو شاگردوں نے اس میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ موسیٰ بن عقبہ الاسدی ایک جلیل القدر تابعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے۔ اور امام مالک اپنے احباب کو فن مغازی میں ان سے استفادہ کا مشورہ دیتے تھے۔ موسیٰ بن عقبہ کے ہاں اختصار مگر صحت واقعہ کا بہت التزام ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان بزرگوں کی نگارشات مکمل شکل میں ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ البتہ بعض سیرت نگاروں اور مؤرخوں نے ان کے حوالے سے بعض روایات محفوظ کی ہیں۔ سیرت نگاری میں سب سے اہم شخصیت محمد بن اسحاق بن یسار کی ہے۔ ابن اسحاق نے سیرت نگاری کو باقاعدہ فن بنا دیا۔ مغازی وسیر پر ایک مفصل کتاب ترتیب دی۔ ان کی معلومات بے پایاں اور حافظہ قابل اعتماد ہے۔

یہی کتاب بعد کی تمام کتب سیرت کا مرجع اور ماخذ قرار پائی۔

ابو محمد عبدالملک بن ہشام (م 218) نے سیرت ابن ہشام ترتیب دی جو مشہور اور متداول کتاب ہے۔ بقول علامہ ابن خلکان ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے مغازی وسیر سے سیرت الرسول ﷺ کو مرتب کیا اور یہی مجموعہ اب سیرت ابن ہشام کے نام سے موجود ہے۔ ابن ہشام نہایت ثقہ اور نامور سیرت نگار ہیں۔ انہیں جزئیات نگاری پر مکمل عبور ہے، لغوی تشریحات نے کتاب کی افادیت بڑھا دی ہے۔ علامہ موصوف کا شعری ذوق ہر ورق پر نمایاں ہے۔ علامہ ابن ہشام نے واقعات نگاری میں شعر سے جا بجا سند لی ہے، اس سے کتاب کا ادبی پہلو بہت نمایاں ہو گیا ہے۔ ابن ہشام کی سیرت رسول ﷺ مشرق و مغرب میں بارہا چھپ چکی ہے اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے تراجم موجود ہیں۔

محمد بن عمر الواقدی سیرت و مغازی کے عالم تھے، اکثر محدثین ان کے ضعف کی نشاندہی کرتے ہیں اور بعض نے ان پر غیر ثقہ ہونے کا الزام بھی لگایا ہے مگر ان کے شاگرد محمد بن سعد جو کاتب واقدی کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک مستند مؤرخ ہیں، ابن سعد کی مشہور کتاب طبقات بارہ جلدوں میں ہے۔ ان میں پہلی دو جلدیں سیرت رسول ﷺ کے لئے مختص ہیں۔ امام محمد بن عیسیٰ ترمذی جامع الترمذی کے مؤلف نے شمائل رسول اللہ ﷺ پر ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے جو نہایت مشہور ہے۔

ان تمام کتب میں مؤلفین نے ویسا ہی انداز روایت اپنایا ہے جو کتب حدیث کے لئے خاص تھا، ہر واقعہ کسی سند سے مربوط ہے اور صحت و روایت کا خاص خیال رکھا گیا ہے، یہ ضرور ہے کہ واقعات کے تسلسل میں کہیں کہیں روایت حدیث کا کڑا معیار برقرار نہ رہ سکا مگر پھر بھی سند کی صحت اور روایت کا ضعف ضرور پیشِ نظر رہا ہے۔

تیسری صدی ہجری کے بعد سے فن سیرت نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی اور کئی قابلِ قدر مجموعے مرتب ہوئے مثلاً

○ حافظ ابوسعید عبدالملک نیشاپوری نے شرف المصطفیٰ آٹھ جلدوں میں مرتب کی علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔

○ علامہ ابن حزم کی جامع السیرۃ مختصر مگر جامع کتاب ہے۔

○ علامہ ابن عبدالبر نے ''الدّرر فی اختصار المغازی والسیر'' میں غزوات اور سیرت کے مختلف پہلوؤں پر عمدہ معلومات فراہم کی ہیں۔

○ علامہ ابن کثیر کی ''السیرۃ النبویۃ'' چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

○ ابوالقاسم عبدالرحمان السہیلی نے سیرت ابن ہشام کی شرح الروض الانف کے نام سے تحریر کی جس نے اکثر کتب سیرت سے بے نیاز کر دیا۔

○ قاضی عیاض کی ''الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ'' ایک معرکے کی کتاب ہے اس میں خصائصِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس قدر معلومات اور اشارات جمع ہیں کہ بعد کے سیرت نگاروں کے لئے یہ ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ ساری کتاب پر محبت و وارفتگی کی فضا طاری ہے اور ہر ہر لفظ قاضی عیاض کی محبت و عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

○ ان کے علاوہ حافظ الدمیاطی نے المختصر فی سیرۃ خیر البشر، علامہ المغلطائی نے سیرت مغلطائی اور علامہ ابن سید الناس نے عیون الاثر، تالیف کیں، عیون الاثر کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ابن سید الناس کو صاحب السیرۃ کا لقب ملا۔

○ علامہ سبط ابن العجمی نے نور النبر اس کے نام سے عیون الاثر کی عمدہ اور

محققانہ شرح تحریر کی ہے۔

○ علامہ ابن قیم کی ''زاد المعاد فی هدی خیر العباد'' مشہور کتاب ہے۔

○ سیرت نگاری میں جس کتاب کو شرقاً غرباً شہرت ملی وہ علامہ ابن حجر القسطلانی کی ''المواہب اللدنیہ'' ہے۔ امام الزرقانی نے آٹھ جلدوں میں اس کی جامع اور محققانہ شرح بھی لکھی جو ایک مشہور کتاب ہے۔ ان کے علاوہ علامہ الشامی کی ''سبیل الہدیٰ والارشاد فی سیرۃ خیر العباد'' اور علامہ الحلبی کی ''السیرۃ الحلبیہ'' بھی جاذب توجہ تالیفات ہیں۔

○ سیرت نگاری کو اس قدر عظمت حاصل ہوئی کہ منظوم سیرت کا رواج ہوا، ابن شہید کی فتح الغریب فی سیرۃ الحبیب دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ الشمس الباعونی نے ''منحۃ اللبیب فی سیرۃ الحبیب'' کے نام سے سیرت مغلطائی کو ایک ہزار اشعار میں نظم کیا۔

○ دورِ حاضر میں بھی سیرت نگاری اربابِ قلم کا مرغوب موضوع ہے، ان دو صدیوں میں متعدد کتب لکھی گئیں۔ محمود شبلی کی حیات رسول اللہ اور الخضری کی ''نور الیقین'' مشہور کتب سیرت میں سے ہیں۔ جدید سیرت نگاروں پر عالم اسلام کی سیاسی وسماجی ابتری کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں سیرت کے ان پہلوؤں کو شعوری اہمیت دی گئی جن سے تمسک موجودہ اضمحلال اور پریشانی سے نجات کا باعث بن سکتا ہے۔ آزادی کی تڑپ نے الشرقادی سے محمد رسول الحریۃ اور قائدانہ صلاحیتوں کی بحالی کی خواہش نے محمد عبدالفتاح ابراہیم سے ''محمد القائد'' لکھوائی۔ اخلاقی ادبار سے نجات اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے اظہار نے محمد احمد سے

محمد المثل الکامل مرتب کروائی۔ عباس محمود العقاد دورِ حاضر کا نامور مؤرخ و فلسفی، عبقریۃ محمد ﷺ کا مصنف ہے۔اس کی باریک بین نظر سیرت کے ان پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں ماہر ہے جن کی اتباع وقت کی ضرورت ہے۔محمد حسین ہیکل کا انداز اگرچہ قدیم ہے مگر اس میں واقعات کے تجزیئے کی بے پناہ قوت موجود ہے۔ مستشرقین کی زہر آلود تحریروں کا علمی و تحقیقی رد اس کی تالیف حیاۃ محمد ﷺ کا نمایاں وصف ہے۔

برّعظیم پاک ہند میں قابل فخر علماء نے تفسیر وحدیث کی خدمت کے ساتھ ساتھ فن سیرت نگاری میں بھی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔نہایت ابتدائی دور میں ہی ابومعشر السندھی نے سیرت رسول اللہ ﷺ اور غزوات پر المغازی تحریر کی شیخ زین الدین المعبری نے سیرت النبی پر قلم اٹھایا مگر بدقسمتی سے مکمل نہ کر سکے۔شیخ جمال الدین بحرق الحضرمی نے سلطان احمد المظفر بن محمود گجراتی کے لئے "تبصرۃ الحضرۃ الشاہیہ الاحمدیۃ بسیرۃ الحضرۃ النبویۃ" کے نام سے ایک نادر تصنیف کی جو کتب متقدین کا ملخص ہے۔علامہ عبدالاوّل بن العکاء الحسینی نے مختصر السیرۃ النبویۃ تحریر کی۔ حسن بن علی بن شدقم نے "زہر الریاض وزلال الحیاض" کے نام سے ایک مفید کتاب لکھی۔اس میں علامہ موصوف نے قدماء کی تالیفات پر خوب اضافے کیے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مطلع الانوار الہیہ فی الحلیۃ النبویۃ تحریر کی جس میں فارسی کے ساتھ ساتھ عربی میں بھی قلم کی جولانیاں دکھائیں۔بدقسمتی سے یہ کتاب ابھی تک شائع نہ ہو سکی۔

عبدالقادر العیدروس نے اپنی مشہور کتاب "النور السافر" کا پہلا حصہ سیرت کیلئے مخصوص کیا۔اس کے علاوہ انہوں نے "اتحاف الحضرۃ العزیزۃ"، "العیون السیرۃ الجیزۃ"

دو جلدوں میں تالیف کی۔پہلی جلد سیرت پر ہے جبکہ دوسری جلد میں عشرہ مبشرہ کے حالات ہیں۔

شیخ محمد صدیق لاہوری نے "سلک الدررّ الاکمل للرسل الاطہر" کے زیر عنوان ایک مسجع اور مقفیٰ عبارت میں بے نقط سیرت تحریر کی، بقول فقیر محمد جہلمی یہ کتاب صنعت اہمال میں فیضی کی سواطع الالہام سے کہیں بہتر ہے۔

مولانا ولی اللہ فرنگی محلی نے کشف الاسرار فی خصائص سید الابرار ﷺ کے نام سے سیرت لکھی ،مگر سب سے زیادہ شہرت مولانا کرامت علی کی "السیرۃ المحمدیہ" کو حاصل ہوئی۔ڈاکٹر زبید احمد صاحب کے خیال میں برعظیم پاک و ہند میں سیرت کے موضوع پر عربی زبان میں یہ سب سے زیادہ قابل فخر کتاب ہے۔600 صفحات کی یہ کتاب جنگ آزادی 1857ء کے بعد لکھی گئی اور نظام حیدرآباد دکن کے نام معنون کی گئی۔صحت روایات پر مصنف کی محنت قابل داد ہے۔

سیرت نگاری کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔سیرت کے مواد کی فراہمی اور ان کی ترتیب وتہذیب فن سیرت نگاری کا وہ محیر العقول کارنامہ ہے جس کی نظیر کسی مذہب یا قوم میں موجود نہیں، یہ سب محبت کے کرشمے اور آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس سے عقیدت کے مظاہر ہیں۔

سیرت نگاری اور عصرِ حاضر

سیرت کا لغوی معنیٰ اگرچہ طریق حیات اور حالات و کوائف ہے، محدثین کے ہاں یہ لفظ غزوات کا مترادف رہا، کتاب الجہاد والسیر میں غزوات کا ہی تذکرہ ہوتا رہا، سیرت نگاروں کے ہاں غزوات کے بیان کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی، کتب احادیث میں بعض ابواب حضور اکرم ﷺ کے سوانح حیات کے لئے بھی مختص کئے جاتے رہے مگر یہ سوانح کسی زمانی یا واقعاتی ترتیب کے ساتھ نہ تھے مگر جلد ہی احساس ہوگیا کہ حیات رسول ﷺ کو واقعاتی ترتیب کے ساتھ مدوّن ہونا چاہئے تا کہ قاری ایک مربوط اور مجموعی تاثر لینے کے قابل ہو سکے، بعض باہمت اہل علم نے اس جانب توجہ دی اور پوری زندگی کے احاطے کی کوشش کی، اس منضبط طرزِ تحریر نے سیرت نگاری کو ایک فن کا درجہ دے دیا، یہ میلان انسانی رویوں میں ابتداء ہی سے موجود رہا ہے کہ نمایاں واقعات اور اثر آفریں کردار کو محفوظ کیا جائے تا کہ وہ بعد کے لوگوں کے لئے تشکیل کردار کے لئے معاون ثابت ہو اس نقطہ نظر سے بہت سی شخصیات کے کوائف قلمبند بھی ہوئے اور راہنمائی کا ذریعہ بھی بنے۔

حضور اکرم ﷺ کی ذات چونکہ بہت زیادہ اثر آفریں تھی کہ اسی کے اثرات انسانی زندگی کے تمام گوشوں تک محیط تھے، اس لئے یہ ذاتِ مکرم تاریخ کے صفحات پر سب سے زیادہ درخشندہ رہی، پھر آپ ﷺ کی تعلیمات پر ایمان لانے والوں کے لئے یہ نبوی زندگی اسوۂ کامل بھی تھی اور نجات کا وسیلہ بھی، اس لئے امت کے ہر

پڑھے لکھے انسان کی نظریں اس پر مرکوز ہوگئیں ابتدائی دور میں ہی یہ موضوع لائق توجہ رہا اور متعدد کتب تالیف ہوئیں، پھر تو یہ سلسلہ پوری قوت سے آگے بڑھتا گیا کہ ہر دور، ہر عصر اور ہر علاقے میں سیرت نگاروں کی کثیر تعداد پیدا ہوئی اور سیرت نگاری کی روایت مسلسل تابندہ سے تابندہ تر ہوتی گئی۔

سیرت نگاری کے محرکات میں سے نمایاں تر یہ تھے:

1- اُسوۂ رسول اکرم ﷺ سے باخبری کہ یہ نجات کا ذریعہ اور مومنانہ زندگی کا معیار ہے۔

2- تاریخی تسلسل سے آگہی کا شعور کہ کس طرح تاریخ خمول سے اجالوں میں نمودار ہوئی۔

3- ایک کامیاب مشن کے اسباب و محرکات کو جاننے کی کوشش تا کہ راہنمائی حاصل کی جاسکے۔

4- نسلِ آدم کے سفرِ حیات میں ایک اہم موڑ جس نے انسانی زندگی کا روح سے جسد تک کا رویہ بدل ڈالا اس کے بارے میں حقائق کی تلاش کا جذبہ۔

5- معاندین کا تجسس کہ کس طرح اس قافلۂ خیر کی رفتار کو روکا جاسکے۔

6- اسلام کے مقابل مذاہب کا ردِّ عمل۔

7- ایک روحانی تحریک کے خلاف مادی روش کی مخاصمت۔

یہ تھے وہ محرکات جو سیرت نگاری کو مہمیز دے رہے تھے، صدیوں کا تناظر ظاہر کرتا ہے کہ موافق و مخالف ہر سمت میں سیرت نگاروں نے اپنا حصہ ڈالا، اس طرح سیرت نگاری کا فن دنیا کے اہم فنون میں شمار ہونے لگا، ہر دور کے نظریات، میلانات

اور رجحانات نے سیرت نگاری پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی، کسی حد تک یہ کوششیں کامیاب بھی ہوئیں مگر اُسوہ حسنہ تک رسائی کی مومنانہ خواہش نے سیرت نگاری کو اپنے حصار میں رکھا۔ اگرچہ واقعات کو دل پسند ترتیب اور ان سے اپنی خواہش کے مطابق استخراج ہر دور میں جاری رہا، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ حقائق کے ساتھ ساتھ کمزور روایات کا ایک ذخیرہ بھی اکٹھا ہو گیا جو معاندین کے لئے تسلی کا سامان فراہم کرتا رہا، تاریکی کے ان سایوں سے روشنی کی کرن تلاش کرنا مستند مورخین اور باصلاحیت سیرت نگاروں کا ہر دور میں فریضہ رہا اور محققین آج تک یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

سیرت نگاری کا فن موافق و مخالف فضا میں اپنا تشخص برقرار رکھنے کی کوشش کرتا آیا تھا کہ مغربی استعمار کا ظہور ہوا، عالم اسلام پسپائی کی دلدل میں اترنے لگا، مسلم حکومتیں ہی برباد نہ ہوئی تھیں، مسلم اذہان بھی ملوث ہونے لگے تھے طاقت کا گھیرا ہمہ جہتی تھا، مسلم فکر پر شب خون مارے جا رہے ہیں اس نبرد آزمائی کے نتیجے میں دانش کے معیار بدلنے لگے تھے، اسلام کی روحانی قوت جو مادی سربلندی کی اساس تھی، دشمن کے نزدیک اصل ہدف تھی یہ ظاہر تھا کہ مسلم امت کو اپنے نبی ﷺ سے قلبی گرویدگی ہی اس امت کی قوت ہے کہ زوال کے اسباب میں سب سے بڑا سبب اسی مرکزی اساس سے پہلو تہی تھی، حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ فرماتے ہیں:

دلے دارند و محبوب نہ دارد

اب سوال یہ تھا کہ دل سے اس محبوب کو جدا کیسے کیا جائے کہ اس کی موجودگی میں دلوں کی دنیا آباد رہے گی اور اضمحلال کی صورت گری نہ ہو سکے گی، یہی وہ

جذبہ محرکہ ہے جس کو کمزور کرنے کے لئے سیرت نگاری کے ایقان میں انتشار پیدا کیا گیا، مغربی رابطوں کے بعد کی سیرت نگاری اسی اثر پذیری کی نمائندہ ہے، اسی سلسلے میں کون کون سے اقدامات کئے گئے، ذرا غور فرمائیے:

☆ سیرت کے مستند واقعات کو کمزور روایات کی بنا پر رَد کرنے کی روش عام ہوئی۔

☆ واقعات سیرت میں تشکیک کے میلان کو عام کیا گیا۔

☆ روایات کے استناد کو شک کی نظروں سے دیکھا گیا۔

☆ نبوی منصب کے حوالے سے معجزات کی اہمیت مسلّم تھی، ان معجزات کو مادی نقطہ نظر سے ماروائی حکایات کا روپ دیا گیا۔

☆ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلم اذہان میں تشکیک کا بیج بویا گیا جس سے بعض قلمکار متاثر ہوئے اور بعض نے غیر شعوری اثر قبول کیا۔

ان میلانات کے باوجود سیرت، اس قدر درخشاں تھی کہ اصحاب فکر و دانش معاندت کے باوجود اس کی رفعتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے، مغربی سیرت نگار اسی دوراہے پر کھڑے ہیں کہ بے شمار اوصاف کا شمار کرتے ہیں مگر کبھی شعوری طور پر یا کم از کم ذاتی رجحان کے زیر اثر غیر شعوری طور پر تضادات بلکہ بزعم خویش غیر معیاری استخراج کی نفی بھی کرتے ہیں، انسانی فطرت ہے کہ وہ جن حقائق کو تسلیم کرتا ہے، ان کے خلاف کسی حقیقت کو بھی تسلیم نہیں کرتا، مغربی مصنفین اور مستشرقین اسی میلان کا شکار ہیں مگر اس کے باوجود تاریخی حقائق پر اعتماد کرنے والے صداقتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، ایک مسلمان سیرت نگار کو ان عناصر سے باخبر رہنا چاہئے اور خُذ ما صفا اور دع ما کدر، کے زریں اصول کے تحت اخذ و ترک کا سلسلہ قائم کرنا چاہئے۔

مسلمان سیرت نگاروں کے ہاں تین طرح کے مؤلفین پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو متاثرین میں سے ہیں اور واضح طور پر قدیم روایات کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو مغربی افکار سے انتخاب کرنے کے بجائے اُن کو مکمل طور پر قبول کرنے پر فخر کرتے ہیں اور بیشتر روایات کارد کرتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جن کا علمی وقار برقرار ہے، وہ اسلامی دنیا کی روایات پر اعتماد کرتے ہیں اور سرتاپا قدیم روشِ علم کے علمبردار ہیں، تیسرا گروہ اُن علماء کا ہے جو روایات میں پختہ ہیں اُن پر اعتماد بھی کرتے ہیں، اس اعتماد وایقان کے باوجود شعوری یا غیر شعوری طور پر بعض جزئیات میں تاثر پذیری کا شکار ہوتے ہیں، ہمیں صرف ان علماء کا تذکرہ کرنا ہے جو لائق اعتماد ہیں۔ علم روایت میں پختہ ہیں اور استخراج میں کامل دسترس بھی رکھتے ہیں مگر کسی نہاں خانہ میں مغربی اثر آفرینی سے مرعوب بھی ہیں، ان میں سرسید احمد خاں بھی ہیں جن کی علمی سطوت اور دردمندی سے انکار نہیں مگر ان کے ہاں اس قسم کے اثرات بھی نمایاں ہیں خصوصاً معجزات کے حوالے سے، مگر ہم جس سیرت نگار کا تذکرہ کریں گے وہ نہایت قابل اعتماد، بلاخوفِ تردید محقق، بے پناہ علمی وقار کا حامل ہے اور ایک صاحبِ طرز ادیب ہے، ہماری مراد مولانا شبلی نعمانی سے ہے جن کی سیرت پر کتاب اس دور کی اہم ترین تصنیف ہے، حقائق شناسی میں دقیع مقام رکھتے ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اپنے ماحول سے اثر پذیر ہوتا ہے اور کبھی یہ اثر پذیری حد سے بڑھ جاتی ہے اور قارئین پر اپنے اثرات چھوڑتی ہے، مثال کے طور پر علامہ شبلی نعمانی سیرۃ النبی ﷺ کے تمہیدی باب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھایا گیا تھا اس سے یہ مُراد تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں بلکہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے جائیں، تورات میں جا بجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی خواب کو عینی خیال کیا اور بعینہٖ اس کی تکمیل کرنی چاہی گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیاء سے ہوسکتی ہے گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی بلکہ خدا اس پر متنبہ کر دیتا ہے۔ اس بناء پر گو حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی فعل سے روک دیئے گئے تھے لیکن خدا نے ان کی حسن نیت کی قدر کی اور فرمایا:

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (الصافات:105)

''تو نے خواب کو سچا کیا ہم اس طرح نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں''

(سیرت النبی ﷺ جلد 1: صفحہ 101,201)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظیم قربانی کو اجتہادی غلطی کا نتیجہ مان لینا کسی لحاظ سے بھی ملت اسلامیہ کے صدیوں کے تعامل کی پاسداری نہیں ہے۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا کا الٰہی فرمان خواب کی درست تعبیر پر شاہد ہے، درست عمل کا ظہور ہی خواب کی درست تعبیر تھا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کا ذکر اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کیا اور اس کی تعبیر پر رائے پوچھی، وہ صاحبزادہ جس کی زندگی کا فیصلہ ہو رہا تھا اور وہ خود معصومیت کی دہلیز پر کھڑا تھا، پکار اٹھا کہ:

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ

(الصافات:102)

''ابا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کر گزریئے، خدا نے چاہا تو میں ثابت قدم رہوں گا۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام خواب کی تعبیر یہ کر رہے ہیں کہ یہ حکم ہے اور صابر رہنے کا اعلان بھی کر رہے ہیں، ایک نبی کا خواب ہے دوسرے معصوم نبی کی تعبیر ہے، اس لئے تاویل کی گنجائش نہیں ہے، سید سلیمان ندوی کا تبصرہ بھی یہ ہے کہ:

''ہیچمدان جامع کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے۔''

(سیرت النبی 741 صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

بحیرہ راہب کے واقعہ میں بھی روایت کے استناد کے حوالے سے واقعہ کی تردید ہے مگر جذبہ محرکہ وہی ہے کہ اس پر یورپی سیرت نگاروں کے استخراجات ہیں جن سے انکار مقصود تھا مگر واقعہ کی ہی نفی کر دی گئی۔

عصر حاضر میں سیرت کے واقعات میں سے زیادہ توجہ کا مرکز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ پیدائش ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب سے اہم موضوع ہے جس پر خامہ فرسائی کا موقعہ موجود ہے، 12 ربیع الاول کی شہرت اور چند روایات کی مطابقت نہ معلوم کون سے شرعی حکم سے انکار تھا کہ اس پر بہت محنت کی گئی ہے۔علامہ شبلی کا ذوق بھی 12 سے موافقت نہیں رکھتا مگر انہوں نے اس پر بحث کو روایات کی تطبیق پر محمول نہیں کیا، محمود پاشا فلکی کا حوالہ دے کر اپنی تحقیق کو اس کی رائے کا پابند بنا دیا ہے، قاضی سلمان منصور پوری نے یہی تحقیق اپنی کاوش کا نتیجہ قرار دے کر نقل کر دی ہے، یوں احساس ہوتا ہے کہ صدیوں سے ملت اسلامیہ درست استخراج پر پہنچنے کی توفیق نہیں پا سکی، پھر یہ معاملہ روایات کی تنقیح وتوضیح کا تھا جس پر درایت کے اصولوں کے تحت بحث مناسب تھی، درایت بھی تو روایات پر انحصار کرتی ہے، موجود روایات ہی

بنیاد بنتے ہیں، درایت نئی روایت تراشنے کی راہ تو نہیں دکھاتی، یہ طرز استدلال آہستہ آہستہ اس قدر پختہ ہوتا گیا کہ بعد کے سیرت نگاروں نے اس سے بڑے بڑے انکشافات کئے مثلاً۔حال ہی میں چھپنے والی منصور احمد بٹ کی کتاب نے اس بیان پر اکتفا کیا ہے:

''ریاضی کی جدید تحقیق کے مطابق 9 ربیع الاول اور دوشنبہ (پیر) کا دن تھا، عیسوی کی تاریخ 22 اپریل 175ء تھی، مشہور سکالر ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق 17 جون 966ء بروز پیر ہے، جمہور اور عام مؤرخین 12 ربیع الاول اور عام الفیل تسلیم کرتے ہیں، بعض مؤرخین بروز پیر اور ابرہۃ الاشرم کے کعبۃ اللہ پر حملہ کے 55 دن بعد بتاتے ہیں۔

(پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیارا بچپن، صفحہ 12)

یہ سب استدلال ریاضی کی جدید تحقیق کی بنا پر ہے مگر عرفان رضوی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''جمہور یعنی عام مؤرخین کے نزدیک اصحاب فیل کا واقعہ 20 محرم 1 میلادی 2 مارچ 175ء ہفتہ کے دن پیش آیا تھا، اس کے 50 دن بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت طیبہ 12 ربیع الاول 1 میلادی 22 اپریل 175ء سوموار کو ہوئی، یہ تاریخیں ریاضی کے تمام کلیوں کے مطابق بالکل صحیح ہیں، بعض جدید قسم کے مؤرخین نے انگریزوں کی نقل کر کے اصحاب فیل کے واقعہ کی تاریخ 17 محرم لکھ کر اس کے 50 دن بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت طیبہ 9 ربیع الاول لکھی ہے لیکن وہ کسی کلیے کے مطابق درست نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت مقدسہ اور رحلت طیبہ کے دونوں دن سوموار ہیں اور ولادت مقدسہ کا سوموار 12 ربیع الاول اور 22۔اپریل ہی کو آتا ہے''

(صفحہ 17: سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرفان رضوی)

اس طرح تاریخ ولادت کے بارے میں آراء کی کثرت نے یہ صورتحال پیدا کردی کہ ''شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا'' یہ ایک واقعہ نہیں جو انتشار کا شکار ہوا، حد یہ ہوئی کہ رحلت طیبہ کو بھی دلائل کے تنوع نے مشکوک بنا دیا، ہم اس تفصیل میں جائے بغیر صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ تاریخی واقعات چونکہ روایات کی بنیاد پر ترتیب پاتے ہیں اور روایات میں متعدد اسباب سے قدرے اختلاف ممکن ہے۔ اس لئے ان تمام روایات کو ماخذ تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہی جاننا چاہئے اور ان اختلافات کو ایک علمی بحث تک ہی محدود رکھنا چاہئے کہ صدیوں کا تعامل بھی ایک دلیل ہوتا ہے اور عمل کا تواتر بھی ایک سند رکھتا ہے۔ ان مختلف آراء کو مسلک و مذہب میں افتراق کا ذریعہ نہ بننا چاہئے، انکشافات تو ہوتے رہیں گے مگر یہ انکشافات جب تک قبولِ عام کا اعتماد حاصل نہیں کرتے اسے اختلاف کی بنیاد نہ بننا چاہیے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی تحقیقی پیش رفت پر امکانی حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے، ہوسکتا ہے بعد کا کوئی مورخ یا محقق اس سے زیادہ مضبوط دلیل لے آئے جو سابقہ اعتماد کو متزلزل کردے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ سیرت نگاروں کے ہاں یہ روش پلنے لگی ہے کہ وہ اپنے استخراج اور خیال کو ہی حرفِ آخر سمجھنے لگے ہیں اس طرح استخراجات کے ٹکراؤ کا سماں پیدا ہوگیا ہے، سیرت نگاری حقائق کے بیان پر مشتمل ہے کہ یہ عام تاریخ سے نازک تر ہے اس کی حکایت سے صرف معلومات حاصل کرنا مقصود نہیں بلکہ ان حقائق کو اُسوۂ حسنہ بھی بننا ہے اس لئے یہاں زیادہ احتیاط لازم ہے مگر بعض اوقات ایسا نہیں ہوتا، من پسند استخراج کو تاریخی حقائق پر ترجیح دی جاتی ہے جس سے غیر مستند نتائج اخذ کر لئے جاتے ہیں، یہ روش ان دنوں عام ہوتی جارہی ہے

اس بیان کی صداقت ایک ہی مثال سے واضح ہوسکتی ہے۔

سیرت نگار صدیوں سے بیان کرتے رہے کہ آنحضرت ﷺ کو رضاعت کے لئے حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کیا گیا تھا، اس واقعہ کے ذکر میں یتیمی کا بیان بھی ہوا، اہل ثروت کے بچوں کی ترجیح کا بھی تذکرہ ہوا اور دودھ پلانے والی عورتوں اور اُن کی مالی دشواریوں کا ذکر بھی کیا گیا، مگر بعض سیرت نگاروں کی عقل پسندی ان روایات کو تسلیم کرنے کے باوجود اس سارے واقعے سے انکاری ہے ان کے دلائل کس نوعیت کے ہیں، سنئے اور فیصلہ کیجئے۔

غازی محمد اسحاق اپنی کتاب 'اَلصَّدَفُ الفرات' میں لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ اپنی والدہ محترمہ کے اکلوتے فرزند ارجمند تھے، پیدائش کے بعد اپنی والدہ کے دودھ پر پلنے لگے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی بھی تائید ہوگئی کہ مائیں اپنے بچوں کو دوسال دودھ پلائیں چنانچہ حضور ﷺ نے بھی دوسال تک اپنی والدہ ماجدہ کا دودھ پیا، یہ روایت کہ آپ نے دوسال تک لونڈیوں کا دودھ پیا بالکل غلط ہے، آپ ﷺ کی والدہ کے دودھ کو کیا ہوگیا تھا کہ اُس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے سینے سے جدا کر کے حلیمہ کے سپرد کردیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ تو اپنے بچے کو جدا کر کے بے قرار ہوگئی تھیں، سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کو اپنے بچے سے کوئی محبت نہ تھی یا اس کی ممتا کمزور تھی، کسی ماں کی ممتا اپنے نومولود بچے کو خود سے جدا نہیں کرسکتی یہ خلافِ فطرت اور ناممکن بات ہے خاص طور پر سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا جن کا خاوند پہلے ہی فوت ہو چکا ہو اور ان کا اور کوئی بچہ نہ ہو تو یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اپنے نومولود لختِ جگر کو کسی بدّو عورت کے سپرد کردیا ہو کہ وہ صحرا میں لے جائے، لہٰذا یہ

روایت سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔" (الصوف الفرات ص:45)

غور فرمائیے کہ ایک مشہور روایت کی تردید عقلی استدلال کی بنیاد پر کی جا رہی ہے، کیا جو واقعہ کسی مؤلف کے عقلی معیار پر پورا نہ اُترے وہ رد کرنے کے لائق ہے خواہ مستند روایات کی کثیر تعداد صحت واقعہ ثابت کر رہی ہو، اگر ایسے ہی استدلالات کی اساس پر واقعات غلط ثابت ہونے لگیں تو ہر واقعہ متعدد صورتیں لے لے گا، کہ استخراجات کا تنوع عام ہے۔ واقعات کی یہ تردید اسی پر اکتفا نہیں کرتی یہ بھی ثابت کیا جا رہا ہے کہ کم آمدنی یا مفلسی کا بیان بھی خلافِ حقیقت ہے کہ حضرت عبدالمطلب تو سردارِ مکہ تھے اس لئے یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ مکہ مکرمہ کے امراء میں شمار ہوتے تھے حالانکہ قرآن مجید نے "عائلا" کا ذکر کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ یہ مؤلف کے ہاں قابل قبول نہیں کہ صحت کی استواری کے خیال سے صحرا میں بچے بھیجے جاتے تھے، مکہ مکرمہ کی فضا کونسی مسموم تھی، یہ روایت کہ صحرا میں بھیجنے کی ایک وجہ زبان کو فصاحت کا جوہر عطا کرنا تھا، مؤلف کہتے ہیں کہ قریش کی زبان تو فصیح تر تھی کسی اور قبیلے میں جانے کی کیا ضرورت تھی، یہ استخراج مستند روایات سے انکار ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ سے فصاحتِ کلام کا پوچھا گیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

"میں قریش میں سے ہوں اور میرے فصیح ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں قبیلہ بنی سعد میں پلا ہوں۔"

(رحمۃ للعالمین ﷺ اور امن عالم، پیر محمد اسلم گل بحوالہ طبقات ابن سعد)

اس روایت کے بارے میں عرفان رضوی کہتے ہیں:

"جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے بنو سعد سے فصیح عربی سیکھی غلط کہتے ہیں انہیں کسی نبی کے مرتبے کا صحیح اندازہ نہیں۔" (سرکارِ دو عالم ﷺ: صفحہ 06)

جبکہ مولانا شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

"ثویبہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو دودھ پلایا، اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے رؤسا اور شرفاء شیر خوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے، یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بچے بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے اور عرب کی خاص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں۔ ولید بن عبدالملک خاص اسباب سے نہ جا سکا اور حرم شاہی میں پلا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان بنو امیہ میں صرف ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی فصیح نہیں بول سکتا تھا۔"

(سیرت النبی ﷺ جلد اول صفحہ 511)

ان شواہد سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عصرِ حاضر کے بعض سیرت نگار اپنی عقل و فہم پر اس قدر بھروسہ کرنے لگے ہیں کہ روایات کی حقیقت ان کے نزدیک ناقابل اعتماد ہو گئی ہے، یہ تسلیم کہ روایت کی پرکھ درایت کے اصولوں کے تحت ہی ہوتی ہے مگر درایت کی حدود، روایات کی پابند ہیں، یہ ہوش و فہم سے روایت کئے گئے واقعات کو پرکھنے کا نام ہے، اس سے ہرگز یہ مُراد نہیں کہ سب روایات سے انکار کر دیا جائے کہ وہ کسی مؤلف کو قبول نہیں ہیں، یہ رویہ درحقیقت اُس مرعوبیت کا نتیجہ ہے جس میں مستشرقین کی آراء کی قدر و قیمت جائز حدود سے بھی بڑھ کر تسلیم کر لی گئی ہے، اس کی ایک مثال جو ذاتی تجربے میں آئی ہے درج کی جاتی ہے۔

مشہور مستشرق لی بان کی کتاب "تمدنِ عرب" کے نام سے اردو میں ترجمہ ہوئی اور انیسویں صدی کے آخر میں چھپی جس کو دوبارہ مقبول اکیڈمی لاہور نے شائع کیا، لی بان کافی حد تک مستند مؤرخ ہے، اس کا طرز استدلال بھی لائق اعتماد ہے،

کتاب بہت سی خوبیوں کی حامل ہے اور قارئین کو بڑی حد تک علمی ثروت عطا کرتی ہے مگر ان سب خوبیوں کے باوجود اس کتاب میں آنحضور ﷺ کے حوالے سے بعض دل آزار جملے موجود ہیں۔ امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے بارے میں بھی ایسے بیانات درج ہیں جو جسارت کی انتہا ہیں، یہ کتاب مقبول اکیڈمی لاہور نے سید علی بگرامی کے ترجمے میں شائع کی، مجھے اس کتاب کے چند جملے صدمے کا باعث بنے۔ اس کے ازالہ کے لئے میں نے پاکستان ٹائمز لاہور کو ایک خط لکھا جو اکیس دسمبر 1962ء کی اشاعت میں چھپا، صرف اتنی گذارش کی گئی تھی کہ مسلمان مترجم پر لازم تھا یا اب مقبول اکیڈمی کا فرض تھا کہ ایسے جملوں کے بارے میں حاشیہ میں وضاحت کردی جاتی، یہ بھی یاد رہے کہ کتاب میں متعدد حواشی موجود تھے، اگر نہ تھے تو عصمت رسالت کے حوالے سے نہ تھے، یہ تھا مختصر سا خط مگر حیرت ہوئی کہ ایک لائقِ احترام استاد جن کی بہت سی نگارشات اسلام کے حوالے سے مارکیٹ میں آچکی تھیں اور جو ایک مستند مصنف سمجھے جاتے تھے، کا خط جنوری سات کو اسی اخبار میں شائع ہوا، خط کیا تھا مغربی مستشرقین کو بھرپور خراج عقیدت تھا اور لی یان کی کاوش کو غیر مشروط سراہا گیا تھا حتیٰ کہ یہ بھی لکھ دیا گیا کہ اس کتاب کے لئے نظریں ترس رہی تھیں، یہ سب کچھ بجا بھی ہو مگر یہ لکھنا کہ اس میں تو کوئی چیز جذبات کو برانگیختہ کرنے والی نہ تھی۔ کس حد تک مناسب تھا۔

مجھے اس قدر مرعوبیت پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی، کیا ہم اس قدر گرویدگی کا شکار ہیں کہ اپنے رسول محترم ﷺ کے بارے میں اتنے زہر آمیز بیانات بھی برداشت کرلیں گے، صرف اس لئے ایک مستشرق کا انتخاب قلم ہیں اور کیا ان کی نشاندہی بھی گناہ ہے اور علم دشمنی ہے۔ یہ طریقہ اخذ وترک ہی سیرت نگاری کو اتحاد ملت کا ذریعہ بنانے کے بجائے افتراقِ امت کا محرک بنا رہا ہے اور سیرت مطہرہ

خواہشات کے حصار میں قارئین تک پہنچ رہی ہے۔

ضرورت یہ ہے کہ سیرت مطہرہ کو حقائق کی اساس پر تالیف کیا جائے تا کہ یہ اُسی کے حساب سے کسبِ فیض کی اساس بنے، چند گزارشات لائق توجہ ہیں:

1- سیرت کو لائقِ اعتماد روایات کے سہارے مدوّن کیا جائے۔

2- سیرت نگاری صادق وامین کا تذکرہ ہے اس لئے صداقت کو راہنما بنایا جائے۔

3- پسند ونا پسند کو سیرت نگاری میں دخل اندازی سے روکا جائے۔

4- مسلکی اختلافات کو سیرت کی تفہیم میں حائل نہ ہونے دیا جائے۔

5- سیرت نگاری پر قلم اٹھانے والے ہر صاحبِ علم کو قرآن، حدیث اور سیرت کے مطالعہ پر مداوت کرنی چاہئے تا کہ چند واقعات دیگر حقائق کی نفی کا سبب نہ بنیں۔

6- ایک سیرت بورڈ قائم کیا جائے جس کے اراکین مسلکی تعصب سے ہٹ کر علمی وتحقیقی بنیاد پر انتخاب کئے جائیں۔

7- حالات کی نزاکت تقاضا کرتی ہے کہ ہر شائع ہونے والی کتاب کو اس مجوزہ بورڈ کے سامنے لایا جائے تا کہ غیر مستند واقعات فروغ پذیر نہ ہوسکیں۔

8- ادارہ تحقیقات اسلامی کو اس سمت مثبت اقدام کرنا چاہئے۔

9- اس ادارے کا مقصود اتحاد امت ہوتا کہ افتراق کی صورت گری نہ ہوسکے۔

مختصر یہ کہ سیرت نگاری ایک مشن ہے......ایک مقدس تحریک ہے اس لئے اس میں بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

عصرِ حاضر میں مطالعہ سیرت کی ممکنہ جہتیں

سیرت کے لغوی مفاہم میں چلنے اور چلنے کے انداز کے علاوہ طریقِ زندگی اور صورتِ کردار کا مفہوم بھی شامل ہے، اس کی توسیع میں زندگی گزارنے کا ہر پہلو اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ حیاتِ انسانی کا ہر مادی اور روحانی رُخ نمایاں ہونے لگا ہے، غرضیکہ سیرت نگاری وجود کو بہر طور اور بہر صورت آشکار کرنے کا نام ہے، اصطلاحاً سیرت کا لفظ، ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے حالات، خصائص اور شمائل کی حکایت کے لئے مختص ہو گیا ہے، سیرت کا دائرہ کار چونکہ پوری حیات کو محیط ہے اس لئے اس کا پھیلاؤ بھی بے کنار ہے، یہ صورتِ حال جہاں وابستگی کی ہمہ گیری پر دلالت ہے، وہاں مشکلات کی نشاندہی بھی کرتی ہے کہ کوائف کی رنگارنگی وسعتِ معلومات کی متقاضی ہے اور اس قدر وسیع مطالعہ ہر صاحب بیان وتحریر کے بس میں نہیں ہوتا ،یہیں سے مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے اور اختلافات کی کثرت کے اسباب کی نشاندہی ہوتی ہے مگر داد دیجئے سیرت نگاروں کو کہ وہ ہر دور اور ہر صدی میں اس تجسس میں رہے کہ واقعات شماری میں اخذ وترک کا قابلِ اعتماد معیار قائم کر سکیں، یہی ان صاحبانِ عزم کی ہمت کی دلیل ہے کہ آج بھی کوئی انسان خلوصِ نیت سے اُس حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کرنا چاہیے تو کوئی خلجان راہ نہیں کاٹتا، وہ کامل وجود اور وہ بے مثل حیات آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے، تیرسٹھ سالہ زندگی کا لمحہ لمحہ آج بھی دمک رہا ہے، سچ کہا تھا ایک صاحبِ نظر نے۔

کروڑوں سال پر پھیلے ہوئے ادوارِ نسیاں میں
تیریسٹھ سال تیری زندگی کے بس یادگار آئے

ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ ایک لاکھ سے کہیں زائد انسانوں کی نظریں اُس وجودِ مقدس پر مشتاقانہ لگی ہوئی تھیں یہی وجہ ہے کہ اُس وجودِ مکرم کا ہر پہلو دن کی پوری روشنی میں ہے، روایات کا قدرے اختلاف تو بصارتوں کا تفاوت ہے یا چندھیائی ہوئی نظروں کا شاخسانہ ہے، سوال یہ ہے کہ وہ محرک کونسا تھا جس نے اس وسعتِ مطالعہ کو جنم دیا ہے وگرنہ تاریخ شاہد ہے کہ قرطاس زندگی پر دائمی نشان چھوڑنے والوں کی زندگیوں کے بھی خاص خاص لمحے محفوظ ہوتے ہیں، بڑے سے بڑا جہاں دار بھی جزوی حیات کا ہی اہل بھرتا ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے تو سکندرِ اعظم کے حوالے سے کہہ دیا کہ

تاریخ دان بھی اُسے پہچانتا نہیں

مجموعی زندگی، تاریخ انسانی کے صفحات میں اگر تابندہ ہے تو وہ صرف ایک وجودِ گرامی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے وگرنہ زندگی کے چند لمحات ہی تاریخ کا حصہ بنے ہیں، اس ہمہ زندگی کا سبب ذات کی ہمہ گیری بھی ہے اور اُس حیات کا تاابد اُسوۂ کامل ہونا بھی ہے، پھر یہ مطالعہ سیرت ایک معاشرتی رویہ کا غماز ہی نہ ہے بلکہ اس پر خالق کائنات کے ابدی ارشادات کا پہرہ بھی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾ (الاحزاب:21)

یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے اُس

کے لئے جو اللہ تعالیٰ کا طلب گار ہے اور یوم آخر یعنی قیامت کا خواہش مند ہے اور اس کے لئے جو اللہ تعالیٰ کا بہت ذکر کرتا ہے۔

انسانی زندگی کے اعمال و مقاصد پر نظر ڈالی جائے تو خوشگوار اور کامیاب زندگی انہیں تین مقاصد کے گرد گھومتی ہے ایک یہ کہ مخلوق کی طلب کا نقطہ عروج خالق تک رسائی ہے۔ ساری تگ و دو اسی لئے ہوتی ہے کہ رضائے الٰہی حاصل ہو جائے اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہو جائے اور حصارِ رحمت میں کوئی مقام مل جائے، دوسری تمنا یا دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زندگی کی ساری محنت کامیابی سے ہمکنار ہو جائے، ساری مساعی کا صلہ دائمی راحت و آرام ہو، آخرت بخیر کی طلب ہر انسان کے دل میں ہمہ وقت مچلتی رہتی ہے اور تیسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام رویے مرکز آشنا ہو جائیں۔ زبان پر ہر وقت وہ یاد رہے اس کا ذکر رہے جو کامرانیوں کا ذریعہ ہے ارشاد ربانی یہ ہے کہ ان تینوں مقاصد کا حصول چاہتے ہو یا اس سہ جانب سرخروی چاہتے ہو تو اس کامیابی کا ذریعہ اور کامرانی کا راستہ رسول اللہ ﷺ کے اندازِ حیات میں موجود ہے، یہ پیغام تھا ہر کلمہ گو کے لئے، اس لئے روزِ اول سے ہر صاحب ایمان اُس حیات پاک پر توجہ دینے لگا، نجات کا دار و مدار اسی اُسوۂ میں ہے جو حسین تر اُسوۂ ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ ذات مبارک ہر ایک کے لئے توجہ کی مستحق ٹھہری۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ مطالعہ سیرت کا مقصود اُسوۂ حسنہ کی کشید ہے۔ یہ صرف ایک تاریخی حکایت نہیں کہ جس کے قبول و رد قبول میں ذاتی پسند و ناپسند کو جرأت انتخاب ہو۔ یہ عقلی موشگافیوں کی بھی جولاں گاہ نہیں ہے کہ بیان

جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے

اس بارگار میں کلمات کا انتخاب بھی ایک سلیقہ چاہتا ہے اور بیان واقعہ بھی

صداقت شعاری کے حصار میں رہنا چاہتا ہے۔

اس فرمان باری سے رسالت کی ساری زندگی اُسوۂ قرار پائی ہے۔ یہ خیال کہ وہ زندگی ہی معتبر قرار پائے گی جو اعلانِ نبوت سے شروع ہوتی ہے کہ وہی اُسوۂ ہے، اس سے وہ زندگی جو اعلانِ نبوت سے قبل کی ہے اُس بارے میں اس احتیاط کی تحریک نہ ہو سکتی تھی، اس کی خود قرآن مجید نے وضاحت کر دی ارشاد ہوا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ (یونس:16)

”میں اس سے قبل تمہارے درمیان عمر کا ایک حصہ گزار چکا ہوں، کیا تم عقل نہیں رکھتے“۔

یہ اعلانِ نبوت سے قبل کی زندگی کی جانب اشارہ ہے اور اُس زندگی کو اعلانِ نبوت کے لئے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے تو جو زندگی نبوت کی صداقت اور حتمیت کے لئے شہادت قرار پائے اُس کا مطالعہ بھی راہِ حق کے مسافروں کے لئے اُسوۂ حسنہ کی تفہیم کے لئے لازم ہوا، اس طرح پوری حیاتِ مبارک، ہدایت و راہنمائی کے لئے حجت قرار پائی۔ ملت اسلامیہ نے ہر دور میں اس ضرورت کا احساس رکھا اور لمحہ شمار ہوتا رہا۔

عصر حاضر بھی اس ضرورت سے بے خبر نہیں، عصرِ حاضر کا دینی ادب گواہ ہے کہ سب سے زیادہ توجہ مطالعہ سیرت کو ہی حاصل ہے، یہ ضرور ہوا کہ راہنمائی کے کئی نئے گوشے سامنے آئے۔ انسانی زندگی کے تقاضے بھی متفاوت ہوئے، معاشرتی زندگی کے کئی نئے رُخ ہویدا ہوئے، اتصال کی کئی راہیں کھلیں اور معاندین کی جانب سے نت نئے فتنے پیدا کئے گئے، اس لئے دورِ حاضر کا سیرت نگار ان تقاضوں پر بھی توجہ دینے لگا، اس میں کبھی کبھی مجادلانہ رنگ بھی پیدا ہوا اور کبھی تو واضح مخاصمت بھی رونما

ہوئی، ان تقاضوں کے پیش نظر اندازِ تحریر بھی بدلا اور استخراجِ حقائق کے پیمانے بھی تبدیل ہوئے، یہ وقت کا تقاضا تھا جس کا ساتھ دینا ایک زندہ ملت کے لئے لازم تھا مگر اس نیک روش ہیں اُس وقت قباحت نمایاں ہوئی جب دفاع کرنے والوں میں مرعوبیت کا میلان ہویدا ہونے لگا، کچھ تو تاویلات کے گورکھ دھندوں کے اسیر ہو گئے اور کچھ ذہنی انتشار کا شکار ہونے لگے، بعض سیرت نگار اس قدر الجھے کہ موضوع کے مقاصد سے ہی منحرف ہو گئے اور چند تو اغیار کی علمی سطوت سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ روایات کے تقدس سے ہی انکار کرنے لگے اور قدم قدم پر اپنی خود ساختہ عقل کے سہارے مستند روایات کی بھی تردید کرنے لگے۔

عصرِ حاضر کا سیرت نگار اس چوبائی حملے کا شکار ہے وہ کچھ کہنا بھی چاہتا ہے مگر استعماری رویے اُس کی ژولیدگی کا سبب بن رہے ہیں، اس ذہنی انتشار اور قلبی اضطراب نے اُسے ایسے موضوعات پر اپنے استنباط کی اساس رکھنے کی ترغیب دی ہے جو ملت اسلامیہ میں صدیوں سے رائج اور ایک نہج پر جاری ہے جدت پسندی کا یہ جذبہ برا نہیں مگر اس کی قباحتیں تب نمودار ہوتی ہیں جب مقصود ہی جدت ہو جائے۔ سیرت پر لکھنا ہے، اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، کون سا پہلو انفرادی جدت کو نمایاں کرے گا؟ یہ محرکات انا پرستی کے مظہر بھی ہوتے ہیں اور کم علمی کے بھی، ایسے ماحول میں ایک نیک نیت سیرت نگار کن پہلوؤں پر توجہ دے کہ سیرت پر مفید تحریر بھی سامنے آئے اور صداقتوں کا بطلان بھی نہ ہو، یہ دورِ حاضر کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ آیئے اس مسئلہ کا حل تلاش کریں۔

عصرِ حاضر میں مسلمان تمدن کہر آلود ہو گیا ہے۔ غیر مسلم مفکرین بھی معاشرتی ضرورت

اور سماجی جبر کے تحت سیرت پر کام کر رہے ہیں، اُن کے نزدیک سیرت نگاری، شخصی کوائف سے زیادہ کچھ نہیں اس لئے اُن کی تحریروں میں سوانح تو ملتے ہیں سیرت کشید نہیں ہوتی۔ مغربی مفکرین کی روش بھی اسی طرح کی ہے بلکہ اُس میں طلاقتِ لسانی کے زور پر اور اپنی معاشرتی و علمی برتری کے خمار کی وجہ سے معاندت اور بھی زیادہ نمایاں ہے۔ مسلمان سیرت نگاروں کو اس روش کا توڑ پیدا کرنا ہے، اُن پر لازم ہے کہ واقعات کی صحت پر اصرار کریں اور طریق استخراج کی متانت کو مشعلِ راہ بنائیں۔ معاندت کا جواب حقائق کی بنیاد پر ہو تو زیادہ کارگر ہوتا ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ ایسی روایات کا محققانہ رد کریں جن کی بنیاد پر دشمنی کا رویہ پروان چڑھتا ہے مگر یہ احتیاط رہے کہ اپنے دلائل کی کمزور اساس کا احساس کئے بغیر روایات کا انکار نہ کریں اس طرح کا ردِ عمل پچھلی صدی میں بار بار ظاہر ہوا۔ سر سید احمد خاں، مولانا شبلی حتیٰ کہ مولانا اسلم جیراج پوری کے ہاں ایسی پسپائی بڑی نمایاں ہے، سیرت نگار کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ کسی حکمران، مدبر یا سائنسدان کی سوانح حیات نہیں لکھ رہا کہ اس میں کامیاب لمحات کے ساتھ ناکام لمحے بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں اُسے اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ آخری نبی اور آخری رسول کا سیرت نگار ہے۔ اور نبوت و رسالت کا منصب ہمہ جہت راہنمائی کا ہوتا ہے جس کے لئے رب العالمین اُن کی حفاظت بھی فرماتا ہے اور قوتوں سے بھی نوازتا ہے۔ نبوت کا اعلان بذاتِ خود ایک معجزہ ہے کہ کسی انسان کا اس کا حق حاصل نہیں ہے، یہ الہام کا نتیجہ ہے اور الہام سراپا معجزہ ہے۔

دوسری احتیاط جو ایک سیرت نگار کے لئے لازم ہے یہ ہے کہ وہ روایات کی جانچ میں بہت محتاط رہے کہ کہیں پسند و ناپسند راہِ راست سے بھٹکا نہ دے، یہ بھی لازم ہے کہ درایت کے معیار پر روایات کا جائزہ لے مگر درایت کو روایات تراشنے کے لئے

استعمال نہ کرے، یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ روایت کیسے مان لی جائے جو عقل کے تقاضوں کے مطابق نہیں۔ ذرا سوچیے روایات کا عقل کے مطابق ہونا کیوں لازم ہے، کتنے واقعات ہیں جو رونما ہوتے ہیں جن کی عقلی توجیہ دشوار ہوتی ہے۔ روایات کا باہمی جائزہ درایت کی اساس پر نامناسب ہے کہ ہر انسان کی عقل کے تقاضے مختلف ہو سکتے ہیں۔ عقل سلیم تو ہر ایک کو عطا نہیں کی گئی ان احتیاطی رویوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سیرت نگار کو عصری مسائل کے لئے راہنمائی مہیا کرنا چاہتے کہ سیرت بنیادی طور پر صرف معلومات عطا کرنے کا نام نہیں یہ ہدایت کی دریافت کا ذریعہ ہے۔

عصر حاضر کے سیرت نگار کو درج ذیل چند امور کا خیال رکھنا چاہیے۔

سیرت نگاری میں اُن واقعات وشواہد کو نمایاں حیثیت دینا چاہیے جو عصر حاضر کے انسان کی ضرورت ہیں تاکہ عصر حاضر کا انسان اس سے فیض یاب ہو سکے۔

سیرت کے ضمن میں غزوات وسرایا کا تذکرہ بھی ضروری ہے مگر ان کے بیان میں اُن اصولوں کو زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ہے جو دورِ حاضر کے لئے راہنما بن سکیں۔ مثلاً غزوہ بدر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے جہاں جاں فروشی وجاں دادگی کی روایات کا بیان لازم ہے وہاں سیرت کے انسانی رویوں کا ذکر بھی نمایاں ہونا چاہیے مثلاً یہ واقعہ کہ جب قریش مکہ کی جانب سے مبارزت کے لئے تین نمایاں افراد سامنے آئے۔ عتبہ، شبہ اور ولید، عتبہ اور شبہ بھائی تھے اور ولید، عتبہ کا بیٹا تھا یہ معزز خاندان کے افراد تھے، جب ان کی طرف سے مبارزت طلبی رسول اللہ ﷺ کے حضور عرض کی گئی تو آپ نے لشکر اسلام سے بہادروں کو مقابلے کی اجازت دے دی اجازت ملنا تھی کہ ایک خوبرو جوان جس کا نام ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ تھا سامنے آئے مگر رسول اللہ ﷺ نے جوان کو جانے کی اجازت نہ دی، جوان اصرار کرتا رہا اور اپنے قوت بازو کا حوالہ بھی

دیتا رہا مگر اجازت نہ ملی۔ ذرا سوچیے کیوں! وجہ یہ تھی کہ سامنے جو قریش کے مبارزت طلب کھڑے تھے اُن میں عتبہ اسی جوان کا حقیقی باپ تھا۔ شبیہ حقیقی چچا اور ولید حقیقی بھائی تھا۔

رحمت عالمین ﷺ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ایک بیٹا باپ کو قتل کر دے۔ معرکہ کس قدر بڑا تھا۔ بقاء امت کا مرحلہ تھا مقابلے کو جیتنا لازم تھا مگر اس گھمبیر ماحول میں بھی رحمت عالم ﷺ نے باپ کا تقدس برقرار رکھا، آج کا دور تقاضا کرتا ہے کہ ایسے رویوں کو فروغ دیا جائے اور سیرت نگار ایسے مرحلوں پر کچھ دیر ٹھہر کر اسلام کی حقانیت اور نورانیت واضح کریں۔

عصرِ حاضر مادی ترقی کا دور ہے۔ مادیت پسندی ہر اخلاقی قدر پر غالب آتی جا رہی ہے، حکمرانوں کا مقصود فلاحِ قوم نہیں رہا، باج گزاری مطلوب ہے، ایسے ماحول کو پسپا کرنے کے لئے سیرت نگار کو فلاح قوم کے رویوں کو روشن کرنا چاہیے مثلاً غزوہ تبوک میں نبی اکرم ﷺ کے سامنے یہ شکایت آئی کہ فصلوں کی برداشت سے زیادہ تخمینہ کاری ہوئی ہے۔ باوجود یہ تخمینہ کاری لائق اعتماد صحابی کی تھی حضور اکرم ﷺ نے دوبارہ تخمینہ لگوایا اور نتیجۃً دس دس وسق واپس کر دیئے۔ سیرت نگار کو ایسے پہلو کا ذکر کرنا چاہیے تاکہ حکمرانوں کے رویوں میں انا پرستی کا عنصر شامل نہ رہے اسی طرح یہ دور تقاضا کرتا ہے کہ سماجی ومعاشرتی مسائل کے تذکروں پر زیادہ توجہ دی چاہیے۔

سیرت کا اہم ترین حصہ مقام رسالت کا بیان بھی ہے، سیرت لکھنے والوں کو عظمت ورفعت کی پاسداری کا خیال رہنا چاہیے۔ سیرت اس لئے نہیں کہ یہ ایک تاریخی شخصیت کی داستانِ حیات ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کی ذات کا وہ مطالعہ ہے جو انسانیت کے لئے ہمہ خیر ہے اس لئے اس مطالعہ کی قدر وقیمت کا خیال

رکھتے ہوئے معاشرے کی اصلاح کا اہتمام کرنا چاہیے اور اس میں جو غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں ان کا سد باب کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اس سلسلے میں جس قدر اعتراضات اٹھائے گئے ہیں اُن کا جواب اس طریق سے دینا چاہیے کہ حقائق روشن ہو جائیں۔

مختصر یہ کہ عصرِ حاضر کے مسائل کے حل کے لئے سیرت سے راہنمائی حاصل کرنا چاہیے مثلاً

* سیاسی مسائل اور اُن کا حل۔
* معاشرتی اضطراب اور اُس کا سد باب۔
* معاشی عدم تفاوت کے حوالے سے سیرت کی راہنمائی۔
* خاندانی نظام کے حوالے سے اُسوۂ رسول ﷺ۔
* غیر مسلم ہمسایوں کے بارے میں تعلیمات۔
* بین الاقوامی روابط کے سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے استفادہ۔
* عصر حاضر کے نظام زر کے حوالے سے سیرت رسول ﷺ۔
* اسلامی حکومتوں کے درمیان میں طریقِ اشتراک کی صورت گری۔

غرضیکہ آج کے دور کے سلگتے مسائل کو پیش نظر رکھ کر سیرت کا مطالعہ اور راہنمائی کے اصول، سیرت نگاروں کی توجہ کا مرکز بننے چاہئیں تا کہ یہ حقیقت متحقق ہو جائے کہ سیرت ہر دور کے لئے راہنما ہے اور انسانی معاشروں کے استحکام اور ارتقاء کی ضامن ہے۔

اللہ تعالیٰ سیرت نگاروں کو یہ توفیق بخشے کہ وہ طے شدہ حقائق میں الجھنے کے بجائے سیرت کے درخشندہ حوالوں کو مرکز نگاہ بنائیں اور قوم کے سامنے راہنما تحریر پیش کریں۔ آمین

درود شریف کی عبارت

روزنامہ نوائے وقت لاہور کے 18 مارچ 1987ء کے شمارے میں ''درود شریف کی عبارت۔ علماء وضاحت فرمائیں'' کے زیر عنوان پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں پروفیسر صاحب نے درود شریف کی عمومی عبارت ''صلی اللہ علیہ وسلم'' میں آلہ کے اضافے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے اور اسے شرعی اور فنی پہلوؤں کے مطابق غلط بتایا ہے۔ میرے خیال میں یہ مسئلہ اس قدر شدید ردعمل کا متحمل نہ تھا، بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ کب کوئی موقعہ ہاتھ لگے اور ہنگامہ بپا کیا جائے، مقصد اصلاح نہیں بلکہ عوام میں مسلمات کے بارے میں بے یقینی پیدا کرنا ہوتا ہے، لوگ کم علمی کی بنا پر ایسے مسائل میں الجھ جاتے ہیں اور اُن کے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے چنانچہ وہ بددل ہو کر ایک نیک عمل سے رُک جاتے ہیں۔ پروفیسر صاحب ایسے فاضل انسان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ایسے مسائل میں الجھیں اور اس لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں، مضمون کے عنوان سے یہ تاثر ملا کہ پروفیسر صاحب کو اس سلسلے میں علماء سے راہنمائی مطلوب ہے جبکہ اُن کے مضمون کے مندرجات اور اسلوب سے جواب طلبی کا سا سماں پیدا ہو گیا ہے۔ ٹیلی ویژن یا اخبارات میں کسی عالم دین کا دینی موضوعات پر کلام کرنا یا کالم لکھنا ہم میں سے کسی کے لئے پریشانی کا باعث نہ بننا چاہیے۔ نام لئے بغیر دو مرتبہ حوالہ دے کر کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی گئی۔ بات یہ نہیں کہ ''وآلہ'' پر اعتراض ہے بلکہ یہاں تو فتویٰ صادر کیا گیا ہے، فرماتے ہیں شرعی لحاظ سے اس پر جو گرفت ہو گی اس سے

نوائے وقت بری الذمہ نہ ہوگا۔ فاضل مضمون نگار کو دکھ ہے کہ درود کی یہ غلط عبارت معاشرے میں مقبول ہوتی جارہی ہے بلکہ ٹیلی ویژن والوں نے تو اس کا مکمل التزام کر رکھا ہے۔

پروفیسر صاحب کو آلہ کے اضافے پر دو اعتراضات ہیں، ایک یہ کہ اضافہ شرعی لحاظ سے غلط ہے اور قابلِ مواخذہ ہے اور دوسرے یہ کہ عربی قواعد اس اضافے کی اجازت نہیں دیتے۔ بہتر ہوگا کہ ان دونوں اعتراضات کا حقائق کی روشنی میں جائزہ لے لیا جائے۔

فاضل مضمون نگار کو درود پڑھنے کی شرعی حیثیت تسلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مومنوں کو اس کا حکم دیا ہے۔ دریافت طلب سوال یہ ہے کہ درود کی کون سی عبارت پڑھنے کا حکم ہے؟ کتب احادیث میں درود کی متعدد صورتیں بیان ہوئی ہیں اور کسی ایک ترتیب کو اپنانے اور دیگر صورتوں کو نظرانداز کردینے کا کہیں ذکر نہیں، یہ درود پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کس ترکیب یا کن الفاظ کو ادا کرنے میں سہولت یا رغبت پاتا ہے اس لئے اس سلسلے میں کوئی حکم یا فتویٰ صادر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی درود کا مقصود ہے لیکن اہل بیت اطہار اور صحابہ کرام کے اضافے مستحسن ہیں ممنوع نہیں۔ پروفیسر صاحب نے بغیر کسی دلیل یا نص کے اس پر غیر شرعی عمل ہونے کا حکم لگایا ہے، اُن کا دعویٰ ہے کہ درود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے اور اس میں وآلہ شامل نہیں ہے یہی ابتداء اسلام سے لے کر آج تک تمام دینی کتب میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے اور زبانی طور پر بھی مسلمان درود شریف کی یہی عبارت ادا کرتے رہتے ہیں۔ یہ دعویٰ محل نظر ہے کیونکہ اس سے مختلف الفاظ بھی درود کے ضمن میں استعمال ہوئے ہیں مثلاً علامہ الشوکانی نے اپنی مشہور تفسیر فتح القدیر میں ہر جگہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تحریر کیا ہے۔ پروفیسر صاحب کا یہ طریقِ استنباط بجائے خود

قابل اعتماد نہیں ہے۔ اُن کو تسلیم ہے کہ قرآن مجید کے حکم کی تعمیل میں مسلمان یہ درود پڑھتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

اور اسی کا اختصار صلی اللہ علیہ وسلم ہے، سوچئے کیا یہ اختصار کسی شرعی حکم کا نتیجہ ہے یا مسلمانوں نے صرف سہولت یا اختصار کی خاطر ایسا کیا ہے، ظاہر ہے یہ سہولت ہے، یہ اختصار دلیل ہے کہ درود میں عبارات کا اختلاف ممکن ہے اس لئے یہ سہولت اپنانے والوں کو دوسروں پر حکم لگانا جائز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ وآلہ کسی نص سے ثابت ہے یا نہیں تو کہا جاسکتا ہے کہ ایسا اضافہ تو ہر مسلمان ہر نماز میں کرتا ہے کیونکہ نماز میں ''وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ'' کے الفاظ موجود ہیں اور کتب احادیث میں یہ درود منقول ہے صحیح بخاری کی کتاب الدعوات میں حضرت ابوسعید الخذری رضی اللہ عنہ سے علی محمد وال محمد اور ابوحمید الساعدی سے مروی حدیث میں صلِّ علی محمد وازواجه وذرّیته کے الفاظ شامل ہیں۔ اہلِ محبت نے وآلہ کو درود میں شامل کرنے کا اشارہ اسی سے لیا ہے اور اس کو مستحسن سمجھا ہے بلکہ اگر کسی عبارت میں اس کا ذکر نہیں تو اُس کی تاویل کی ہے کہ اختصار کی وجہ سے ایسا ہوا ہے اور یہ حذف، عبارت میں ہے ارادے میں نہیں، سعادۃ الدارین میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے درج ہے۔

لَعَلَّ وجه عدم ذکر آلِه هو قصد الاختصار والّا فزیادتها فی الکتابة أولیٰ وأحسن

یعنی آلہ کا مذکور نہ ہونا شاید اختصار کی بنا پر تھا وگرنہ تحریر میں اس کا اضافہ اولیٰ واحسن ہے۔

صاحب الذخیرۃ کے حوالے سے لکھا گیا:

لأنّ الصلاۃ علی الال سُنّۃ مستقلۃ وورد النص النبویؐ بطلبھا فی صحاح الاحادیث

یعنی ال پر درود ایک مستقل دستور ہے اور صحیح احادیث میں اس کے تقاضے پر مشتمل نص موجود ہے۔'' اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ۔اَللّٰھُمَّ صلِّ علیٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ مُحمدٍ کا بھی ذکر ہے (حوالہ مذکورہ) اس لئے یہ دعویٰ کہ آلہ کا اضافہ قابلِ مواخذہ ہے۔ دین میں اپنی رائے کو داخل کرنا ہے۔ صرف سہولت کی خاطر کتابت میں کسی خاص جملے کا عام رائج ہوجانا عین ممکن ہے مگر اسے دلیلِ شرعی بنانا کوئی علمی خدمت نہیں ہے۔ آلہ کا ذکر اکثر روایات میں موجود ہے کتب احادیث میں ایسی روایات تلاش کر لینا ایک عام طالب علم کے لئے بھی دشوار نہیں ہے۔

پروفیسر صاحب کا دوسرا اعتراض عربی قواعد کے حوالے سے لائقِ توجہ ہے، اُن کا کہنا ہے ''عربی گرائمر کا یہ قاعدہ ہے کہ جب ضمیر مجرور پر اسم ظاہر کا عطف ہو تو حرفِ جار کا اعادہ ضروری ہے، درود کی سلف صالحین سے منقول عبارت میں ''علیہ'' کے آخر میں ضمیر مجرور ہے اس لئے عربی گرائمر کے اس قاعدے کے مطابق اگر علیہ کے بعد آلہ کا اضافہ کیا جائے گا تو پھر آلہ سے پہلے حرف جار علیٰ کا اعادہ ضروری ہے، اس صورت میں درود کی عبارت یوں ہوگی۔

صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم

چونکہ ایک عالم دین علیٰ کے بغیر وآلہ کا اضافہ کر رہے ہیں اس لئے سلف صالحین سے منقول درود کی صحیح عبارت کے مقابلے میں نئی عبارت کو رواج دینا کسی طور

پر مناسب نہیں اور رواج بھی ایسا کہ عامۃ الناس درود کی صحیح عبارت کو غلط سمجھنے لگیں تو اس کی اصلاح لازمی ہوجاتی ہے۔ پروفیسر صاحب نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے ''تفسیر اور فقہ کی ہزاروں کتابیں ہیں جن میں لاکھوں دفعہ درود استعمال ہوا ہے لیکن ان میں ایک دفعہ بھی اضافہ والا درود استعمال نہیں ہوا''۔ حیرت ہے کہ پروفیسر صاحب نے یہ دعویٰ کیسے کر دیا حالانکہ ان کے دعویٰ کے برعکس ایسا ہوا ہے۔ ہم نے ابھی فتح القدیر کا حوالہ دیا ہے جو ایک متداول تفسیر ہے اور اس میں ہر مرتبہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تحریر کیا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے درود میں اس نئے اضافے کے ضمن میں سیبویہ کا بھی حوالہ دیا ہے جو عربی نحو کا ایک اہم ترین فرد ہے۔ پروفیسر صاحب سے گزارش ہے کہ وہ کسی کتاب کا حوالہ درج کرتے تو مناسب ہوتا۔ تفسیر قرطبی جس کا حوالہ دیا گیا ہے وہاں درود کا مسئلہ تو زیر بحث نہیں پھر یہ کہنا کہ ''عربی گرائمر کے سب سے بڑے امام سیبویہ کے زمانے میں کسی عقیدت مند نے ایسا اضافہ کیا تو امامہ صاحب نے فرمایا کہ عربی گرائمر کے مطابق ایسا اضافہ صحیح نہیں بلکہ ایسا کرنے والوں کو سخت الفاظ میں ڈانٹا اور فرمایا کہ جو بھی اسم ضمیر پر اسم ظاہر کا عطف کرتا ہے وہ ایک برے فعل کا ارتکاب کرتا ہے''۔ یہ کہاں تک درست ہے۔ مسئلہ درود کا نہیں قرآن کی ایک آیت (جس کا ہم ذکر کریں گے) کے بارے میں اختلاف قرأت کا تھا۔ درود کے بارے میں امام نحو سیبویہ کا مندرجہ بالا فیصلہ کب دیا گیا اور اس کا کہاں ذکر درج ہے پروفیسر صاحب کو واضح کرنا چاہیے تاکہ قارئین اس کی اصل حقیقت جان سکیں۔

پروفیسر صاحب کا سارا اعتماد تفسیر قرطبی پر ہے جہاں سے دلائل اخذ کئے گئے ہیں کہا گیا ہے کہ ''تفسیر قرطبی میں اس مسئلہ پر نہایت مدلل اور مفصل بحث کی گئی

ہے اور جن لوگوں نے علم کی کمی یا اندھی عقیدت مندی کی بنا پر درود کی عبارت میں کچھ اضافے کی کوشش کی انہیں اس غلط عمل سے باز رکھنے کے لئے کتاب وسنت سے دلائل دیئے گئے ہیں''۔ پھر ان کے دلائل کا خلاصہ دیا گیا ہے کہ ''اگر عربی گرائمر کے کسی ماہر نے اس مقصد کے لئے کوئی دور از کار جواز پیدا بھی کرلیا تو بھی ایسا کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی زبان فصیح تھی جس میں اس قسم کے اضافے کی مطلقاً کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی اور اس کے خلاف کرنا گویا رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنا ہے''۔ یہ سارا استدلال قرطبی جلد پنجم ص 3۔4 کے حوالے سے درج کیا گیا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ اس بحث کو درود میں اضافے کی بحث کے تحت درج کیا گیا ہے، کیا ایک پڑھے لکھے عالم کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ کسی مصنف کی طرف وہ کچھ منسوب کرے جس کا اُس نے ذکر تک نہ کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا علمی دیانت کے خلاف ہے کیونکہ تفسیر قرطبی میں درود کا مسئلہ زیر بحث نہیں سورہ النساء کی پہلی آیت میں ضمیر پر اسم ظاہر کے عطف سے متعلق ہے، یہ قاری سے صریحاً زیادتی ہے کہ عبارت کو اپنے مقام سے اٹھا کر مضمون نگار اپنی خواہش کا تابع بنالے، اگر یہ بحث صرف عطف کی حد تک نقل کی جاتی اور اس سے درود میں آلہ کے عطف پر استدلال کیا جاتا تو بات اور تھی مگر مضمون میں صریحاً درج کیا گیا کہ علامہ قرطبی نے یہ ساری بحث اُس وقت تحریر کی جبکہ علم کی کمی اور اندھی عقیدت مندی کی بنا پر درود کی عبارت میں کچھ اضافے کی کوشش کی گئی۔ تفسیر قرطبی میرے سامنے ہے اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ درود کی عبارت محل بحث میں نہیں۔

ناطقہ سر بگریباں ہیں اسے کیا کہیے۔

ایک اور نہایت افسوسناک بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی فصاحت کا حوالہ دے کر درود میں اضافے کا رد کیا گیا اور اسے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت قرار دیا گیا اور حوالہ علامہ قرطبی کا ہی دیا گیا۔ یہ علامہ قرطبی سے زیادتی ہے انہوں نے نہ تو درود کا ذکر کیا ہے اور نہ یہ جملہ اس حوالے سے نقل کیا ہے بلکہ یہ تو پروفیسر صاحب کے استدلال کے رد کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب سے گزارش کروں گا کہ عبارت کو پھر سے پڑھ لیں اور خود ہی فیصلہ فرمادیں کہ یہ جناب رسالت مآب ﷺ کے حضور گستاخی ہے یا نہیں۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ ضمیر مجرور پر اسم ظاہر کے عطف کی بحث میں علامہ قرطبی نے طرفین کے کئی اقوال نقل کئے ہیں اور آخر پر اس قول کا محاکمہ کیا ہے کہ عطف جائز نہیں ہے عبارت پڑھ لیجئے۔

قلت: هذا ما وقعت عليه من القول لعلماء اللسان فى منع قراءة (والارحام) بالخفض واختاره ابن عطيه۔

یعنی میں کہتا ہوں (یہ علامہ قرطبی کے الفاظ ہیں) کہ یہ اقوال تھے جو علماء لسان سے میں جانتا ہوں۔ الارحام مجرور حالت میں پڑھنے سے روکنے پر اور اسے ابن عطیہ نے اختیار کیا ہے، مراد یہ ہے کہ ابن عطیہ الارحام کو مجرور پڑھنے سے روکنے والوں میں سے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں۔

وردّه الامام ابونصر عبدالرحيم بن عبدالكريم القشّيرى واختار العطف۔

کہ ابن عطیہ کا رد کیا ہے امام ابونصر عبدالرحیم بن عبدالکریم القشیری نے اور

عطف کو اختیار کیا ہے۔امام القشیری الارحام مجرور حالت میں عطف کے قائل ہیں اور مخالفین کا رد کرتے ہیں اور پھر علامہ قرطبی نے اس رد میں کئے گئے امام القشیری کے جملے نقل کئے ہیں۔اور یہاں وہ کہتے ہیں کہ یہ قراءت جب ائمہ قراءت سے ثابت ہے اور یہ آئمہ رسول اللہ ﷺ سے ہی نقل کرتے ہیں۔اس لئے ان کی تردید بالواسطہ رسول اللہ ﷺ کی تردید شمار ہوگی۔غور فرمایئے امام قرطبی تو یہ عبارت تحریر کررہے ہیں کہ عطف بغیر حرف جر کے ائمہ قراءت سے ثابت ہے تو رد کرنا نہایت قبیح ہوگا یہ تو پروفیسر صاحب کے دعویٰ کا رد ہے اور انہوں نے جو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا الزام دیا ہے وہ تو ان کے اپنے اوپر وارد ہوتا ہے، حیرت ہے اس قدر صریح عبارت کو کیسے برعکس مفہوم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔علامہ قرطبی نے تو آخر پر اس عطف کے جواز کا ذکر کیا ہے مگر پروفیسر صاحب اپنے خیال میں علامہ قرطبی کے فیصلے کو اپنے حق میں استعمال کررہے ہیں۔

آیئے اب مسئلہ زیر بحث عربی قواعد کے حوالے سے جائزہ لے لیں تاکہ کوئی ابہام نہ رہے۔تمام تفاسیر میں سورۃ النساء کی آیت نمبر 1 کے تحت اس مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے۔آیت یہ ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ۔

اس میں الارحام کے اعراب میں قراءت کا اختلاف ہے۔بعض نے الارحام یعنی میم کے زبر سے پڑھا ہے تو یہ اسمِ جلالۃ پر عطف ہوگا اور بعض نے اسے ''الارحام'' یعنی میم کے زیر سے پڑھا یعنی بہٖ کی ضمیر مجرور پر عطف کیا ہے۔پروفیسر صاحب کا کہنا ہے کہ اسم ظاہر کا ضمیر مجرور پر عطف نہیں ہوسکتا اس لئے ''الارحام'' (یعنی فتحہ سے)

پڑھا جائے گا اور تفسیر قرطبی میں سے یہ دلیل لے کر ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پر اعتراض کیا ہے کہ آلہ کا عطف علیہ کی ضمیر مجرور پر نہیں ہوسکتا اس لئے یہ درود قواعد کے لحاظ سے غلط ہے اس میں علیٰ کا اضافہ چاہیے یعنی یہ درود صلی اللہ علیہ وعلی وآلہ وسلم ہوسکتا ہے مگر یہ سلف کے خلاف ہے اس لئے نہ پڑھا جائے۔سارا استدلال ''الاحارم'' کے اعراب سے لیا گیا ہے ، یہ درست ہے کہ مشہور قراءت میم کی زبر سے ہے اس لئے علماء کا ایک گروہ جس میں بصری نحوی شامل ہیں کہتے ہیں کہ اس طرح عطف جائز نہیں جبکہ بعض دیگر اسے تسلیم نہیں کرتے اس نحوی اختلاف کی موجودگی میں حتمی فیصلہ دے دینا اور غلطی کا الزام لگا دینا کسی صورت میں قرینِ انصاف نہیں ہے۔جس بنیاد پر ''درود'' کی اُس شکل کو رد کیا جارہا ہے جس میں وآلہ کا اضافہ ہے وہ خود کوئی مستقل اصول نہیں ہے اگرچہ پروفیسر شہاب صاحب نے اپنے دعویٰ کو ناقابل تنسیخ قرار دیا ہے آیئے چند تفاسیر کے حوالے سے اس کا جائزہ لے لیں تاکہ اس استدلال کے ماخذ کی حیثیت متعین ہوجائے۔

علامہ الشوکانی فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔

وقرأ النخعي وقتادہ والاعمش وحمزة (والارحام) بالجر وقرأ الباقون بالنصب۔

یعنی امام النخعی ،قتادہ، الاعمش اور حمزہ نے الارحام کو زیر سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے زبر سے، معلوم ہوا دونوں طرف ائمہ قراءت موجود ہیں، علماء، بصرہ نے زیر سے قراءت کی نفی کی ہے کہ اس طرح اسم ظاہر کا ضمیر مجرور پر عطف ہوتا ہے؛ اور اس کے لئے بعض دلائل دیئے ہیں اگرچہ سیبویہ نے شعر میں اس عطف کی اجازت دی ہے اور خود شعر بھی نقل کیا ہے۔

فَالْيَوْمَ قَرَّبْتَ تَهْجُونَا وَتَشْتِمُنَا

فَاذْهَبْ فَمَا بِكَ وَالْاَيَّامِ مِنْ عَجَبِ

یعنی الایام، بک پر عطف ہوا ہے جو اسم ظاہر ہے اور ضمیر مجرور پر عطف ہے۔

ابو العباس المبتر د اس عطف کا شدت سے مخالف ہے جبکہ امام ابونصر القشیری نے اس کو جائز بتایا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح القدیر، جلد اول ص 418)

تفسیر روح المعانی میں اس موضوع پر تفصیلی بحث موجود ہے۔ اور کہا ہے کہ اسم ظاہر کے ضمیر مجرور کے عطف کا قاری حمزہ قائل ہے۔ جبکہ المبرد اور ابن عطیہ نے اس کی تردید کی ہے مگر صاحب روح المعانی کو حمزۃ کی قراءت میں عظمت کا اعتراف ہے اور اس اعتراف میں امام ابوحنیفہ، سفیان الثوری اور یحیی بن آدم رحمۃ اللہ علیہم بھی شریک ہیں، حمزہ کے شاگردوں میں امام کوفہ الکسائی بھی شامل ہیں اور اس قراءت میں حمزۃ متفرد بھی نہیں ہیں اس میں ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابراھیم النخعی، حسن بصری، قتادہ اور مجاھد رحمۃ اللہ علیہم بھی شامل ہیں اس لئے ایسے امام کے قول کو رد کرنا آسان نہیں ہے۔

وما فکر من امتناع العطف علی الضمیر المجرور حصر مذھب البصریین ولسنا متعبدین باتباعھم

کہ ضمیر مجرور پر عطف ہونے کا انکار علماء بصرہ کا مذہب ہے مگر ہم ان کے پیرو کار بننے پر مجبور تو نہیں ہیں۔ (روح المعانی، الجزء الرابع ص 184)

تفسیر روح المعانی کی تفصیلی بحث کا حاصل یہ ہے کہ اس عطف میں کوئی قباحت نہیں عربوں کے ہاں اس کا جواز موجود ہے۔

علامہ رشید رضا جدید مصر کے صاحب علم بزرگ تھے انہوں نے اپنی تفسیر

المنار میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور علماء بصرہ کی اس نحوی موشگافی پر طنز بھی کی ہے کہتے ہیں۔

اِنَّ الأرحامَ اِمّا منصوبٌ عطفًا علی لفظ الجلالة واَمّا مجرور عطفًا علی الضمیر فی به وهو جائز بنص هذه الاية علی هذه القراءة وهی متواترة خلافًا لبعضهم

یعنی الارحام یا تو منصوب ہے تو پھر یہ اسم اللہ جلالۃ پر عطف ہے یا مجرور ہے اور بہ کی ضمیر مجرور پر عطف ہے اور یہ اس آیت کی اس قراءت کے مطابق جائز ہے اور تواتر سے ثابت ہے۔

امام فخر الدین الرازی کو حیرت ہے کہ یہ نحوی دو مجہول شعروں میں تو اس کا جواز مانتے ہیں مگر اس قراءت پر معترض ہیں۔

والعجب من هولاء انهم يستحسنون اثبات هذه اللغة بهذين البيتين المجهولين ولا يستحسنون اثباتها بقراءة حمزة ومجاهد مع انهما من اكابر علماء السلف فی علم القرآن

تعجب ہے کہ یہ نحوی اس قانون کو دو مجہول شعروں میں تو تسلیم کرتے ہیں مگر حمزہ ومجاہد کی قراءت میں نہیں مانتے حالانکہ یہ دونوں قرآنی علم میں اکابر علماء سلف میں سے ہیں۔ اور پھر اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔

هذا وان المنكرين علی حمزة جاهلون بالقراءات ورواياتها متعصبون لمذهب البصريين من النحاة

اس لئے کہ حمزۃ کی قراءت سے انکار کرنے والے قراءت اور اس کی

روایت سے بے خبر ہیں اور بصری نحویوں کے لئے تعصب رکھتے ہیں۔

(المنار الجزء الرابع ص 333)

دیگر تفاسیر میں بھی اس قراءت کا ذکر موجود ہے مثلاً جلالین ابن کثیر، معالم التنزیل وغیرہ۔

یہ تو علماء تفسیر تھے۔ بہتر ہوگا کہ اس مسئلے پر علماء نحو سے رجوع کر لیا جائے۔

ابن مالک کا نام عربی علم نحو میں بڑا محترم ہے۔ ان کی ''الفیہ'' کو شہرت دوام حاصل ہے۔ اس میں ابن مالک کہتے ہیں۔

وَعَوْدُ خَافِضٍ لَدَى عَطْفٍ عَلٰی

ضَمِیْرِ خَفْضٍ لَازِمًا قَدْ جُعِلَا

وَلَیْسَ عِنْدِی لَازِمًا اِذْ قَدْ أَتٰی

فِی النَّثْرِ وَالنَّظْمِ الصَّحِیْحِ مُثْبَتًا

(یعنی ضمیر مجرور پر عطف کے لئے حرف جار کے تکرار کو لازم رکھا گیا ہے مگر میرے نزدیک یہ لازم نہیں ہے کہ نثر و نظم میں ایسا ثابت ہے)۔

صاحب الفیہ کے نزدیک وہ کلیہ جسے پروفیسر صاحب حتمی قانون کا درجہ دے رہے ہیں لازم نہیں ہے بلکہ نظم و نثر میں اس کے برعکس ثابت ہے۔ الفیہ کی مستند شرح جس پر علماء اعتماد کرتے ہیں شرح ابن عقیل ہے، اس میں ابن عقیل لکھتے ہیں۔

أَیْ: جَعَلَ جُمْهُوْرُ النُّحَاةِ إِعَادَةَ الْخَافِضِ. إِذَا عُطِفَ عَلٰی ضمیر الخفض لازما.

وَلَا أَقُوْلُ بِهٖ لِوُرُوْدِ السماع نَثْرًا وَنَظْمًا بِالْعَطْفِ عَلَى الضمیر

الْمَخْفُوْضِ مِنْ غَیْرِ إِعَادَةِ الْخَافِضِ. فَمِنَ النَّثْرِ قراءۃ حمزۃ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامِ بجرّ الارحام عَطْفًا عَلَى الهاء المجرورۃ بالباء وَمِنَ النَّظْمِ مَا أَنْشَدَه سیبویه.

(پھر مذکور بالا شعر نقل کیا ہے) یعنی جمہور نحوی ضمیر مجرور پر عطف کے لئے حرف جار کی تکرار کو ضروری سمجھتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کہتا کیونکہ نظم و نثر میں ایسا سنا گیا ہے کہ ضمیر مجرور پر عطف حرف جار کے تکرار کے بغیر بھی ہوا ہے نثر میں تو قرآن مجید کی آیت میں امام حمزہ کی قراءت کے مطابق الارحام کا بہ پر بغیر حرف جار کے تکرار کے عطف ہے اور نظم میں وہ شعر جو سیبویہ سے روایت ہے کہ الایام کا عطف بک پر ہے اور حرف جار دوہرایا نہیں گیا۔ شرح ابن عقیل کے محشی محمد محی الدین عبد الحمید نے استشہاد کے لئے مسکین الدارمی کا شعر بھی نقل کیا ہے جو یہ ہے۔

نُعَلِّقُ فِیْ مِثْلِ السَّوَارِیْ سُیُوْفَنَا

فَمَا بَیْنَهَا وَالْکَعْبِ غُوْطٌ نَفَانِفُ

اس میں الکعب کا عطف ھا ضمیر مجرور پر ہے۔

(شرح ابن عقیل الجزء الثانی ص:241)

علامہ قرطبی نے بھی متعدد اشعار کا حوالہ دیا ہے جہاں ایسا عطف موجود ہے

(تفسیر۔ سورہ النساء آیت نمبر 1)

اشعار میں اس کے جواز کو تو سیبویہ نے بھی تسلیم کیا ہے جس پر امام الرازی کو اعتراض ہے کہ دو مجہول اشعار میں جو لغوی قاعدہ تسلیم کیا گیا ہے وہ امام قراءت حمزہ کے حوالے سے کیوں مردود قرار پائے گا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے ان اشعار کو کیسے نظر انداز کیا جا سکے گا جو بچے بچے کی زبان پر ہیں۔

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ   کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ

حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ   صَلُّوْا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

صَلُّوا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ پر غور فرمایئے آلِہٖ کا عطف عَلَیْہِ پر بلا تکرار حرف جر رہے۔

ان استشہادات کی روشنی میں واضح ہوا کہ ائمہ تفسیر جن میں قرطبی، ابن کثیر، جلالین، فتح القدیر معالم التنزیل، روح المعانی اور المنار کے فاضل مصنفین شامل ہیں ایسے عطف کے قائل ہیں، تلاش کیا جائے تو دیگر کتب میں بھی ایسا ہونا قطعی طور پر ممکن ہے اور علماء نحو میں سے ایک جماعت جس میں ابن مالک بھی ہیں اسی جواز کے حق میں دلائل دیتے ہیں۔ قراء میں سے حمزۃ الکسائی، الاعمش، النخعی، قتادہ کے علاوہ ابن مسعود، ابن عباس، الحسن البصری رضی اللہ عنہم اور مجاہد حرف جار کے تکرار کے بغیر ضمیر مجرور پر عطف کو درست مانتے ہیں اور سبیویہ جو اس کے عدم جواز کا قائل ہے نظم میں اس کے جواز کا فتویٰ دیتا ہے، نحویوں کے ہاں ایسے مختلف آراء کے حامل موضوع کو یوں دلیل بنانا اور برملا غلط قرار دینا کسی علمی لگن یا تحقیقی شعور کے بجائے ذہنی بعد اور مخاصمت کا اثر معلوم ہوتا ہے اور اُس عالم دین سے پرخاش کا اظہار ہے جس نے اب نوائے وقت میں اسلامی کالم لکھنا شروع کیا ہے جس کی اس سنگین غلطی (خود ساختہ) کی طرف توجہ بھی دلائی گئی مگر اُس نے جواب دینے کی تکلیف گوارا نہ کی، اس سے اُس عالم دین کے اس رویے کا اظہار ہوتا ہے کہ شاید وہ ایسے مسائل میں اپنی صلاحیت ضائع کرنا نہیں چاہتا، ویسے ہماری رائے میں پروفیسر صاحب کو جواب ضرور ملنا چاہیے تھا کہ بسا اوقات ساری محنت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ضروری اور معاشرتی اہمیت کے مسائل پر گفتگو کی توفیق دے اور اپنی صلاحیتوں کے اس ضیاع سے بچائے آمین۔

حرمین شریفین کے سفرنامے
جدید تحدیات کے تناظر میں

حرمین شریفین کی حاضری یا حاضری کی تمنا ہر صاحب ایمان کی قلبی آواز ہے وہ معاشرتی یا معاشی حیثیت سے اس قابل ہو تو رختِ سفر باندھنے میں کوتاہی نہیں کرتا اور اگر بے زری اور بے توفیقی سدِ راہ بنے تو تصور کی پرواز کا سہارا لیتا ہے، مکہ مکرمہ اُس کے سجدوں کا حوالہ ہے، اِس مقام مبارک کو وہ دور رہ کر بھی قریب پاتا ہے کہ مشرق میں مقیم ہو یا مغرب میں اُس کا رُخ اسی جانب ہے، قبلہ اُس کی جبینِ نیاز سے یوں پیوست ہے کہ جیسے مقناطیس سے لوہا، کہیں ڈالو، جدھر پھینکو، یوں قبلہ رو ہو جاتا ہے کہ کسی غیر کی احتیاج ہی نہیں رہتی۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں پر بیت اللہ کا حج ہے جو اس تک آنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ (آل عمران:79)

کے فرمان نے بیت الحرام کو استطاعت و توانائی کا قبلہ مقصود بنا دیا اور لِلّٰہِ کی قید نے کعبہ کو مرکزِ حق نما بنا دیا، اور پھر

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (الحج:27)

کے اعلان نے اس بلدِ امین کی حاضری ایمان کا فریضہ قرار دیا تو ہر فج عمیق سے قافلے جس حال میں بھی تھے راہی حرم ہونے لگے۔ یوں کلمہ توحید کا اشتراک،

مرکزِ توحید کا سفر اور ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پکار کی یکتائی وحدتِ انسانیت کی پیغام بر بنی، امام الناس اور مسلم اوّل کی ذات نے اتحادِ عالم کی کفالت کی، مرکزیت کا یہ نشان دنیا والوں کو دعوتِ فکر و عمل دینے لگا، مختلف رنگ و روپ کے انسان، مختلف اوطان متفادت نسلیں، عادات و اطوار کا افتراق، سماجی اقدار اور معاشی حیثیت کا فرق مگر کیا ہوا کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

مختلف لباسوں میں تھے حرم کی طرف بڑھنے ہی لگے تھے کہ لباس ایک ہوا، بولیاں جُدا جُدا تھیں مگر قریب بھی نہ آئے تھے کہ ہم آواز و ہم زبان ہو گئے، پکار ایک، رُخ ایک طرف، سوچ ایک، آرزوؤں و تمناؤں کا جھکاؤ ایک رنگ و یکساں، تمیز بندہ و آقا نہ رہی، فرقِ وطن و قوم نہ رہا صرف ایک حوالہ کافی ہوا، اعمال میں یک رنگی آئی تو خیالات میں یکسوئی، انسانیت کا یہ بہتا ہوا دریا حدود آشنا بھی ہوا اور یک سمت بھی، وحدتِ عمل میں ڈھلی اور ایک امت ہونے کے تصور کی ترسیخ ہوئی۔

مدینہ منورہ دوسرا حرم ہے جو نبی آفاق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبتوں کا امین نورانیت کا مرکز اور تجلیات کے ظہور کا منبع ہے، اس سرزمین پر رفعتِ افلاک کے مکین حاضری دیتے رہے ہیں اور تا قیامت دیتے رہیں گے، یہ شہر کرم بھی ہے اور گوشہ مغفرت بھی، درماندہ اور نکبت زدہ گنہگاروں کے لئے یہی بابِ رحمت ہے کہ بقول حضرت علامہ ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ۔

وَاِنْ قَنَطَتْ مِنَ العصیانِ نَفْسٌ۔ فَبَابُ محمدٍ بَابُ الرَّجَاءِ۔

(دیوان ابن حجر ص:24)

مدینہ منورہ کی حاضری، ایمان کا تقاضا بھی ہے اور قلبِ سلیم کی پکار بھی اسی لئے تو قافلے چلے آ رہے ہیں، مشتاقانِ دید کے جذبے مہک رہے ہیں، عقیدت کا اک جہان مدینہ منورہ کے راستوں، شاہراؤں اور گلی کوچوں میں آباد ہے، حاضر ہونے والوں کا اضطراب احترام آشنا ہے وہ ابھی راہوں میں ہیں اُن کی وارفتگی پابندِ آداب ہے، وہ اس تمنا کے مصداق ہیں جو کرامت علی شہیدی کے جذبوں کی امین ہے کہ

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کی جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

یہ بدیہی حقیقت ہے کہ وجود کا جمال جب پھیلتا ہے تو جہان جذب کو جنم دیتا ہے محبت و عقیدت ایک وجود سے ہوتی ہے مگر جب یہ محبت سدا بہار ہو جائے تو ہر لمحہ اثر آفریں ہونے لگتی ہے نسل، جغرافیہ اور تاریخ سب کو اپنے دامن میں لے لیتی ہے اور آثار و اماکن میں بھی گردش کرنے لگتی ہے حتکہ روح کی سرمستی، بدن کو لبھا دیتی ہے اور تصور کا جمال، حرفی پیکروں میں اُترنے لگتا ہے۔ حرمین شریفین، دو شہر نہیں، ایک ایمان کے دو مظہر اور ایک ذات کے دو حوالے ہیں، کبھی مکہ مکرمہ میں آوازۂ حق سننا ہے تو کبھی مدینہ منورہ میں پیغام برحق کی آواز پر لبیک کہنا ہے۔ مکہ مکرمہ میں ہوں تو مدینہ منورہ میں برپا ہونے والے انقلاب کو پھر سے نافذ ہوتا ہوا دیکھنا ہے۔ مدینہ منورہ میں ہوں تو مکہ مکرمہ کی مرکزیت کی طرف صف آرا رہنا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ دونوں حرم مسلمانوں کی عقیدت کا مرکز رہے۔ انسان کھچے ہوئے آئے، دیدہ و دل کو منور کیا اور اس نورانیت کو سیرت و کردار میں سمو کر واپس لوٹے۔ ایسے بھی حاضر ہوئے جو صرف جذبوں کی زبان جانتے تھے مگر کچھ ایسے بھی آئے جو

جذبوں کو حرفوں میں منتقل کرنے کی صلاحیت سے نوازے گئے تھے، واپس لوٹے تو فراق کی چبھن تڑپانے لگی، حرمین شریفین میں گزارے ہوئے مہ وسال لَو دینے لگے، سینوں میں فراق کی حرارت نے ہنگام بپا کیا تو حرفوں کا سہارا لیا، یوں داستانِ محبت کے کئی باب رقم ہوگئے۔ سفرنامے اسی اندرونی منظرنامے کی دلآویز حکایات ہیں ہر زبان میں لکھے گئے اور ہر کہیں تذکارِ دلنشین کے حوالے بنے۔

سفرنامہ ایک روایت ہے اور ایک ادبی صنف بھی، ہزاروں لکھے گئے، مشاہدات کو زیبِ قرطاس کرنا قدیم روش ہے، سفر ایک تجربہ ہے، ایک قریبی مشاہدہ ہے سیاح کا قلم اپنے تجربے اور مشاہدہ کو قاری کے لئے قلم کے حوالے کرتا ہے تاکہ وہ بھی شریکِ سفر ہوجائے، سفر ہر ایک کے بس میں تو نہیں اس لئے تجربوں کو یکجا کرنا محروم حسن قارئین کے لئے طمانیت کا پیغام ہے اور جب سفر عقیدت ہو ''سفرنامہ'' صرف معلومات کا مجموعہ ہی نہیں رہتا، ایمان ویقین کی دنیا کو مہکانے کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ حرمین کے سفرنامے اس لحاظ سے بہت محترم ہیں کہ ان سے محروم جذبوں کو انشراح کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ یہ رموزِ محبت ہوتے ہیں اس لئے قاری کے دل پر دستک دیتے ہیں۔ مسافر اگر صاحبِ نظر ہے اور محبت آشنا بھی تو سفرنامے کے الفاظ شاہراہ حیات کے سنگ میل بن جاتے ہیں اور اگر راہی ملک حجاز اس وادی کی نزاکتوں سے آگاہ ہے تو جذبے توازن کا دامن نہیں چھوڑتے۔

سفرناموں کا احصاء اور اُن کے مندرجات موضوع کی مناسبت سے تجزیاتی استخراج ایک طویل عمل ہے۔ صرف ایک سفرنامے کا مختصر حوالہ اور پھر تحدیاتِ عصر کا تناظر پیش کرنا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے مسافرِ حرمین تھے جن

کے دامن میں علم کی دولت بھی تھی اور عرفان کی ثروت بھی، آپ کا دور اکبری الحاد سے مسموم ہوچکا تھا شعائر اسلام کی توہین کی جانے لگی تھی، اس کی ایک مثال اکبر کا اپنے دودھ شریک بھائی مرزا عزیز خاں کوکلتاش سے رویہ تھا کہ اُس کی داڑھی کا مذاق اُڑایا گیا۔ دہلی سے باہر بھیج دیا گیا۔ وہ پریشان ہوا تو کعبۃ اللہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے روانہ ہوگیا اس پر اکبر نے لکھا۔ ''اپنے کعبۂ دل (مراد بادشاہ اکبر) کی اجازت کے بغیر سنگ وگِل کے کعبہ کی زیارت کے لئے جانا عقل کے خلاف بھی ہے اور اسلام کے خلاف بھی (منتخب اللباب حصہ اول ص: 223) اس بگاڑ میں فیضی وابوالفضل کا کردار بڑا نمایاں ہے، اس ملحدانہ روش کو روکنے کے لئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اثبات النبوۃ اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج النبوۃ لکھیں، حضرت شیخ پر آپ کے والد گرامی کی اُس نصیحت کا بہت اثر تھا جو انہوں نے آپ کے تدریسی انہماک پر ارشاد فرمائی کہ ملائے خشک و ناہموار نباشی''۔ آپ نے علم کے حصول سے فراغت پائی تو علم کو عرفان کی آنچ مہیا کی جس سے معارف اُترنے لگے، حرمین کو کعبۂ سنگ وگِل، قرار دینے کی جسارت اُن کے اندر ہنگام بپا کرگئی، اکبر کو نائب حق بننے کا شوق فضول گمراہ کرگیا۔ نباض امت کا فرض بنتا تھا کہ اس گمراہی کے آگے بندھ باندھا جائے، علم سے فراغت کے بعد راہ حق کا یہ مسافر مرکز یقین وایمان کا راہی ہوا۔ 995ھ میں زیارت حرمین کے لئے روانہ ہوئے سال بھر راستہ میں انتظار کی جلن کا شکار رہے مگر روانہ کیسے ہوئے سوانح نگار لکھتے ہیں۔ ''دہلی سے ایک جذبہ کی حالت میں بلاسامانِ سفر گجرات آگئے تھے''۔ رمضان المبارک 996ھ سے کچھ پہلے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے۔ آٹھ ماہ قیام رہا، حج کی سعادت پائی، ربیع الثانی 997ھ کو

مدینہ منورہ کے لئے رختِ سفر باندھا مدینہ منورہ کا قیام، مسجد نبوی اور روضہ اقدس کی حاضری کے ساتھ ساتھ مدینہ منورہ کے آثار کے مشاہدہ میں گزرا، ایک ایک ذرہ اُن کی محبت کا مرکز تھا، آثار سے روایت کا تعلق ڈھونڈتے رہے۔ رجب 998ھ تک دربارِ رسالت میں حاضر رہے۔ دوبارہ مکہ مکرمہ آئے شوال 999ھ میں عازم برصغیر ہوئے، فرماتے ہیں: ''کہ یہ عرصہ یوں گزرا ہے کہ احساس ہوتا ہے کہ ایک روز بھی قیام نہیں رہا''۔

جذب القلوب الی دار المحبوب (ﷺ) اُن کے سفر مدینہ کی دل آویز دستاویز ہے جس میں روایتی انداز سے ہٹ کر لکھا، نہ سفر کی منازل کا ذکر، نہ رہائش، خوراک اور سفر کی صعوبتوں کا بیان، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُنہیں اپنے وجود کا زیادہ حوالہ پسند نہیں اسی لئے انہوں نے حکایت دلپذیر کو ذاتی حوالوں سے بوجھل نہیں بنایا بلکہ اس سفر کے اُن اثرات کو سمیٹا ہے جو قاری کو اس سفرِ رحمت کے آداب اور دیار مبارکہ کے فضائل سے آشنا کرے، کہا جاتا ہے کہ جذب القلوب، سفرنامہ سے کہیں زیادہ تاریخِ مدینہ ہے، اس کی تالیف کے بارے میں فرماتے ہیں: اس مسودہ کی ابتداء 998ھ مدینہ منورہ میں کی گئی مگر اس کی تبییض ایک ہزار ایک میں دہلی میں مکمل ہوئی''۔

جذب القلوب مدینہ منورہ کی ایک ایسی تاریخ ہے جس کے تمام مندرجات حضرت شیخ کی مہم جو طبیعت کی دریافت ہیں، مستند واقعات، معتبر روایات اور چشم دید حکایات کتاب کے معیار کی خبر دیتی ہیں، محسوس ہوتا ہے کہ حسن بصارت اور مشاہدہ بصیرت میں ناقابلِ انقطاع ملاپ ہے، متلاشی علم کی تمام دریافت، سیاحِ محبت کی ارادت میں

اس طرح پیوست ہوگئی ہے کہ جہانِ رنگ وبو میں عقیدت کا چمنستان مہک اٹھا ہے، سرزمین حجاز کا ذرہ ذرہ صیادِ نظر ہے تو والئی حجاز کی حیاتِ جاوداں کا لمحہ لمحہ جاذبِ قلب واحساس ہے، یہ درحقیقت رودادِ سفر ہی نہیں حکایت فکر ونظر بھی ہے، یہ آمد ورفت کا قصہ نہیں سفرِ نصیب کا بیان ہے، ہر لفظ محبت آشنا اور ہر روایت عقیدت آشکار ہے، پڑھتے جائیے اور در و دیوارِ حرم کی بلائیں لیتے جائیے۔ لفظوں میں ایمان کی بہار ہے تو معانی میں ایقان کی مہکار۔

جذب القلوب کو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے سترہ ابواب میں تقسیم کیا ہے، اسماء مدینہ، فضائل مدینہ، تاریخ مدینہ، مدینہ منورہ کی مساجد، کنویں، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیانی راستہ کے کوائف ومشاہدات، جنۃ البقیع کے مقابر کی تفصیل اور حالات، کوہ اُحد کا مستقل تذکرہ، سید عالم ﷺ کی زیارت، گنبد خضراء کی عظمت، مدینہ منورہ میں اقامت کے آداب ائمہ کے مسالک کا بیان اور راجح مسلک کی تائید پر دلائل، واپسی کے آداب اور آخر پر درود شریف کے فضائل، طریقہ اور صیغہ درود، یوں یہ رودادِ محبت اسماء مدینہ سے شروع ہو کر صلاۃ وسلام پر ختم ہوئی۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ تاریخی روایت، جغرافیائی معلومات اور فضائل کی حکایت کے بیان میں اس قدر معلومات فراہم کر دیتے ہیں کہ قاری اس سفرنامہ سے تحقیقی کتاب کی برکات سمیٹتا ہے، جذب القلوب کا ہر حرف قاری کو جذب دروں کی حسنات عطا کرتا ہے، یہ جاذبیت ارضِ مدینہ سے حکایات مدینہ تک پھیل گئی ہے، کتاب کا لفظ لفظ پرتاثیر اور حرف حرف جاذبِ فکر ونظر ہے۔ قاری آہستہ آہستہ درِ محبوب کے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ اور بے خودی کے عالم میں درود وسلام کے نذرانے پیش کرنے لگتا

ہے، درحقیقت جذب القلوب کا نام، متن کا خلاصہ ہے اور بلاشبہ اسم بامسمیٰ ہے، غور کیجیے تو جذب القلوب ایک سفر ہی نہیں، عصر موجود کے اضطراب کا مداوا، ذات رسالت مآب ﷺ پر ایمان کا مضبوط تر استدلال اور عصری الحاد سے پراگندہ ذہنوں کے لئے اطمینان ویقین کا صحیفہ ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اکبر کے جلال وجبروت کا نشہ، مردان خوش گفتار اور صاحبانِ فکر وکردار نے یوں اُتارا کہ وہ اپنے تمام تر طمطراق کے باوجود تاریخ کے سینے میں ناخوشگوار لمحہ گریزپا کی طرح دفن ہوگیا، آج بھی ملت اسلامیہ کو ایسے ہی خطرات درپیش ہیں، عصر حاضر کا انسان معاشی جبر، معاشرتی ناہمواری اور تعلقاتِ باہمی کی بے ثباتی کا نخچیر ہے قبلہ رو ہونا اور حرمین شریفین کو مرکز نگاہ بنانا دشوار کیوں ہوتا جارہا ہے کیا آج کا قلمکار سفر حرمین کو یہ جہت عطا کرے گا؟

اردو زبان میں لکھے جانے والے سفرناموں کی تاریخ طویل ہے۔ مولانا رفیع الدین مرادآبادی (م 1223ھ) کا سفرنامہ حجاز اس دعویٰ کے ساتھ الفرقان لکھنو شوال 1380ھ کی خاص اشاعت میں چھپا کہ یہ ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ حجاز ہے۔ مولانا مرادآبادی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفسارات کی مضبوط نسبت رکھتے تھے۔ 1201ھ میں سفر کا آغاز کیا اور 1203ھ میں واپس لوٹے اس طرح دوسال دوماہ اور دو ہفتے حرمین یا حرمین کے سفر میں گزرے۔ مولانا متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ سفرنامہ فارسی میں لکھا جس کا مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے ترجمہ کیا۔ مولانا مرادآبادی کو تصوف سے بے پناہ لگاؤ تھا آپ حضرت شاہ غلام غوث قادری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے نسبتِ ارادت رکھتے تھے اور مولانا خیرالدین محدث سورتی سے سند حدیث حاصل

کرنے کا اعزاز بھی پاچکے تھے، سفرنامہ میں ہندوستان کے اُن تمام مقامات کا تذکرہ کیا جہاں سے گزرے، بحری جہاز کی مشکلات کا بیان بھی ہوا اور راستے میں پیش آنے والے واقعات کو درج کیا، مشاہدہ قوی ہے اس لئے تاریخی بصیرت، جغرافیائی معلومات حسبکہ سماجی مظاہر کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اتحاد ملت کا داعیہ قوی ہے اس لئے حنفی ہونے کا باوجود اتحاد کی صورت گری کے لئے مفید مشورے دیتے ہیں۔ سفرنامہ کی فضا پر عقیدت ومحبت کا رنگ نمایاں ہے اگرچہ مسالک کے اختلافی مسائل اوران کی وقوع پذیری کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ مزارات پر حاضری کی خواہش ہرلمحہ دامنگیر ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان قوم کے زوال، امت کی سیاسی ابتری، حکمرانوں کی بے تدبیری اور غلامی کی آمد آمد نے اُن کو دروں بینی پر مائل کردیا ہے۔ مسافران راہ حق جب راستہ بھولنے لگے تھے تو تصوف کی پناہ کے سوا کوئی چارہ بھی نہ رہا تھا، عصری خلفشار کا چیلنج اُن کو اس پناہ گاہ کے اشارے دے رہا تھا اس لئے انہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قوم کو عافیت گاہوں سے آگاہ کرنا مناسب سمجھا، زوالِ امت کی صدی گواہ ہے کہ جب سیاسی ابتری پھیلی تو معاشی گھٹن بھی آئی اور تدریسی آماجگاہیں بھی شکست وریخت کا شکار ہوئیں، علماء کے گرد حصار تنگ ہوا تو صیانت عقیدہ اور تقویم دین کا فریضہ صوفیاء ہی نے انجام دیا۔ مولانا مرادآبادی کا سفرنامہ بعض نادر معلومات کو بھی دامن میں لئے ہوئے ہے مثلاً امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں ارسال یدین کی نفی اور اہل مکہ کے بعض مراسم وغیرہ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب جذب القلوب اور مولانا رفیع الدین مرادآبادی کا سفرنامہ حجاز کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ دونوں بزرگ حالاتِ زمانہ کا رُخ

پہچان رہے تھے۔قوم کو درپیش مسائل کا ادراک اور اُن کا حل اُن کے مقاصد کا حصہ تھا، انہوں نے انتہابات کا مرعوب کن انداز تو نہ اپنایا مگر راہ نمائی کا فریضہ ضرور نبھایا۔غیر محسوس طریقے سے مرکز کی طرف دعوت اس ماہرانہ طریق سے دی کہ قاری صاحب تحریر کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے وہ صرف حرف وحکایت کے طلسم کا شکار نہیں ہوتا۔ مراد ومقصد کی طرف لپکتا ہے، بظاہر ایک سفرنامہ مگر درحقیقت ایک پیغام استقامت ونجات، بعد کے اودار میں سفرناموں کا عام رواج ہوا، بسا اوقات تو صرف تقلیدی روش انگیخت کرتی رہی، حرمین شریفین کی زیارت کا لازمی جزو ٹھہرا کہ تالیف وتصنیف کی کوئی صورت اپنائی جائے۔اخباری کالموں کی طرح اور دیگر ممالک کے سفرناموں کی روش پر بھی لکھا گیا، ذاتی حوالہ زیادہ نمایاں ہوا اور کبھی سفر کی مشکلات کے تذکروں کو ضرورت سے زیادہ پھیلایا گیا، حکایاتی انداز اور تصوراتی رپوتاژ کے جوہر بھی دکھائے گئے، اس طرح سفرنامہ ذاتی ڈائری کے روپ میں تو کبھی کالم کی ضرورت کے ازالے کے لئے لکھا گیا، عصر موجود، اسلام کی مرکزیت، کے خلاف نت نئے حربے استعمال کر رہا ہے، مسلمان کو باور کرایا جارہا ہے کہ ان کے نماز وروزہ کے لئے فضا میں کوئی گھٹن نہیں، ہاں اُن کو اپنی اپنی مملکت کا شہری بن کر مقامی داعیات کا ساتھ دینا ہوگا، عیسائیت کی طرح اپنا اپنا چرچ معتبر رہے گا اس لئے پاکستان کے شہری کے لئے اپنی حدود وسرحد کا ہی دفاع مناسب ہوگا، بھارت میں کیا ہو رہا ہے یا بوسنیا میں کیا قیامت قائم ہے یہ اُن ملکوں کے شہریوں کا مسئلہ ہے، یہ اس لئے کہ دنیا میں موجود کسی مذہب کے پاس مرکزی، نشان نہیں، قبلہ رو ہونے کی آفاقیت صرف مسلمان کو حاصل ہے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اور سیاسی وانتظامی مجبوریوں کے باوجود بھی جسدِ واحد ہیں، یہ وحدت حرمین شریفین کے حوالہ سے حسی قوت بنتی ہے۔اس لئے

اس کا اہتمام ہونا چاہیے، سفرناموں کو اس وحدت کا تحفظ کرنا ہے اور ملی فکر کو یکرنگی عطا کرنا ہے، عصر حاضر میں سیاسی وحدتوں کی کثرت نے حرمین کا راستہ ناروا پابندیوں سے ناہموار کر رکھا ہے، کبھی معاشی جبیر راہ کاٹتا ہے تو کبھی سیاسی بے کلی راستہ روکتی ہے، حکمران کی پسند وناپسند پر حج موقوف ہوجاتا ہے اور شہری باہمی اختلاف کے نتیجہ میں دیار اقدس سے رُکے رہتے ہیں، کبھی روسی استعمار سد راہ ہے تو کبھی اپنوں کی کشمکش اللہ تعالیٰ کے واضح فرمان کے باوجود سفر نصیب کی اجازت نہیں دیتی، زرمبادلہ کے مسائل، کوٹہ سسٹم کی گرفت، قرعہ اندازیوں کی پابندیاں، ان کا حل آج کے سفرناموں کا موضوع ہونا چاہیے، حرمین شریفین تک رسائی ہر صاحبِ استطاعت کا حق ہے اس رسائی کو آسان بنانا ہی اطاعت شعاری ہے، مسجد حرام ہر مسلمان کی توجہ کا مرکز اور سجدوں کا قبلہ ہے، سجدہ گزاروں اور مسجد کے درمیان رکاوٹیں بہر حال دور ہونا چاہئیں تاکہ معلوم دنیا کا ہر فرد اس طرف پیش قدمی کر سکے، یہ وہ مسائل ہیں جن کا ادراک ہر صاحب ایمان کو ہونا ضروری ہے اور سفرناموں کو ان حوالوں سے عصر حاضر کا چیلنج قبول کرنا چاہیے۔یقین کر لیجئے اسلامی مملکتوں میں جب تک حرمین شریفین کی مرکزیت کا شعور اجاگر نہ ہوگا، وحدتِ امت کا کوئی خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔

مسرت وامتنان کا مقام ہے کہ سفرناموں کی اہمیت تسلیم کی گئی اور ان کو جدید تحدیات کے تناظر میں عصری راہنمائی کی راہ دکھائی گئی تاکہ ادب اسلامی کا یہ شعبہ ذاتی کوائف کے حصار سے نکل کر تعمیر ملت کے لئے فعال کردار انجام دے سکے، یہ اعتراف بہر حال ہے کہ عصر حاضر کے بعض سفرنامے اس ضرورت کا احساس لئے ہوئے ہیں اور ملتِ اسلامیہ کو نئی راہیں دکھا رہے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور محنت کشی

انسانی زندگی میں عظمت وشرافت کا مرکز محنت ہے، انسان پیدائش سے واپسی کے دن تک کسی نہ کسی عمل میں مصروف رہتا ہے، یہ مصروفیت اعضاء کے حوالے سے بھی ہوتی ہے اور ذہنی وروحانی وابستگیوں کے حوالے سے بھی، جزاء سزا کا تصور بھی محنت سے عبارت ہے، جزا نیک اعمال کا نتیجہ ہے تو سزا بدعملی کا انجام، عمل اور پیہم عمل بہرصورت موجود ہے، انبیاء کرام علیہم السلام فلاحِ نوعِ انسانی کے نقیب ہیں اس لئے اُن کی تعلیمات کا محور عمل صالح کی ترغیب اور محنت ہے، یہ تو مسلّم حقیقت ہے کہ انسان جب تک زندہ ہے متحرک وفعال ہے یا بالفاظِ دیگر وہ شامل محنت ہے راہنمائی اور راہبری اس محنت کو مرغوب رُخ عطا کرنے کے لئے مہیا کی جاتی ہے۔ نامحبوب کوشش کا وجود تو ہے مگر انسان کی کامرانی کا راز اس میں مضمر نہیں اس سے ثابت ہوا کہ محنت برائے فلاحِ ذات اور برائے اصلاح معاشرہ محنت کی اصل مراد سے ہم آہنگ ہے اس لئے جب ہم لفظ محنت کش استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ انسان ہے جس کی جدوجہد کا ثمر قوم کی بہتری اور مجموعی مفاد کے لئے ہوتا ہے ناجائز کاروبار میں محنت، حصولِ حرام میں کاوش انسان کو محنت کش نہیں بناتے بلکہ یہ اعمال محنت کش کی محنت کا استیصال کرتے ہیں۔ محمود معنوں میں محنت کش معاشرے کا معزز فرد ہے ایک ایسا فرد جس کی زندگی کا ہر سانس معاشرے کے لئے توانائی اور قوت کا سرمایہ ہے۔ قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں محنت کش کی مثبت یا منفی روداد ہے۔ اسلام محنت کا داعی ہے۔ اسلام کے نزدیک محنت کشی، وقتی عمل یا لمحاتی ہیجان نہیں بلکہ یہ پوری زندگی کا

طریق ہے۔ جو عمل حیات انسانی کے اول وآخر کو محیط ہو اُس کے لئے راہنمائی نظریاتی بھی ہونی چاہیے اور عملی بھی، اسی لئے ہر دور میں انبیاء کرام علیہم السلام نے محنت کی افادیت اور اہمیت کا درس دیا اور خود محنت انجام دے کر اسے باوقار معانی بھی عطا کئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کائنات کے نبی ہیں آپ کی تعلیمات پوری زندگی کو محیط ہیں اور دائمی نوعیت کی ہیں اس لئے آپ نے ہمہ جہتی راہنمائی ارشاد فرمائی۔ محنت کے اصول بتائے۔ محنت کشی کے ضابطے مقرر کئے۔ محنت کش کے حقوق متعین کئے اور محنت کو جوہر معاشرت بنادیا اور پھر اس پر ہی اکتفا نہ کیا۔ جسے زندگی کا جزء لازم بنایا تھا اُس پر خود عمل بھی کیا کہ نبی کی زندگی تمام حسنات کا منبع ہوتی ہے۔ آپ نے پوری زندگی محنت کی۔ محنت کے مظاہر بدلتے رہے مگر ایک لمحہ بھی آپ کی زندگی کا بے عمل نہ رہا۔ ہمہ حرکت اور پیہم جدوجہد آپ کی مبارک زندگی کے استعارے ہیں، کبھی کسی پر بوجھ نہ بنے۔ اپنے منصب رسالت کی ادائیگی میں بھی بذاتِ خود شریک عمل رہے وہ کون سا مشکل مقام تھا جو آپ نے اپنی تبلیغی محنت سے سر نہ کیا، بدی کو کہاں کہاں نہ للکارا اور نیکی کے لئے کس جگہ کوشاں نہ ہوئے۔ یہ تو آپ کی زندگی کا عمومی رُخ تھا۔

مروج اور اصطلاحی مفہوم کے مطابق بھی آپ نے محنت کشی کو شعار بنایا۔ آپ ساری انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ تھے اس لئے آپ نے اُن محنت کشوں کے لئے بھی راہنمائی مہیا کی جو جسمانی مشقت اور ہاتھوں کی محنت سے اپنی معاش حاصل کرتے ہیں۔ معاش کے بارے میں اسلامی تعلیمات واضح بھی ہیں اور جامع بھی، اسلام انسان کی اس ضرورت کی اہمیت تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ اسے سب سے زیادہ لائق اعتنا گردانتا ہے۔ جو دین اخلاقیات کی بنیاد ہی معاشی، طریق عمل پر رکھ دے بھلا وہ حصول معاش سے صرفِ نظر کرسکتا ہے؟ رزق حلال، اعمال صالحہ کی بنیاد

ہے اور یہ محنت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ رزق حرام وہ ہے جس میں انسانی استحقاق ثابت نہ ہو اور انسانی استحقاق محنت کے حوالے سے ہی متعین ہوتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر معاشی مسائل کے حل کے لئے نبوی قیادت درکار تھی چنانچہ آنحضرت ﷺ نے معشیت کے ہر پہلو کو عملی مثالوں سے واضح فرما دیا اور بذات خود محنت کو شعار بنایا۔ یہ محنت صرف مثال مہیا کرنے کے لئے وقتی عمل نہ تھا بلکہ آپ کی پوری زندگی ایک محنت کش کی زندگی ہے سیرت مطہرہ کا مطالعہ ایسی بیسیوں مثالیں مہیا کرتا ہے کہ آپ نے کس کس طریق سے حصول رزق کے لئے معاشرتی فلاح اور قومی سربلندی کے لئے محنت کی ہے۔

کتب سیرت گواہ ہیں کہ ابھی آپ بچپن کے ایام سے گزر رہے تھے اور بنو سعد کے بادیے میں اپنی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں قیام پذیر تھے تو محنت اور سخت محنت آپ کو مرغوب تھی۔ اپنی رضاعی بہن شیما کے ساتھ بکریوں کی حفاظت، اور خبر گیری کے لئے عملی مشارکت فرماتے تھے۔ صحرا میں جہاں روئیدگی کم تھی۔ بکریاں دور تک پھیل جاتی تھیں کہ انہیں ترائی میں سبزہ مہیا ہوتا تھا آپ انہیں ہانکتے اور گھر کی طرف لانے کے لئے اُن کے پیچھے ہوتے۔ یہ غلہ بانی تمہید تھی مستقبل کی جہاں بانی کی جہاں محنت آپ کی ذات کا حصہ بن گئی تھی، دادا کی وفات کے بعد جناب ابوطالب کی حفاظت میں آئے تو گھر کی متوسط حیثیت آپ سے بھی محنت کا تقاضا کرتی تھی آپ نے ان ایام میں بھی بکریاں چرائی ہیں اور یوں چچا کے لئے معاشی خوشحالی کے لئے کوشش کی ہے۔ جوانی کے عالم میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال تجارت کے ساتھ شام کا سفر آپ کی لگن اور محنت کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ یہ محنت ہی کا ثمر تھا کہ منافع کی مقدار بڑھی تھی۔ ساتھی محنت کشوں سے حسن سلوک کی داستان

ہی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو حبالہ زوجیت میں لانے کا سبب بنی تھی۔

اعلان نبوت کے بعد تو محنت کشی کا درس بھی دینے لگے، بھیک مانگنے سے نفرت کے جتنے بھی احکامات ہیں وہ سب محنت کی طرف مائل کرنے کے لئے ہی ہیں، باعزت مسلمان گدائی نہیں کرتا محنت سے زندگی سنوارتا ہے آپ نے یہانتک فرما دیا کہ جو مزدور مزدوری پوری پائے اور کام سے جی چرائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ عملی طور پر مسجد قباء کی تعمیر ہو یا مسجد نبوی کی آپ اپنے صحابہ کے ساتھ انہیں کی طرح بلکہ اُن سے بڑھ کر محنت کرتے تھے۔ مسجد کی تعمیر میں خود پتھر اٹھا کر لاتے، صحابہ کہتے ہیں کہ آپ عموماً وہ پتھر اٹھاتے جو زیادہ بھاری ہوتا اور یہ بھی کہ اور لوگ تو ایک پتھر اٹھا کر لاتے مگر آپ دو دو اٹھا کر لاتے صحابہ کرام عقیدت مندانہ جذبے سے سبقت کرتے اور ہاتھ سے پتھر لے لیتے تو آپ دوسرا اٹھا لیتے، کہ یہ محنت صرف دکھاوے کا عمل نہ تھی بلکہ یہ تو ذات کا اقتضاء اور طبیعت کا خاصہ تھی آپ محنت کسی مجبوری کے تحت نہ کرتے بلکہ اسے زندگی کا ضروری جزو سمجھتے تھے۔ محنت کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہی نہ تھی بذات خود محمود تھی، یہ محنت کشی کی عادت ہی تھی کہ آپ نے کسی کام میں عار محسوس نہ کی، کپڑا پھٹا تو خود ہی سیا جوتا ٹوٹا تو خود ہی مرمت کیا اور اپنی امت کے محنت کشوں کو حوصلہ دیا کہ اُن کا آقا جو کائنات کا نبی ہے کسی محنت سے نہیں گھبراتا تو انہیں کسی کام میں عار یا سبکی کا احساس نہ ہونا چاہیے۔

حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں وہ جانگسل مرحلہ بھی آیا کہ مدینے پر کفار مکہ نے حملہ کر دیا ایسے بھرپور حملے کے بچاؤ کے لئے دفاعی اقدامات ضروری

ہوئے تو خندق کھودنے کا مشورہ ہوا۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم خندق کھودنے میں مشغول ہوئے آنحضرت ﷺ بنفس نفیس عملی مشارکت فرماتے رہے۔ پتھریلی زمین کو کاٹنا آسان تو نہ تھا۔ رحمت عالم ﷺ ہاتھ میں گدال لئے خندق کی تیاری میں مشغول تھے کہ صحابہ کرام حاضر ہوئے کہ اُنہیں ایک بھاری اور مضبوط پتھر نے اس فریادرسی پر مجبور کردیا تھا۔ امام بخاری کتاب المغازی میں روایت کرتے ہیں کہ فجاء والنبی ﷺ فقال ھذہ کدیة عرضت فی الخندق صحابہ رضی اللہ عنہم عرض کرنے لگے کہ حضور یہ ایک سخت پتھر خندق کی راہ میں حائل ہوگیا ہے۔ یہ بات سنتے ہی فرمایا۔ ''أنا نازل'' میں آیا، پھر آپ اٹھے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے خود مشاہدہ کرلیا کہ ''بطنہ معصوب بحجر'' کہ اُن کے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا اور یہ ایک دن کا معاملہ نہ تھا تین روز سے اس محنت شاقہ کے باوجود کھانے کو کچھ میسر نہ تھا مگر اللہ کا نبی ان نامساعد حالات اور وسائل کی نایابی کے باوجود اتنا جفاکش اور محنت کش تھا کہ ''فاخذ النبی ﷺ المِعوَلَ فضَرَبَ'' آپ نے کدال تھامی اور ایک ایسی ضرب لگائی کہ ''فعاد کثیبًا اَھْلَ اَوْ اَھْیَم'' کہ وہ سخت پتھر ریت ہوکر رہ گیا۔ آقائے دوجہاں ﷺ نے ہاتھ میں کدال لئے پتھر کاٹنے میں مشغول ہوکر محنت کشوں کو پیغمبرانہ حوالہ عطا کیا آپ کی قوتِ ضرب کا نظارا بھی صحابہ رضی اللہ عنہم نے کرلیا کہ جہاں جوان ہمت ہار رہے تھے اللہ کے نبی ﷺ کی ایک ضرب ہی نے پتھر کو ریزوں میں منتقل کردیا، اس محنت میں آپ کی مشغولیت اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کان النبی ﷺ ینقل التراب یوم الخندق حتی اغمر بطنہ

اَوْ اغبر بطنہ کہ حضور اکرم ﷺ خندق کی جنگ میں خود مٹی اٹھا اٹھا کر خندق سے باہر منتقل کرتے تھے حتٰکہ آپ کا شکم مبارک گرد سے اٹا ہوا تھا ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں رَاَیْتُہٗ یَنْقُلُ مِنْ تُرَابِ الْخَنْدَقِ حَتّٰی وَارٰی عَنّی الغبار جلد بطنہ یعنی آنحضرت ﷺ خندق کی مٹی باہر نکالتے تھے حتٰکہ مٹی کے غبار نے آپ کے شکم کو مجھ سے چھپالیا تھا یعنی اس قدر گرد آپ پر پڑ چکی تھی کہ جسم اُس سے ڈھکا ہوا تھا غور فرمائے جب اس قدر عظیم نبی محنت کش کی حیثیت سے پتھر کاٹتے ہیں اور مٹی اٹھاتے ہیں تو قوم کو کیا درس دے رہے ہوتے ہیں؟ کیا ایسے نبی کی امت کو محنت سے جی چرانا، بے عملی کا مرتکب ہونا زیب دیتا ہے۔ آقائے دوجہاں ﷺ تو محنت کشی، کو زندگی کا حسن سمجھتے رہے اور محنت کشی کے خوگر رہے مگر امت اس محنت کو کسرِ شان سمجھے اور بے عملی، راحت اور دوسروں کی محنت کے استیصال سے لذت حاصل کرے تو سوچئے کہ اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کے قرآنی احکام سے انکار نہیں تو اور کیا ہے۔ محنت سے نفرت دراصل شرفِ انسانیت سے نفرت ہے۔ اسلام کی تعلیمات محنت کشی کی عظمت تسلیم کرتی ہیں اور رسولِ اسلام ﷺ ایک محنت کش کے لئے اپنے لائحہ عمل سے بہترین نمونہ ہیں یہ حقیقت کبھی نہ بھولنی چاہیے کہ محنت میں عظمت ہے اور محنت کشوں کی صف میں تاجدارِ انبیاء ﷺ بھی شامل ہیں۔

اللہ کرے ہم محنت کشی کو شعار بنائیں تاکہ کامیابیاں اور کامرانیاں ہمارا مقدر بنیں۔ آمین

اُسوۂ حسنہ۔۔۔حاکموں کے لئے

انسان فطرتاً معاشرت پسند ہے۔وہ کسی نہ کسی معاشرے کا فرد بن کر رہنا چاہتا ہے،سماجی ومعاشرتی تعلقات اُسے زندگی سے پیار اور تحفظ کا احساس عطا کرتے ہیں،تمدنی روابط اسے روحانی خوشی اور مادی اُسودگی مہیا کرتے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کی ترغیب دیتے ہیں اور اس طرح اُس کی زندگی کو حرکی قوت بخشتے ہیں۔

معاشرہ متنوع اور متفاوت صلاحیتوں کے افراد سے عبارت ہوتا ہے جس میں ہر فرد اپنی بساط کے مطابق بلند مقام کے حصول میں کوشاں رہتا ہے۔بعض افراد بہتر صلاحیتوں یا مناسب حالات کی وجہ سے اپنے دیگر ہم جنسوں سے نمایاں ہوجاتے ہیں اور اس طرح معاشرتی درجہ بندی ظہور پذیر ہوتی ہے۔حاکم اور ماتحت کا تصور اسی درجہ بندی کا مظہر ہے۔بنیادی طور پر یہ ایک پیشہ وارانہ تقسیم ہے تاکہ نظام معاشرت میں ہمہ جہتی اشتراک عمل پیدا ہو مگر بدقسمتی سے بعض جاہ پسند اور کج فہم افراد اس تقسیم کار سے ناجائز مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُن کے طرز عمل سے بداعتمادی کی فضا پیدا ہوتی اور معاشرتی سکون تباہ ہوتا ہے اسلام چونکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ابدی راہنمائی مہیا کرتا ہے تاکہ حقوق وفرائض کا حسن اور دلکش مرقع ترتیب پائے اس لئے اس نے ہر فرد کا دائرہ کار مقرر کردیا ہے۔حضور اکرم ﷺ تمام بنی نوع انسان کے لئے حیات بخش اور قابل تقلید نمونہ ہیں:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:21)

''یعنی بیشک رسول ﷺ کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین نمونہ موجود ہے۔''

خطاب پوری انسانیت سے ہے جس میں آجر ومزدور، تاجر وگاہک، محنت کش اور صنعت کار اور حاکم ورعایا سب شامل ہیں۔انسان کسی حیثیت میں ہو اسے اپنی دنیا کو خوشحال بنانے اور عاقبت کو سنوارنے کے لئے اسی درِ رحمت کی طرف رجوع کرنا ہے۔

''حاکم'' کے لغوی معنی ہیں فیصلہ کرنے والا، متضاد آراء میں درست راہ کا تعین کرنے والا، اس میں تسلط وتغلب یا ملکیت کا کوئی تصور موجود نہ تھا مگر فیصلہ کرنے کی قوت اور فیصلہ نافذ کرنے کی طاقت نے ان معانی میں تسلط وملکیت کا مفہوم بھی شامل کردیا۔اسلامی تعلیمات کے مطابق حکومت کا حق صرف باری تعالیٰ کو حاصل ہے جو سب کا خالق اور ربّ ہے۔زندگی کے تمام معاملات میں اُس کے احکامات واجب الاتباع ہیں اور ان سے انحراف قابل گرفت ہے، انسان بحیثیت نائب اس کے احکامات کو نافذ کرنے کا مکلف ہے، ''اقتدارِ اعلیٰ'' اللہ کو حاصل ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (الانعام:57)

حکم صرف اللہ کا ہے، انسانوں کی حکومت تو فرائض کی بجا آوری کا ماحول پیدا کرنے کے لئے ہے، حکومت ایک امانت ہے جسے امانت ودیعت کرنے والے کی شرائط کے تحت ہی استعمال کیا جاسکتا ہے ورنہ خیانت ہوگی جو بدترین جرم ہے

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ:45)

''اور جو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ فرامین کے تحت حکم یعنی فیصلہ نہیں کرتے تو وہ کافر ہیں۔''

دوسری آیت میں:

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ:4)

''یعنی وہ ظالم ہیں۔ کا ارشاد ہوا۔

رسول اکرم ﷺ اللہ کے فرستادہ اور اُس کے حکم کے مطابق مُطاع اور حاکم ہیں تا کہ آپ معاشرتی عدل و انصاف قائم کریں اور انسانوں پر انسانوں کی حکومت کے بُت کو توڑیں، تاریخ عالم میں ایک ایسا سنہری دور بھی آیا کہ آنحضرت ﷺ مروّج سیاسی اصطلاح کے مطابق حاکم تھے، آپ نے مسندِ اقتدار پر فروکش ہو کر حاکمیت کے اسلامی تصور کو عملی قالب عطا فرمایا اور آنے والے حاکموں کے لئے ایک روشن مثال قائم کی کہ وہ آپ کے طرزِ حکومت سے کسبِ فیض کریں اور اللہ تعالیٰ کی تفویض کردہ امانت کا حق ادا کریں۔

اُسوۂ رسول ﷺ میں حاکموں کے لئے نظریاتی راہنمائی بھی موجود ہے اور عملی راہبری بھی، حکومت کے بارے میں متوازن نقطۂ نظر کیا ہے؟ یہ مسئلہ ہمیشہ سے معرضِ بحث میں رہا ہے، ماضی قدیم میں سربراہانِ مملکت اس خیال فاسد کا شکار رہے کہ تختِ حکومت پر تمکن اُن کا پیدائشی حق ہے اور یہ کہ حکومت کرنے کا جوہر صرف انہیں تفویض ہوا ہے اس لئے جب تک ممکن ہو سر برآرائے سلطنت رہنا چاہئے اور اپنی حکمرانی کا دبدبہ قائم رکھنا چاہئے۔ اسی تصور نے مسئلہ حقوق آسمانی کو جنم دیا جو ہزاروں سالوں سے حکمرانوں کے مزاج کے بگاڑ کا باعث بن رہا ہے۔ یورپ تو ماضی قریب تک اس مسئلے کی گرفت میں رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، آپ ﷺ کو الہامی راہنمائی حاصل ہے، یہ امتیازی وصف آپ ﷺ کو عام حکمرانوں سے ممتاز کرتا ہے مگر تاریخ عالم کا طالبِ علم جانتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی جداگانہ حیثیت کے باوجود اپنے آپ کو مرکزِ حکومت بنانے پر اصرار نہ کیا بلکہ ہمیشہ تمام ملّت کو شریکِ حکومت بنانے کا درس دیا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (آل عمران: 159)

کے خدائی فرمان کے مطابق آپ ﷺ ہر اہم مسئلے پر افراد امت سے مشاورت طلب کرتے رہے، آپ ﷺ اللہ کے برگزیدہ رسول تھے اور یہ آپ ﷺ کا منفرد وصف تھا مگر باین ہمہ جب کسی جانثار کے دل میں آپ ﷺ کی عظمت کا نقش الوہیت کی حدین چھونے لگا تو آپ ﷺ نے برملا خبردار کر دیا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، میں بھی ایک عورت کا بیٹا ہوں جو ثرید کھاتی تھی آپ ﷺ کا بار بار اپنی انسانی حیثیت کا اظہار دراصل ایک اشارہ یہ تھا اُن حکمرانوں کے لئے جنہیں حکومت کا نشہ باطل نظریات تراشنے پر اکساتا رہتا ہے، قرآن پاک نے أُولِي الأمر منكم (النساء: 59) فرما کر واضح کر دیا کہ حاکم قوم کا حصہ ہوتے ہیں، وہ قوم سے مختلف یا بلندتر نہیں ہوتے، یہ عقیدہ جب پختہ ہو جاتا ہے تو پھر کوئی حکمران اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرتا اور نہ ہی قوم ظلم و جور کو تقدیر الٰہی سمجھ کر قبول کرتی ہے، اس باہمی توازن سے قوم اور حکمران کے درمیان صحت مندانہ تعلقات پروان چڑھتے ہیں اور پورے معاشرے پر ہم آہنگی کی فضا طاری ہوتی ہے۔ ہر فرد خواہ وہ حکمران ہو یا ماتحت قومی یکجہتی کے تصور سے سرشار ہوتا ہے، سب کی نظر اپنے اپنے فرائض پر ہوتی ہے حقوق اور مطالبات کی فہرستیں مرتب نہیں ہوتیں کام کی لگن کی دُھن ہوتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ نے حکمرانی کو حصول دولت یا خواہش نفس کی تکمیل کا ذریعہ نہیں، قومی ذمہ داری بنا دیا۔ تختِ حکومت امتحان گاہ بنا، بیت المال امانت قرار پایا اور دریائے فرات کے کنارے پیاس سے نڈھال چوپایہ بھی حکمرانوں کی نیند اُچاٹ کرتا رہا۔

رسولِ کریم ﷺ کے دربار میں کسی صحابی ؓ نے تخت بنانے کی تجویز پیش کی تاکہ آپ ﷺ اُس پر فروکش ہوں اور ساتھیوں سے ممتاز نظر آئیں، آپ ﷺ نے اس خیال کی تردید فرمائی اور سب کے ساتھ بیٹھنا پسند فرمایا۔ یہ مساوات اسلام کی وہ سنہری روایت ہے جو حکمرانوں کو بلند بام نہیں ہونے دیتی بلکہ عوام کا حصہ بنا دیتی ہے، اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ بیت المقدس کی فتح کے موقعہ پر القدس کے دروازے پر حضرت عمر ؓ جیسا حکمران اونٹنی کی مہار تھامے ہوئے ہے اور خدمت گار اُس پر سوار ہے۔ یہ تقسیم مراعات کی عمدہ اور عملی مثال تھی جو دشمنوں سے بھی خراج وصول کر رہی تھی۔

جنگ احزاب میں خندق کی کھدائی ایک صبر آزما مشقت تھی، آپ ﷺ بنفس نفیس اس میں سرگرم کار تھے، کُدال ہاتھ میں ہے اور پتھر کاٹے جا رہے ہیں، اس شراکت نے ساتھیوں کو اعتماد اور کام کی لگن عطا کی، آپ ﷺ نے حکمرانوں کو عملی درس دیا کہ وہ بذاتِ خود ہر کام میں شامل رہیں اس سے کارکنوں کا حوصلہ بڑھتا ہے اور محنت کی عظمت قائم ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی ذات کو کبھی اپنے ساتھیوں سے الگ نہ کیا، آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کے شب و روز گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے اور اُمت مسلمہ کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہ کی، سب سے ملتے، ہر کسی کے سوال کا جواب دیتے، ہر کام میں سبقت فرماتے، آپ ﷺ کے گھر کی دیواریں کبھی اتنی اونچی نہ ہوئیں کہ باہر کی دنیا سے رابطہ ٹوٹ جائے، کوئی باہر کھڑا آواز دیتا تو گھر میں صاف سنائی دیتا، یہ تبھی ہوتا ہے جب ساتھیوں پر بھروسہ اور عوام کا اعتماد حاصل ہو، یہ تعلیمات جب خلفاء راشدین کے عمل میں ڈھلیں تو تاریخ عالم

میں ایسے مرحلے بھی آئے کہ کسریٰ کا ایلچی سلطنت اسلامیہ کے دارالخلافہ مدینہ منورہ میں خلیفہ وقت کا محل تلاش کرتا رہا تو اسے ایک کچے سے مکان کے سوا کچھ نہ ملا، وہ حیرت زدہ تھا، وہ تو تہہ در تہہ بلند و بالا دیواروں کو جانتا تھا مگر یہاں دنیا کے بیشتر علاقے کا حاکم کسی محل نما عمارت کے تصور سے آشنا نہ تھا، وہ متجسس نگاہوں سے پورے ماحول کا جائزہ لیتا رہا اور جب اسے کھجور کے سائے میں ریت پر آرام کرنے والے کا تعارف خلیفہ وقت کی حیثیت سے کرایا گیا تو وہ لرزہ براندام ہو گیا، اپنے خالق کی ذات پر اس قدر بھروسہ اور اپنی قوم پر اس درجہ اعتماد، وہ بے ساختہ پکار اٹھا:

''اے عمر ؓ تو نے عدل کیا اور گہری نیند سویا، ہمارے حکمران ظلم کرتے ہیں اس لئے محلات میں محافظوں کے جھرمٹ میں بھی سو نہیں سکتے۔

(شہکارِ عدالت فتح محمد نسیم ص 176)

رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی سچی تصویر تھی کہ:

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء 85)

''کہ جب تم لوگوں کے حکم بنو تو حکومت یا فیصلے عدل سے کرو۔''

انسانی زندگی کا نازک ترین مسئلہ یہ ہے کہ حکمران اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کو قومی مفاد اور مجموعی فلاح پر قربان کرنے کا حوصلہ نہیں پاتے، دوستوں کی دوستی، رشتہ داروں کی نسبت اور ساتھیوں کی رفاقت انہیں اپنے فیصلوں میں جانبداری پر اُکساتی ہے جبکہ دشمنوں کی دشمنی اور مخالفوں سے عداوت عدل و انصاف کا خون کراتی ہے، قرآن پاک نے انہیں دو محرکات کا بڑی وضاحت سے ذکر فرمایا:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ

لِلتَّقْوٰی (مائدہ:8)

''اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں عدل سے منحرف نہ کردے، عدل کرو یہی تقویٰ کے قریب تر ہے۔''

پھر فرمایا:

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (الانعام:102)

''اور جب بات کرو تو عدل سے اگرچہ قریبی ہی کیوں نہ ہو۔''

قریش کے معزز خاندان میں فاطمہ نامی عورت کو جب چوری کی پاداش میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دی گئی تو کئی صحابہ رضی اللہ عنہم نے خاندانی وجاہت کے پیش نظر درگزر کا مشورہ دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یاد رکھو اگر میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی ایسا کرتی تو ہاتھ کاٹ دیتا'' (صحیح مسلم کتاب الحدود)

آپ ﷺ کا یہ ارشاد تنبیہ ہے حکمرانوں کے لئے کہ فیصلے معروضی حالات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے بعد عدل وانصاف سے کیا کرو، نفاذ احکام میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں، سب برابر ہیں، اس طرز عمل نے نظام عدل کو استحکام بخشا۔

الغرض آنحضرت ﷺ کی حیات مقدسہ ایک مینارہ نور ہے جس سے کسبِ فیض کرکے حکمران اپنی زندگیوں کو منور کر سکتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمان حکمرانوں کو یہ توفیق بخشے کہ وہ آپ ﷺ کے اُسوہ حسنہ کو مشعلِ راہ بنائیں تاکہ پورا اسلامی معاشرہ خوشیوں کا گہوارہ بن جائے۔ آمین

اسراء ومعراج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ① (سورہ بنی اسرائیل:1)

''پاک ہے وہ ذات جو رات کے ایک مختصر لمحے میں اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے گرد ہم نے برکات رکھی تھیں تاکہ ہم اپنے بندے کو اپنی آیات دکھائیں، بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے''۔

اس ارشاد باری میں نبی اکرم ﷺ کو عطا کئے جانے والے اُس شرف کا ذکر ہے جو آپ ﷺ کو تمام کائنات میں ممتاز ومنفرد مقام عطا کرتا ہے، ''معجزہ'' نبوت ورسالت کا وہ وصف ہے جو دلیل نبوت ہوتا ہے، اس میں قوت ومقدرت کی وہ شان موجود ہوتی ہے جو مخاطب کو عاجز کردے اس طرح کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیت کے باوجود اس کا جواب پیش نہ کرسکے، ہر نبی اور رسول کو کسی نہ کسی شکل میں معجزات عطا ہوئے تاکہ اُن کی برتر حیثیت کا احساس نمایاں ہو، نبی اکرم ﷺ کو بھی معجزات عطا ہوئے مگر ان کا دائرہ کار وسیع تر ہے کہ یہ زمینی حوالوں سے لے کر آفاق کی پہنائیوں تک محیط ہیں، معراج ان معجزات کا نقطہ عروج ہے۔ جو ہر حیثیت سے رسالت عظمٰی کی رفعتوں کا امین ہے۔ کائنات جو لامحدود و بے پایاں ہے اس کے اسرار ورموز بھی

ان گنت اور ماوراء فہم ہیں، ان اسرار ورموز کو جاننے کی ہر صاحبِ عقل وشعور کو دعوت دی گئی ہے اور باصلاحیت افراد نے ان کی رسائی کی حتی الامکان کوشش بھی کی ہے مگر سب کو یہ اعتراف ہے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں جو اُن کی دسترس سے باہر ہیں، نبی یا رسول کا وجود ایسی صلاحیتوں سے فیض یاب ہوتا ہے جو غیر نبی وجود کی حدود سے بہت وسیع ہوتی ہیں یہ اس لئے بھی کہ منصب نبوت و رسالت برتر علم اور فزوں تر صلاحیتوں کا تقاضا کرتا ہے، یہ ہی وہ وجود مختار ہوتا ہے جو خالق کا پیغام بر ہے، خالق کے حوالے سے اُس کی توانائیاں بے حد وحساب اور آفاقی ہوتی ہیں مگر اس عموم میں جو خصوصیت سرکارِ دوجہاں ﷺ کو حاصل ہے وہ مشن کی آفاقیت پر شاہد بھی ہے اور عالمین کی ہمہ گیریت کا نشان بھی ہے۔ دائمی اور آخری حیثیت کا اقتضاء ہے کہ منزلت بھی بلند ہو اور قوت بھی ہمہ گیر ہو، معراج اسی منزلت کا ایک حوالہ ہے۔

اِسراء اور معراج دو مختلف کلمات ہیں مگر یہ دونوں ایک ہی عظمت کے حوالے ہیں لغوی اعتبار سے اسراء، رات کے سفر کو کہا جاتا ہے، باب افعال نے جانے کے بجائے لے جانے کا مفہوم دیا اور باء کے لاحقہ نے اس تعدیہ کی تحقیق کر دی ہے، مفہوم یہ ہوا کہ یہ سیر کرائی گئی ہے، سُبۡحَانَ یعنی پاک ذات جو ہر عیب، ہر عجز اور ہر خامی ومجبوری سے پاک ہے، نے اپنے بندے کو سیر کرائی ہے، واقعہ کی خصوصی حیثیت جس پر مادی تنگ ناؤں کے اسیر شک کا اظہار کریں گے کہ یہ عقلِ محدود کے احاطہ میں نہ آئے گا اس لئے ابتداء میں ہی ہر اٹھنے والے سوال کو رد کر دیا، یقیناً یہ واقعہ انسانی عقل کے لئے حیرت کا سبب ہے کہ انسان اپنے دائرہ فکر میں اسیر ہے اس لئے یہ سوال کہ ایک وجود جو بشری لوازم کے ساتھ دکھائی دیتا ہے، جسے پتھر لگیں تو زخم

آتا ہے، کانٹے چبھیں تو ٹیس اٹھتی ہے جس کے گلے میں کوئی دشمن کپڑا ڈال کر کسے تو نشان پڑتا ہے غرضیکہ حس کے وجود میں انسانی علامات کے تمام مظاہر موجود ہیں وہ وجود کیسے اس بلند پروازی کا اہل ہو سکتا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ زمین کے گرد ہوا کا ایک دائرہ ہے اُس سے جو نکلے گا، زندہ نہ رہ سکے گا ہاں تو فضاؤں سے بلند ایک کرۂ نار بھی تو ہے جہاں جو گیا جل گیا، تو پھر ایک وجود مکہ مکرمہ سے کس طرح لمحوں میں مسجد اقصیٰ گیا اور پھر کس طرح آفاق کی ہر پنہائی کو عبور کرتا رہا حتکہ زمان ومکان کے ضابطے بھی دم توڑ گیا، یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ یہ اور اس قسم کے ہزاروں سوالات اٹھ رہے ہیں اور اٹھتے رہیں گے، ان سب کو جواب واقعہ کی حکایت کی ابتداء میں سبحان کہہ کر دے دیا گیا۔ کب کہا گیا؟ کہ رسول اللہ ﷺ گئے، رات کے مختصر حصے میں گئے، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک گئے، یہ سب سوال تو تب پیدا ہوئے اگر فاعلیت کی ضمیر کا مرجع ذاتِ رسالت مآب ﷺ ہوتی۔ ایسا ہوتا تو جواب بھی دیئے جاتے کہ امکان اس کا بھی تھا، سیر نبوت اور پرواز رسالت سے انکار بھی تو کوتاہ نظری ہے مگر یہاں تو ایسے خیالات کو اٹھنے ہی نہیں دیا گیا، ابتداء ہی واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ سبحان اپنے بندے کو لے گئی، اب اعتراض جانے والے کی ہمت وطاقت پر ہے یا لے جانے والے کی قدرت وسبحانیت پر، ذات باری کی قدرت اگر تسلیم ہے تو اُس کے فعل کو بھی تسلیم کرلو، جانے والا وجود تو خوابِ استراحت میں تھا، نہ سفر کا ارادہ نہ سفر کی تیاری یہ تو لے جانے والے کی رضا تھی۔ بندہ اُس کا تھا، وہ کہاں لے جائے اعتراض کیوں کر، مسجد حرام اُس کی تخلیق کی گئی زمین پر، مسجد اقصیٰ اُس کی قدرت کی حدود میں، یہاں کا مالک بھی وہی اور وہاں کا بھی وہی، رات دن کی گردش

اُسی کے قبضہ اقتدار میں، فاصلے اُس کی حکمت کے نشان، لمحات اُس کی رضا کے پابند، سب کچھ تو اُسی کا ہے، دن اُس کے حکم سے طلوع ہوتا ہے تو رات اُسی کے فرمان کے مطابق طاری ہوتی ہے۔ لمحوں کی گردش اُس کی پابند کہ جہاں چاہے ٹھہرا دے اور جس پر چاہے جاری فرما دے۔ حضرت عزیز علیہ السلام کی سواری پر تو گردش نے اپنا عمومی عمل جاری رکھا مگر کھانا جو جلد اس عمل سے باسی ہو کر بے کار ہو جائے باقی رہا، ایک ہی دورانیہ میں لمحات اور ان کی گردش کا عمل مختلف تھا تو اُس قادر و قیوم کے لئے کیا یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے عبدِ خاص کو لمحات کی گردش کی اسیری سے نکال لے۔

سوچئے اپنے بندے پر اُس کا قادر و قیوم رب کوئی انعام کرنا چاہیے تو بدحواسیاں کیوں، کیا اُس کا بندہ اُس کے قبضہ اقتدار میں نہ تھا؟ کیا وہ اپنے ہی بندے کو کہیں لے جانے کی قوت نہ رکھتا تھا۔ کیا مسجد حرام اُس کی نہ تھی کہ وہاں سے اپنی قدرت کے اظہار کی ابتداء کرلے؟ کیا مسجد اقصیٰ ملکوت السموات والارض سے باہر تھی؟ اگر نہیں تو یہ سب ملکوت تو اُس کے قبضہ اقتدار میں ہیں، پریشانی کیسی، کن کہہ کر فیکون کے لازمی نتیجہ تک لے جانے والی ذات کی قدرت، طاقت، سلطانیت اور ملکیت پر شک کس لئے؟ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو عظمتِ رسالت کے اظہار کا ذریعہ بنایا تو اس سے کہیں بڑھ کر اپنی سبحانیت کی دلیل بنایا، پاک ہے وہ ذات کہا یہ دعویٰ تھا، دلیل اسراء کا واقعہ تھا۔ دلیل کا انکار تو دعویٰ سے انحراف ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ اسراء و معراج کو قدرتِ الٰہی کا مظہر گردانا چاہیے اور اس قدرت کے نتیجے میں رسول اکرم ﷺ کی عظمتِ معراج کا اعتراف کرنا چاہیے، معراج رفعتِ رسالت کا حوالہ ہے، اس سے انکار، رسالت کی بلند پردازیوں سے ہی انکار نہیں، ذاتِ باری کی

عظمتوں سے بھی انکار ہے۔

سبحان کہہ کر انسانی ذہنوں کی گرہیں کھول دی گئیں، عبدہ کہہ کر واضح کر دیا گیا کہ یہ خالق سبحان کا اپنا انتخاب ہے، اس شرف کا مستحق کون تھا؟ کیوں تھا؟ کس لئے تھا؟ یہ سوال موضوعِ بحث ہی نہیں ہیں اس لئے کہ خالق کو اپنے بندے کے انتخاب میں پابند نہیں کیا جا سکتا، یہاں یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ خالق کا انتخاب کردہ وجود اپنی عظمتوں اور رفعتوں کے باوجود اُس کا عبد ہے۔ وہ نہ الوہیت میں شریک ہے اور نہ بندگی کی حدود سے ماوراء، یہ عظمتیں اور یہ رفعتیں تو اُس ''عبدِ خاص'' کی عبدیت کے مظاہر ہیں۔ واضح کر دیا گیا کہ سفرِ معراج اپنی تمام تر برکات اور منزلتوں کے باوصف ''عبدیت'' کا سفر ہے کہ یہ قرب کی منزل ہی تو ''عبدہ'' کی شناخت بنی ہے۔

احسان کے بارے میں جبرئیل امین علیہ السلام کے سوال پر نبی العلم ﷺ نے فرمایا تھا کہ تو اللہ تعالیٰ کی یوں عبادت کر کہ جیسے تو اُسے دیکھ رہا ہے۔ واضح کر دیا گیا کہ عبادت کا حسن یہ ہے کہ عبد اپنے معبود کو دیکھ کر سجدہ کرے اور اگر یہ مقام قرب حاصل نہیں ہے تو یوں سمجھے کہ وہ خالق و معبود اُسے دیکھ رہا ہے۔ یعنی یا تو رویت کی سرافرازی حاصل ہو یا حضوری کا تصور مستحکم ہو، معراج اسی سرافرازی کا مظہر ہے کہ ''عبد'' اپنے معبود کے حضور حاضر ہے، مقام ''عبدہ'' اسی افتخار کا حوالہ ہے۔ روایت ہے کہ قرب کی اس منزل پر طویل دورانیے کا سجدہ کیا گیا، یہ سجدہ، سجدوں کی معراج ہے اسی لئے ارشاد ہوا کہ نماز مومنوں کے لئے معراج ہے کہ ''سجدہ'' قربِ معبود کا وہ لمحہ ہے جس میں نمازی سراپا نیاز بن کر بارگاہِ صمدیت میں حاضر ہوتا ہے، اصل عظمت اسی نیاز مندی کو حاصل ہے اس لئے معراج کے وصل میں جو تحفہ خاص عطا ہوا وہ نماز ہے، نماز بلندیوں کی امین ہے۔ یہ عبد و معبود کے درمیان وہ واسطہ ہے جو معراج کے

قرب کا مظہر ہے۔

معراج کا لغوی معنی بلند وعروج یا ذریعہ عروج ہے یعنی یہ وہ زینہ ہے جو عروج کا ذریعہ اور رفعتوں تک رسائی کا سبب بنے، مکہ مکرمہ سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کو اِسراء کہا جاتا ہے اور وہاں سے آسمانوں کے ورے تک کے عروج کو معراج کہا جاتا ہے، مستند روایات کے مطابق اسراء اور معراج ایک ہی سفر کے دو حصے ہیں، یہ سفر ایک ہی ہے جو زمینی مشاہدات اور آسمانی تجلیات کو محیط ہے، سورہ بنی اسرائیل کی ایک ہی آیت میں تمام سوالوں کا جواب دے دیا گیا مثلاً

کون لے کر گیا	فرمایا ذات سبحان نے یہ سفر کرایا۔
کون گیا	فرمایا بندہ خاص یعنی رسول اکرم ﷺ
کب گئے	رات کو
کتنا عرصہ لگا	رات کا ایک غیر محسوس لمحہ
کہاں سے گئے	فرمایا مسجد حرام سے
کہاں تک لے جایا گیا	فرمایا مسجد اقصیٰ تک

مسجد اقصیٰ میں کیا خصوصیت تھی فرمایا ہم نے اُس کے گرد کو برکتوں کا مصدر بنایا تھا۔
مقصد سفر کیا تھا فرمایا: تا کہ ہم اُس بندہ خاص کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔

کتنا جامع بیان ہے، خالقِ کائنات اپنے رسول اکرم ﷺ کو اپنی آیاتِ قدرت دکھانا چاہتا ہے اور اس لطف خاص کا ذکر اس لئے کیا جا رہا ہے، تا کہ عظمت ورسالت بھی آشکار ہو اور بلندیوں کے سفر کی تحریک بھی ملے اس طرح کہ عرش نشین رسول اعظم ﷺ کے نقوش قدم کو جادہ ہدایت تسلیم کر لیا جائے محب کو محبوب

کے نشان قدم بلند حوصلگی عطا کرتے ہیں اور وہ اس قدر رفعتِ نظر کا خوگر ہو جاتا ہے کہ پھر اس جہانِ آب وگل پر ہی قناعت نہیں کرتا، اسی حوالے سے علامہ اقبال پکار اٹھے تھے کہ

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلمان کی
ستارے جس کی گردِ راہ میں وہ کارواں تو ہے

معراج رفعتوں کا امین، عظمت رسالت کا نقیب، عبدیت کی سرافرازوں کا نشان اور تسخیر کائنات کے لئے ایک تحریک ہے، علامہ فرماتے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی رومیں ہے گردوں

اللہ کرے ہم نبی مکرم ﷺ کی عظمتوں سے آشنا ہو جائیں، معراج کے اشاروں کو سمجھیں اور سجدوں کے ذوق سے عظمت انسانی کا راز پالیں آمین

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

خالق کائنات کے ارادے سے اس کائنات کو وجود ملا اور ارض وسماء کی یہ محفل آراستہ ہوئی۔ تخلیق اپنے خالق کے اوصاف کا پرتو ہوتی ہے اس لئے رب اعظم کی تخلیق کے ہر ذرے میں وحدت ویکتائی کی عظمت ودیعت ہے۔ ہر وجود بے مثال اور ہر مظہر بے عدیل ہے۔ عظمتوں کی اس بوقلمونی میں انسان خصوصی شرف کا حامل اور امتیازی عظمت کا امین ہے۔ انسان تخلیق کا نقطہ کمال ہے اس لئے تمام مخلوقات میں مشرف ومحترم، کائنات اسی کے لئے تخلیق ہوئی اور اسے ہی اُس پر حکمرانی کا اعزاز عطا ہوا۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس شرف کا تذکرہ کیا۔ اور بار بار یہ باور کرایا کہ کائنات انسانی تگ وتاز کی نخچیر بننے کے لئے ہی وجود میں آئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (النحل:12)

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (ابراہیم:11)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (الحج:65)

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (لقمان:20)

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ (الجاثیہ:12)

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ:13)

اب انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ تحفظ ذات کے لئے، مقاصد تخلیق کی

تکمیل کے لئے ہر ممکن سعی کرتا ہے تاکہ موجودات کی ہماہمی میں گم ہونے کے بجائے عناصر فطرت کا حکمران اور مظاہر قدرت کا کارکشا بنے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

مہہ ومہر وانجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی انسانیت کی معراج ہے۔ آپ کے وجود اقدس میں ہر ممکن رفعت اور ہر متصور عظمت موجود ہے۔ آپ بلندیوں کا نقطہ عروج اور شرافتوں کا مظہر اتم ہیں۔ آپ ہی باعث تخلیق کائنات اور وجہ تزئین ہست وجود ہیں آپ ہی کے لئے ارشاد ہوا۔

لولاك ما خلقت الافلاك (تفسیر روح المعانی سورۃ الفتح)

اگر آپ نہ ہوتے تو میں افلاک پیدا نہ کرتا۔

حضور اکرم ﷺ جامع کمالات وحسنات ہیں آپ کے متعدد امتیازی اوصاف ہیں جن کے باعث آپ سب کے لئے وجہ افتخار بھی ہیں اور قابل تقلید اسوۂ حسنہ بھی۔ ان امتیازی اوصاف میں معجزات بھی کثیر تعداد بھی شامل ہے جو آپ کے مقام کی عظمت کے نقیب اور متلاشیان راہ ہدایت کی راست روی کے کفیل ہیں۔ معجزہ دراصل وہ وصف ہے جو فرستادۂ حق کی خصوصی حیثیت کا تعین بھی کرتا ہے اور مخاطبین کے قلوب واذہان کی تسخیر کرکے انہیں اتباع نبوت کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ یہ ایک ذریعہ ہے ہدایت پہنچانے کا اُن لوگوں تک جو غور وفکر کی عظمتوں سے زیادہ اُن غیر عادی واقعات سے مرعوب ہونا پسند کرتے ہیں جو اُن کے مادی ذہن کے لئے تجسس کا باعث ہیں، تجسس آمیز مرعوبیت تسکین قلب کا سامان پیدا کردیتی ہے۔ یہ

معجزات کا عمومی رُخ ہے مگر بعض معجزات ایسے بھی ہیں جن کا دائرہ اثر صرف مخاطبین تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ہر دور اور ہر نسل کے لئے فیض رساں ثابت ہوتے ہیں۔

معراج ایسا ہی معجزہ ہے، اس ایک معجزے کے پہلو میں کئی اور معجزات موجود ہیں بلکہ یہ مجمع المعجزات ہے۔ معراج کا ایک رُخ تو آنحضرت ﷺ کی ذات کی بے پایاں عظمت اور عدیم النظیر حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔ تو دوسرا رُخ تمام نبی نوع انسان کو بلند حوصلگی اور ارفع خیالی کی دولت عطا کر کے ابدی اور سرمدی راہنمائی مہیا کرتا ہے۔

تاریخی حیثیت سے معراج، ایک واقعہ ہے جو اکاون برس کی عمر میں رجب کی ستائیسویں رات آنحضرت ﷺ کو پیش آیا۔ حطیم کعبہ تھا یا ام ہانی رضی اللہ عنہا کا گھر، رات بھیگ چکی تھی۔ وادی بطحا پر ہو کا عالم طاری تھا۔ سب شہری خواب غفلت میں مست تھے مگر وہ وجود مقدس جس کے قدموں کی خاک سے اس عالم رنگ و بو کو زندگی کی روشنی عطا ہوئی تھی نیم خوابیدہ عالم میں تخلیق کائنات کے عقدے حل کرنے کی سعی کر رہا تھا کہ عرش کا نمائندہ فرش بوس ہوا کہ خالق ارض وسماء خاک نشینوں کو عرش آشنا دیکھنا چاہتا ہے انسان کا مقدر جاگ اٹھا۔ انسانیت کا عظیم نمائندہ بلایا گیا تا کہ انسانی وجود کی سطوت ثابت کردی جائے۔ نبی محترم ﷺ زمین کو مسخر کرتے گئے۔ بیت الحرام سے مسجد اقصیٰ تک زمینی مشاہدہ تھا، عالم مثال میں اعمال کا بناؤ بھی دیکھا اور بگاڑ بھی، مسجد اقصیٰ میں اپنے پیش رو رحمت کے نقیبوں سے ہم کلامی بھی ہوئی۔ وہ سب صف بصف تھے اور نازاں تھے کہ اُن کی خواہشیں رنگ لائی ہیں۔ قافلہ انسانیت اپنے عروج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سب نے خوش آمدید کہا، احسنت ومرحبا کے آوازے اٹھے تو سب کے دعائیں لینے والے اور آگے بڑھنے والے مرکب براق پر سوار ہوئے

وہ کہاں گئے مورخ آج تک حیرت زدہ ہے۔ آسمان کیا ہے؟ اُس کے دروازے کیسے ہیں، آسمانوں سے گزرنے کے کیا معنیٰ ہیں؟ کرۂ نار سے وجود بشر کیسے بحفاظت گزر گیا ملاقاتیں کیسے ہوئیں؟ کون کہاں کہاں تھا؟ یہ اور اس قسم کے سینکڑوں سوالات ہیں جو ہر انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں مگر ارباب تسلیم ورضا کے لئے احادیث کی کتب میں تفصیل موجود ہے۔ قرآن اپنے اجمالی وصف کے باوصف بعض تفصیلات بیان کر رہا ہے، قرآن پاک نے فہم نارسا کی نارسائی کے ازالے کے لئے سبحان الذی کا اشارہ دیا کہ اے خدائے واحد کو تسلیم کرنے والو، حی وقیوم کی قدرت پر ایمان رکھنے والو، اُس خدا کی قوت وطاقت کو اپنے معیاروں پر نہ ماپو، وہ تو ہر کمی سے مبرا اور ہر عیب سے منزہ ہے۔ وہاں ناممکن کچھ نہیں۔ اُس کا ارادہ ہو جائے تو ناممکن ممکن ہو جاتا ہے یہاں صرف ارادہ نہیں باقاعدہ اہتمام ہے۔ اس لئے کہاں بھٹکے پھر رہے ہو۔ ہو سکنے، یا نہ ہو سکنے کی لاینحل بحث کا یہ محل نہیں۔ اس کو پراگندہ حتمال سے کیا واسطہ تم تو اُس سمیع وبصیر کی سماعت وبصارت کے ترانے گاؤ جو سب کچھ دیکھتا گیا اور جس کے آگے کتاب زندگی کا ہر ورق الٹا جاتا رہا ہے۔ جس نے کارکنان قضا وقدر کے غیر مرئی اور غیر محسوس تصریف اقلام کو بھی سماعت فرمالیا۔ وہ جو تخلیق کا محور ہے وہ کہ جس کے لئے یہ عالم وجود میں لایا گیا ہے آج اپنے واسطے سے پیدا کی جانے والی ساری تخلیق کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ وہ یہ ثابت کر رہا ہے کہ اسے وجود بھی میرے سبب ملا تھا اور انسانی بقا بھی میری مرہون منت ہے۔ وہ عناصر پر اپنی حکمرانی کا اعلان کرنے اور اپنے تمام ہم جنسوں کو یہ سبق دینے آیا کہ تمہارے اور خالق کے درمیان سب پردے تمہاری غفلت کے پروئے ہیں۔ تم نائب حق خلیفہ اللہ ہو۔ اپنے منصب کو پہنچانو۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است

برعناصر حکمران بودن خوش است

تمہارا یہ مقام نہیں کہ عناصر کی بھول بھلیاں میں گم ہو جاؤ۔ تمہیں تو ذات حق سے ایک گونہ نسبت ہے یاد رکھو۔

بر مقام خود رسیدن زندگی است

ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

مرد مومن در نساد با صفات

مصطفیٰ راضی نشد اِلّا بذات

سورۂ بنی اسرائیل شروع ہوتی ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا

رات کے ایک حصے میں اس فلک سمائی کا مقصد لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا تھا یعنی تاکہ ہم آپ کو اپنی نشانیاں دکھا دیں۔ اپنی قدرت کے مختلف مظاہر مشاہدہ کرا دیں۔ یہ شرفِ خاص آپ ہی کا حصہ تھا کسی اور کے مقدر اتنے کہاں تھے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ تو آپ کی صلاحیت کا اظہار اور آپ کے مشاہدے کی قوت کا اعلان تھا۔ کیوں کہ آپ سمیع وبصیر تھے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ضمیر کا مرجع ذات حضور ﷺ قرار دیا ہے۔ کہ آپ دیکھنے کی قوت اور سماعت کی سکت رکھتے تھے اس لیے یہ سب کچھ دکھا دیا گیا اس میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ انعام خداوندی یونہی نہیں تھا اس کے مصداق بننے کے لئے صلاحیت درکار ہوتی ہے اور حق حق دار ہی کو دیا جاتا ہے۔

سورۂ نجم کی متعدد آیات میں واقعہ معراج کے مختلف پہلوؤں کا ذکر

کیا گیا۔ ارشاد ہوا ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی (النجم:2)

تمہارا ساتھی نہ بھٹکا نہ بہکا، صاحبکم میں جو بنی نوح انسان کے لئے امید افزا پیغام ہے اُسے صاحب دل ہی محسوس کرتے ہیں۔ یہ سیر کائنات اس لئے ممکن ہوئی کہ سیاح لامکاں مضبوط اعصاب کا مالک اور پختہ نظریات کا حامل تھا کہ کہیں بھی راہ راست سے بھٹکا نہ بہکا بلکہ حواس اسقدر مضبوط تھے کہ

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (النجم:17)

یعنی مشاہدے کے دوران میں نہ آنکھ لرزی نہ جھپکی، قوت نبوت حواس کو توانائیاں عطا کر رہی تھی۔

نبی محترم ﷺ کی قوت مشاہدہ اس قدر تھی کہ قرآن گواہی دیتا ہے۔

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴿(النجم:18)

کہ شک نہ کرو حرف تاکید داخل کیا کہ بے شک اُس وجود محترم نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھ لیں، قلب مضطرب کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا۔

اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی (النجم:21)

کیا تم اب بھی اُن کے مشاہدے پر شک کرتے جا رہے ہو۔ یاد رکھو دیکھنے والے نے تو اس قدر اعتماد سے دیکھا تھا کہ

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿(النجم:11)

کہ آپ کے دل میں ذرہ برابر بھی شک نہ تھا۔ اُن کا قلب بیدار اس مشاہدہ کا مصدّق تھا یہ اُس دل کی تصدیق تھی جو ہمہ بیدار اور ہمہ باخبر تھا حدیث شریف میں آیا ہے۔

تَنَامُ عینَیَّ ولا ینامُ قلبِی (صحیح البخاری حدیث نمبر 3569)

میری آنکھیں تو کبھی سو جاتی تھیں دل کبھی غافل نہیں سوتا۔

معراج آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ کا وہ پر شکوہ واقعہ ہے کہ سیرت نگار اور محدثین نے اس کی تفصیلات کے بیان میں شب و روز عرق ریزی کی ہے۔ پچیس کے قریب ایسے جلیل القدر صحابہ ہیں جنہوں نے نہات شرح و بسط کے ساتھ اس واقعہ کی جزئیات بتائیں ہیں۔ احادیث کی کتابوں میں اس پر مستقل ایواب باندھے گئے ہیں اور بعض بزرگوں نے تو پوری پوری کتابیں اس موضوع پر مرتب کر دی ہیں۔

معراج آنحضرت ﷺ کا ایک معجزہ ہے اور انسانیت کے لئے ایک پیغام بھی کہ انسانیت کا قافلہ انہیں روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جائے وہ گردش لیل و نہار کے طلسم کو توڑ کر نئے زمان و مکان کی تلاش میں کوشاں رہے اور پوری کائنات پر اپنی عظمت یا نشان بشت کرے۔

معراج کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہکار تخلیق اور خالق کے درمیاں جب حجاباتِ اٹھے تو خالق ارض و سماء نے بکمال شفقت ایک تحفہ بھی عطا فرمایا، معراج کی برکات تحفہ نماز ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ آخر اس قدر عروج و ارتقاء کے بعد نماز کا حکم کیوں دیا گیا، نماز اور معراج، میں آخر نسبت کیا ہے یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے جب اس حدیث پر نظر پڑتی ہے کہ صاحب معراج ﷺ فرماتے ہیں "الصلوۃ معراج المومنین" (تفسیر المظہری سورۃ النور) نماز مومنوں کی معراج ہے۔ معراج کیا ہے، حجابات کا اٹھ جانا ہے، دوئی کے پردوں کا چھٹ جانا ہے اور مخلوق کا خالق سے ہم کلام ہونا ہے کیا یہ

سب کچھ نماز میں نہیں۔ حدیثِ جبرئیل علیہ السلام کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے یعنی عمل کا حسن کیا ہے فرمایا یوں اللہ کی عبادت کرو جیسے تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو یہ ضرور خیال رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ نمازی، یوں نماز ادا کرے کہ وہ خالق کائنات کو دیکھ رہا ہے۔ یہی تو معراج کا ماحصل ہے۔ اور اگر ابھی اپنے آپ کو اس مقام کا اہل نہ پاتا ہو تو یہ ضرور خیال رکھے کہ وہ خود اپنے معبود کی نظروں میں ہے یہ تصور معراج ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی حدیث نبوی ﷺ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ قرب الٰہی کا سب سے بہتر مقام سجدہ کی حالت ہے۔ نمازی جب سجدہ میں ہوتا ہے تو وہ اپنے معبود کے قریب تر ہوتا ہے۔ اور قرب ہی تو معراج کی جان ہے۔

الغرض معراج عظمت مصطفیٰ ﷺ کی دلیل قاطع اور تسخیر کائنات کے لئے واضح اشاریہ ہے۔ کائنات آپ کے لئے تخلیق ہوئی اور آپ کے لئے مسخر کی گئی۔ حضور ﷺ انسانیت کے نمائندہ کی حیثیت سے صاحب لولاک بھی ہیں اور صاحب معراج بھی۔ ہمیں آپ کی اتباع میں قرب کے نقش قدم کے سہارے آپ کی ذات تک پہنچنے کی ہر ممکن سعی کرنا چاہیے کیونکہ ہماری معراج اُن کے در کی گدائی میں ہی مضمر ہے۔

تیری معراج کہ ہے عرش تیرے زیر قدم

میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

''سنتِ رسول ﷺ کی اہمیت''

سنۃ کا لغوی معنی طریقہ، انداز، راستہ یا سیرت ہے، کسی خاص طریقے سے کوئی کام انجام دینا، کوئی مخصوص انداز اپنانا یا کسی راستے پر مستقل گامزن رہنا سنت کہلاتا ہے جب بھی کوئی طریقہ عمل یا اندازِ عمل مستقل ہو جائے، شخصیت کا حصہ بنے اور سیرت کا جزو قرار پائے تو اُسے سنت کہا جائے گا سنت زندگی کے عمومی رخ اور مستقل جھکاؤ کو ظاہر کرتی ہے۔ دینی اصطلاح میں سنت سے مراد وہ اندازِ زیست یا طریقہ زندگی ہے جو رسول اکرم ﷺ کی سیرت سے نمایاں ہوتا ہے۔ فقہی یا قانونی زبان میں سنت آنحضرت ﷺ کے اعمال وافعال کا نام ہے۔ علامہ محب اللہ بہاری مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں کہ سنت سے مراد ''مَاصَدَرَ عَنِ النبی ﷺ مِن غیرِ القرانِ من قَوْلٍ اَوفِعْلٍ اَوتَقْرِیرٍ'' قرآن کے علاوہ آنحضرت ﷺ سے جو بھی احکامات صادر ہوں خواہ وہ قولی ہوں یا فعلی یا تقریری سنت کہلاتے ہیں۔ عام الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنت رسول اللہ ﷺ کے ارشادات وافعال کا نام ہے۔ اس میں نہ وقت کی قید ہے اور نہ ارشادات واعمال کی کوئی متعین حیثیت مراد ہے۔ بلکہ آپ کی پوری زندگی کا ہر عمل اور ہر حکم حتکہ ہر اشارہ سنت میں شامل ہے۔

اسلام ایک دین ہے، اس کی تعلیمات زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہیں۔ تعلیمات کی جامعیت اور ہمہ گیریت اسلام کا دعویٰ بھی ہے اور ہر متبع مسلمان کا ایمان

بھی، انسان اپنی حیات کے ہر موڑ پر ان تعلیمات وارشادات سے راہنمائی حاصل کا مکلف ہے۔ اس ہمہ جہتی حیثیت کا تقاضا تھا کہ راہنمائی کے اصول واضح، مکمل اور قابلِ تقلید ہوں اور اُن تک رسائی انسانی استطاعت میں ہو چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسلام نے پوری انسانی زندگی کے لئے نہایت واضح، انمٹ اور قابلِ عمل اصول دیئے۔

قرآن اسلامی تعلیمات کا امین ہے، یہ غیر متبدل، مربوط، منضبط اور کامل صحیفہ ہدایت ہے۔ اس کا ہر لفظ الہامی اور اس کا ہر حکم واجب الاتباع ہے، قرآن خالقِ کائنات کے احکامات کا سرچشمہ ہے یہ تعلیمات اسلامی کا بنیادی ماخذ اور انسانی زندگی کے لئے انمٹ ضابطہ حیات ہے۔

قرآن اگرچہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے ارشاد ہوا مگر یہ فرمودہ پروردگار ہے، مولانا روم نے خوب کہا کہ

گرچہ قران از لب پیغمبر است
ہر کہ گوید حق نہ گفت او کافر است

یعنی قرآن اگرچہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے ادا ہوا مگر جو اسے کلامِ الٰہی تسلیم نہ کرے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی حامل قرآن بھی ہے اور شارحِ قرآن بھی، آپ کا ہر ارشاد قرآن کی تفسیر اور آپ کا ہر عمل احکاماتِ الٰہیہ کی عملی تعبیر ہے۔ آپ مطاع باذنِ اللہ ہیں اور تعلیمات قرآن کا عملی حوالہ بھی، یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر وقت پروانہ وار آپ کے گرد جمع رہتے تاکہ کسی حکم کی پیغمبرانہ توضیح سے محروم نہ رہ جائیں۔ آپ کے فرمودات سے اس تعلق ہی نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ان کی حفاظت کی راہ دکھائی تاکہ کلامِ

محبوب اور قرآن کی عملی تفسیر آئندہ نسلوں کو منتقل ہو جائے۔

کہا جاتا ہے کہ ''سنت'' اسلامی تعلیمات کا دوسرا ماخذ ہے، قرآن کے بعد اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بحث بھی ایک الجھاؤ ہے قرآن وسنت میں ترتیب کا کوئی مسئلہ نہیں یہاں تو متن اور شرح کا رشتہ ہے۔ قرآن متن ہے اور سنتِ رسول ﷺ اس کا عملی اظہار، قرآن کے مفاہیم جو رسول اللہ ﷺ کے کردار سے نمایاں ہوئے وہی معتبر ہیں، قدرت نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے ایک بنیادی نصاب یا ضابطہ نازل فرمایا جسے حضور اکرم ﷺ نے اپنے اسوہ کی عملی تعبیر سے اُسے واضح فرمایا۔ خالقِ کائنات نے اپنی کتاب مرحمت فرما کر بے محابانہ چھوڑ دیا کہ ہر کوئی اپنے خیالات کو قرآن کے حوالے سے بیان کر کے دل پسند حرکات کا مرتکب بنے اور معاشرے میں خیالات کی طوائف الملوکی جنم لے بلکہ احکامات کا عملی اظہار بھی فرمایا اور قرآن کو ایک ذات پر مکمل منطبق فرما کر قرآنی مفاہیم کی عملی تفسیر مہیا فرما دی، قرآن احکامات کا مجموعہ ہے تو سنتِ رسول ﷺ ان احکامات پر عمل پیرا ہونے کا مثالی نمونہ، ارشادات کا متن درکار ہو تو قرآن دیکھئے اور اس متن کو قالبِ انسانی میں متشکل ہوتا دیکھنا مقصود ہو تو ذات رسول ﷺ سے راہنمائی لیجئے، یہ دونوں ایک حقیقت کے دو روپ ہیں لفظوں سے محبت ہو تو قرآنِ صامت موجود اور اگر ان الفاظ کی مراد تک پہنچنا ہو تو صاحب قرآن کی ذات موجود، الغرض قرآن وسنت یک جان دو قالب ہیں، ایک کا انکار دوسرے سے انحراف کا سبب بنتا ہے۔ ان میں تضاد نہیں، تضاد تو ہمارے ذہنوں کا عکس ہے، مسند داری میں ہے کہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ لوگوں کو ایک حدیث سنائی تو سامعین میں سے کسی نے

کہا کہ کتاب اللہ یعنی قرآن میں اس کے برعکس حکم موجود ہے۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہ کرو میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی بات سناؤں اور تم کتاب اللہ کے نام سے اعتراض پیدا کرو، یاد رکھو رسول اللہ ﷺ تم سے زیادہ کتاب اللہ کے عالم تھے۔

(سنن دارمی باب نمبر 50 ص 128)

سنتِ رسول ﷺ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے قرآن ارشاد فرماتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء:64)

کہ ہم نے رسول معظم ﷺ کو مبعوث ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے مطاع بنے یعنی سب اُن کی اطاعت کریں۔ پھر فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:64)

کہ رسول اللہ ﷺ تمہارے لئے بہترین نمونہ ہیں، اس لئے انسانیت کی معراج اُن کے اتباع اور اُن کی اطاعت میں ہے۔ یہ آیات بیانیہ جملوں کی صورت میں نازل ہوئیں تا کہ حکم کی شدت اور عموم کا اظہار ہو جائے۔ لیکن کبھی حکماً ارشاد فرمایا۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

(الحشر:7)

یعنی رسول اللہ ﷺ تمہیں جو کچھ عطا فرمائیں اُسے لے لو اور جس چیز سے روکیں رُک جاؤ، یعنی تمہاری زندگی میں اُخذ وترک کا معیار آپ کے احکامات ہونے چاہئیں۔ یاد رہے کہ یہاں ''ما'' موصولہ ہے جس کے متعلق علماء لغت کہتے ہیں کہ عموم پر دلالت کرتا ہے یعنی جو بھی عطا کریں لے لو اور جو بھی چھوڑنے کا ارشاد فرمائیں چھوڑ دو، اس میں اپنی پسند وناپسند کو دخل نہ دو، بہر حال اطاعت کرو۔ اس سے یہ غلط فہمی دور

ہو جاتی ہے کہ شاید اطاعت و اتباع چند دینی احکام تک محدود ہے اور باقی معاملات ہماری صواب دید پر ہیں۔ قرآن مجید کی اس نص صریح نے اس واہمہ کو کاٹ ڈالا، یہ بھی یاد رہے کہ "حکم" کسی زمانی قید کے حوالے سے نازل نہیں ہو رہا کہ آنحضرت ﷺ کی حیاتِ ظاہرہ تک تو احکام مانو مگر آپ کے پردہ فرمانے کے بعد حالات کے مطابق خود فیصلے کر لیا کرو۔ نہیں نہیں یہ حکم قیامت تک کے لئے، ہر شخص کے لئے، ہر دور کے لئے، اور ہر معاملے میں حجت ہے اور واجب الاتباع۔

قرآن مجید اس اتباع کو مجبوری کا معاملہ نہیں بنانا چاہتا بلکہ اس میں دلی رضا اور قلبی انبساط کا تقاضا کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء:65)

"یعنی آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ اُس وقت تک مومن نہیں جب تک آپ کو اپنے تنازعات میں حکم تسلیم نہ کر لیں اور پھر آپ کے فیصلے پر دلوں میں بھی کوئی الجھن محسوس نہ کریں بلکہ یوں تسلیم کریں جیسا کہ تسلیم کرنے کا حق ہے۔" ایسا اس لئے ہونا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ خود تو احکامات نافذ نہیں فرماتے وہ تو فرستادہ ہیں رب العزت کے، اس لئے اُن کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم:3)

یعنی حضور اکرم ﷺ اپنی خواہشات سے کلام نہیں فرماتے بلکہ آپ کے ارشادات تو نتیجہ ہیں وحی الٰہی کا۔ اسی بنا پر علماء فرماتے ہیں۔ کہ حدیث بھی وحی ہے۔ اگرچہ اس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ یہاں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ وحی کے

اَحکامات تو مانا کہ حجت ہیں لیکن کیا آپ کی عمومی گفتگو بھی اسی مرتبہ اور مقام کی حامل ہے۔ یہ الجھن اُس وقت بھی پیدا ہوئی جبکہ آپ کا ارشاد ہوا۔

حَدِّثُوا عَنِّي وَلَا حَرَجَ (مشکوٰۃ کتاب العلم)

"یعنی مجھ سے روایت کیا کرو اس میں کوئی خطرہ نہیں"۔ حکم ملنا تھا کہ اسوۂ حسنہ کا ہر پہلو اور آپ کی مثالی زندگی کا ہر لمحہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہونے لگا، تحریر پر قدرت رکھنے والے صحابہ اس میدان میں سبقت لے گئے اور اپنے اپنے مجموعے مرتب کرنے لگے مگر بعض کے دلوں میں خیال پیدا ہوا کہ کیا ہر ہر حکم محفوظ کر لینا مناسب بھی ہے۔ اس کا اظہار جلد سامنے آیا جب قریش کی ایک جماعت نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی کتابتِ حدیث پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کبھی حالت غضب میں ہوتے ہیں تو کبھی حالت رضا میں اور آپ ہر بات لکھتے جا رہے ہیں چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے لکھنا ترک کر دیا مگر اس کا ذکر دربارِ رسالت میں بھی کر دیا حضور اکرم ﷺ نے اپنے دہن مبارک کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

اُكْتُبْ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ مَا يَخْرُجُ مِنِّي اِلَّا الْحَقُّ (سنن ابی داؤد کتاب العلم)

کہ تم لکھ لیا کرو اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس منہ سے جو کچھ بھی نکلتا ہے حق ہوتا ہے۔

اس ارشاد نے تمام اشکال دور کر دیئے۔ الغرض حضور اکرم ﷺ کا ہر ارشاد لائق توجہ اور قابلِ تقلید ہے اسی میں کامیاب زندگی کا راز مضمر ہے۔ اللہ کرے ہم سب سنت رسول ﷺ کی قدر و منزلت پہچانیں، اس پر عمل پیرا ہونے کی مقدور بھر کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے آمین۔

سورۃ الاحزاب کی روشنی میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں مسئولیت کی ذمہ داری کا شرف انسان کو عطا کیا کہ اس کے اقوال واعمال کو ہی پابند آداب نہیں بنایا بلکہ نظریات واحساسات کو بھی حدود آشنا رکھنے کا فیصلہ فرمایا، تخلیق کے مراحل پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ نیابت کا فریضہ انسان کے لئے خاص کیا گیا ہے اس لئے امرونہی کی حدود کا تعین اور ان کی پاسداری کا عملی مظاہرہ، منصب کے عملی اجراء سے بھی پہلے کیا گیا، انسان کا فی الارض خلیفہ ہونا اس کی تخلیق سے واضح تھا، منصب بڑا تھا اس لئے ممکنہ ناتمامی کی صورت کا ایک ناصحانہ مظاہرہ ابتداء ہی میں ہوگیا، اس سے کچھ اساسی روّیے طے ہوگئے مثلاً

* واضح ہوگیا کہ مخلوق کو ہر حال اور ہر صورت راہنمائی درکار ہے۔
* یقین ہوگیا کہ اعتراف عجز کامرانیوں کا وسیلہ ہے۔
* معلوم ہوگیا کہ حیات مستعار کی سرفرازی، شیطان کی دسیسہ کاریوں سے مجتنب اور متنبہ رہنے میں ہی مضمر ہے۔
* آگہی حاصل ہوئی کہ طلب مغفرت کی روش ہی محفوظ زادسفر ہے۔
* سب سے بڑھ کر یہ اعتماد حاصل ہوا کہ کوئی لمحہ بھی بے توفیق نہیں، شرط صرف یہ ہے کہ غرورِ نفس کا خمار ہویدا نہ ہو۔

انسانِ اوّل، تعلیمات کے اس عملی مظاہرے کے حصار میں سرزمین پر

جلوہ نما ہوا، اگرچہ یہ ابتدائی تجربہ بہت بڑا رہنما تھا مگر پھر بھی رحمتِ خالق ہر لمحہ میسر رہی، یہ سوال بڑی بنیادی نوعیت کا ہے کہ مقصود کیا تھا؟ ایک اطاعت شعار انسان یا ایک مربوط ومکمل ضابطہ حیات، بعض اوقات فرامین کو ہی مطلوب سمجھا جاتا ہے اور انسان ان فرامین پر عمل کرنے کا مکلف قرار دیا جاتا ہے باالفاظ دیگر کہا جاتا ہے کہ کتاب ہدایت کا نزول مطلوب تھا، اس کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو ذریعہ بنایا گیا مگر تخلیقِ عمل کی ترتیب واضح کرتی ہے کہ مطلوب وجود تھا، اس وجود کی برقراری کے لئے پیغام ارسال کیا گیا، اس لئے اہل علم وحکمت کا کہنا ہے کہ

نزل القرآن لِتأئیدِ رسالتہ

یعنی قرآن مجید، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا تائید کنندہ بن کر نازل ہوا۔

یعنی مقصودِ تخلیق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تھی، قرآن مجید آپ کی رسالت کے لئے صحیفہ ہدایت بن کر آیا، اس حوالے سے خود قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو ہر ہر آیت سے اس دعویٰ کی صداقت نمودار ہوتی ہے، اسی کو بعض نے یہ کہہ دیا کہ قرآن مجید ہمہ در مدح رسالت ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اوچ شریف کے سرخیل کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ایک تفسیر قرآن کا حوالہ دیا اور حیرت آمیز تعجب سے ذکر کیا کہ اس نکتہ رس مفسر نے ہر ہر آیت سے مدح رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استخراج کیا ہے، یہ استخراج اس لحاظ سے مبنی بر حقیقت ہے کہ معجزہ ہر پہلو سے صاحب معجزہ کی عظمت ورفعت کا ہی حوالہ ہوتا ہے، اگر معجزہ سے صاحب معجزہ کی سرفرازی کا اظہار نہ ہو تو وہ معجزہ صدق رسالت کی دلیل کیسے قرار پائے گا، معجزہ کا اظہار تو ہوتا ہی اس لئے ہے کہ نبی یا رسول کی برتری ثابت ہوجائے تاکہ ایمان بالرسالت کا ذوق فروزاں ہو،

قرآن مجید نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا وہ معجزہ ہے جو ہمیشہ قائم رہے گا اس لئے اس کا حرف حرف، منزلتِ نبوت اور رفعتِ شان رسول ﷺ کا ہر دور میں اور ہر مقام پر شاہد عادل رہے گا، طالب حق جب بھی کسی آیت، کسی سورت یا کسی جزو پر غور کرے گا، شمائل وفضائل رسالت کا اک جہان پائے گا، یہ غور وفکر کا سلسلہ طویل بھی ہے اور محنت طلب بھی، ہم اس سیر دوام سے صرف ایک سورت کو موضوع گفتگو بنا رہے ہیں یہ بھی واضح رہے کہ یہ مطالعہ بھی بے حد طویل ہے اس لئے ہم صرف چند اشارات پر اکتفا کریں گے تا کہ اندازہ ہوجائے کہ مدح سرائی اور صفات شماری کے مراحل کس قدر تہہ در تہہ ہیں۔

سورہ الاحزاب مدنی سورت ہے کہ پانچ ہجری کے دورانیہ میں نازل ہوئی، یہ سال نبوی حیات میں سے متعدد واقعات، حادثات اور احوال کا امین ہے، غزوہ الاحزاب جسے غزوہ خندق بھی کہا جاتا ہے، کفر کی مجموعی طاقت سے نبرد آزمائی کا معرکہ ہے، جنگ اُحد کے بعد یہ اہم ترین غزوہ بھی ہے اور فیصلہ کن معرکہ بھی اس کے لئے تین سال کی محنت کی گئی تھی، قبائل عرب کو عربی تمدن کے احیاء کا واسطہ دیا گیا یہود جو مخاصمت کی زہرناکی سے باولے ہو رہے تھے، وہ اس کے سب سے بڑے محرّک تھے، کفر کی ساری قوتیں یکجا ہوگئی تھیں اور جنگی حکمت عملی کی بھرپور صلاحیت کو بروئے کار لایا گیا تھا، بظاہر یہ چوبائی جنگ تھی مگر ریاست مدینہ کی حفاظت اور ثبوت حق کی ترسیخ کے لئے بھی باخبری موجود تھی، یہ سورہ مبارکہ میں اسی غزوہ کا تفصیلی ذکر ہے بلکہ اس کے متعلقات ہی مرکزی مضمون ہیں حتکہ سورۃ کا نام الاحزاب بھی اسی مرکزیت کے اعلان کے طور پر ہے، یہ ظاہر میں ایک جنگ ہے جو سابقہ جنگوں سے

زیادہ گھمبیر شکل میں ہے اس لئے مسلمانوں کو اس کے لئے مضبوط دفاعی حکمت عملی بھی تیار کرنا ہے اور سب سے بڑھ کر وحدت کا ثبوت بھی دینا ہے، وحدت کا سب سے بڑا اظہار سپہ سالار پر اعتماد سے ہی ہوا کرتا ہے اس لئے اس سورت میں مقام نبوت کی اہمیت، اطاعت اور اتباع کی ضرورت اور بہر طور تسلیم ورضا کی عادت کا ذکر نمایاں رہا۔

سورۃ الاحزاب میں حربی وسائل واستعداد اور اطاعت رسالت کی ضرورت کے ذکر کے ساتھ چند ایسے واقعات کا بھی ذکر ہے جو ثابت کر رہے ہیں کہ اطاعت واتباع صرف ہنگامی حالات کا تقاضا ہی نہیں، یہ تو اہل ایمان کی زندگی بھر کی روش ہونی چاہیے، معاشرتی ضابطے خواہ کس قدر ہمہ گیر بھی ہوں وہ اسی وقت لائق التفات اور قابل تقلید ہوتے ہیں جب ان کو نبوی سند حاصل ہو، رواج ٹوٹنے کا مرحلہ قوموں کی زندگی میں شدید تر ہوتا ہے، تاریخ گواہ ہے کہ قوموں نے بسا اوقات خالق کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کیا کہ یہ تسلیم آباؤ اجداد کے طریقوں سے متصادم تھی، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی حضرت زید رضی اللہ عنہ سے شادی ایک معاشرتی بت توڑنے کے مترادف تھی، خاندانی عظمت کا خمار تو اکثر قوموں میں رہا ہے مگر عرب جن کی زندگی کی ساری تگ ودو وقار قومی کے گرد گھومتی تھی، اس خمار میں اس قدر مبتلا تھے کہ اس کے خلاف کسی حکم یا نصیحت کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے، یہاں تو خاندان بھی قریش کا تھا اور اسے ایک غلام سے جوڑا جا رہا تھا، عمومی انسانی روّیہ اس صورت کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا اس لئے انکار کے جذبوں نے مچلنا بھی چاہا، ایک آزاد، باوقار اور سربلند قبیلے کی ایک عفت مآب خاتون کے جذبے بھی بیدار تھے، یقینا یہ جذبوں کی جنگ تھی جو شاید فخر ومباہات کے سایوں میں پلنے والی خاتون کے لئے میدان جنگ میں کود جانے سے بھی زیادہ مشکل تھی اگر

الاحزاب کا غزوہ ساری ملت کفر کے خلاف نبرد آزمائی تھا تو انانیت کے خلاف بھی ہمہ جہتی ستیزہ کاری تھی، واضح کردیا گیا کہ میدانِ جنگ میں بھی نبی اکرم ﷺ کا فیصلہ لائق تعظیم ہے اور خواہشات کے کارساز میں بھی آپ ہی کا حکم لائق اطاعت ہے کس قوت سے ارشادت نبوی ﷺ کی بالادستی ثابت کردی گئی۔

تسلیم ورضا کے اُس جلو میں احکام کی جلالت کا ایک اور مظہر سامنے آیا، منہ بولے بیٹوں کو جاہلی معاشرے میں حقیقی اولاد کے حقوق حاصل تھے، یہ تو حسن معاشرت ہے کہ کسی بے سہارا یتیم کو سرپرستی کا تحفظ مہیا کردیا جائے مگر یہ جذبہ حقوق انسانی کی پاسداری سے متصادم ہو تو خیر سے زیادہ شر کی ترویج کا ذریعہ بنتا ہے، اس لئے ہمدردانہ روش کو خالق کے عطا کردہ حقوق سے ٹکرانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، عرب کے معاشرے میں یہ روش قانون بن چکی تھی جس کا توڑ ضروری ہوگیا تھا، حکم بھی دیا جاسکتا تھا مگر الفاظ کس قدر بھی اثر آفریں ہوں پختہ مزاج میں ہنگام پیدا نہیں کرتے اس کے لئے عملی اقدام ناگزیر ہوتا ہے، نبی اکرم ﷺ نے پہلے قدم پر نسل انسانی میں برتری اور کہتری کا نافذ جاہلانہ نظام روکا تو دوسرے قدم کے طور پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کرکے متبنیٰ کی رائج حیثیت کو بے وقار کردیا، یہ ایسا فیصلہ تھا جس پر انگلیاں اٹھ سکتی تھیں اس لئے یہ فیصلہ نبوی جلال کا تقاضا کرتا تھا، رسول عالمین ﷺ نے یہ فیصلہ کرکے ایک رسم جو قوت فیصلہ کی منتظر تھی ہمیشہ کے لئے ختم کردی، ایک خوشگوار حیرت اس پر ہے کہ اس سارے واقعہ کو قرآن مجید کا متن بنایا گیا بلکہ یہاں تک فرمایا گیا "زَوَّجْنٰکَهَا" کہ ہم نے آپ کا اس سے یعنی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کردیا یہ آیت کا حصہ پوری عظمت وجلالت سے اعلان کررہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اگرچہ

کوئی معاشرتی عمل ہو اُس کو خالقِ کائنات کی رضا حاصل ہوتی ہے اس سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہوگیا کہ آپ کے وہی ارشادات لائق محبت ہیں جو دین کے احکام کے حوالے سے ہوں۔ واضح کردیا گیا کہ معاشرتی اعمال وہ نکاح وطلاق کی صورت میں بھی ہوں حصار الہام میں ہوتے ہیں اور لائق احترام اور قابلِ حجت ہوتے ہیں۔

ظِہار کا مسئلہ بھی سورۃ کے موضوعات میں شامل ہے کہ یہ بھی زبان کی بے اعتدالی کا ایک شاخسانہ ہے جو ایک معاشرتی مسئلہ بن گیا تھا، اس سے گھرانوں میں ہیجان بھی جنم لے رہا تھا اور غیر شعوری طور پر ہی سی ماں کی عظمت وحرمت بھی پامال ہورہی تھی، اس الجھے ہوئے خاندانی مسئلہ کو بھی واضح حکم کے تحت ہمیشہ کے لئے سلیقہ مندی عطا کردی گئی۔

ان مسائل کے ذکر میں منصبِ رسالت کی عظمت کا بار بار حوالہ دیا گیا، نبوی فیصلوں کو ہر حال واجب تسلیم قرار دیا گیا بلکہ انسانی اختیار کو ان حوالوں میں کسی صورت حکم نہیں مانا گیا، احکام کی تعمیل کا احساس اس شدت سے دلایا گیا کہ انحراف کرنے والوں کو سزا کا مستحق سمجھا گیا، بہتر ہوگا کہ اس مرحلے پر چند آیات کا ذکر کردیا جائے جن میں مقامِ رسالت کا واضح بیان ہے اور صفاتِ رسالت کی وضاحت کی گئی ہے، یہ آیات تفصیلی گفتگو کی متقاضی ہیں کہ ان سے ایمان وتسلیم کے کئی ضابطے ترتیب پاتے ہیں مگر ہم صرف چند اشارات پر اکتفا کریں گے تاکہ ہدایت کشید کرنے والوں کو سہولت رہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ

(الاحزاب 6)

"نبی اکرم ﷺ مومنوں کے قریب ہیں اُن کی جانوں سے اور آپ کی

ازواج اُن کی مائیں ہیں"۔

مبنی پر ال جو معرفت اور اختصاص کے لئے ہے سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں۔

نبی اکرم ﷺ مومنوں سے اُن کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہیں، ظاہر ہے انسان کے قریب تر اُس کی جان ہوتی ہے، ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ مومن اپنے نبی ﷺ کو اپنے وجود سے زیادہ قریب سمجھیں کہ ایمان ہو تو ایمان کی جان اور ایمان کا مقصود ہی قریب ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ نبی کا قرب، وجودِ ایمان کا ثبوت ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ نبی کو قریب ہونا چاہیے یا اصحاب ایمان کو یہ قرب محسوس کرنا چاہیے بلکہ اصل یہ ہے کہ حقیقتاً یہ قرب موجود ہے اس سے ثابت ہو کہ یہ قرب ایمان کا تحفظ ثابت کرے گا یہ نہ ہوگا تو ایمان بھی نہ ہوگا، پھر اس پر مستزاد یہ کہ نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن مومنوں کی مائیں ہیں ماں کی طرح لائق احترام نہیں حقیقی مائیں ہیں اس لئے تو فرمایا۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ (الاحزاب:53)

"اور تمہارے لئے زیبا نہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کو اذیت دو اور نہ یہ کہ تم اُن کے بعد اُن کی ازواج سے کبھی نکاح کرو"

رسول ﷺ کو کسی قسم کی اذیت پہنچانا جرم قرار دیا گیا، اذیت زبان سے ہو عمل سے ہو یا کسی روّیے سے ہو اس عمومی حکم کے بعد واضح کر دیا گیا کہ ازواج مطہرات سے رسول ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی نکاح جائز نہیں اس لئے کہ وہ سب حقیقی ماؤں کے حکم میں ہیں اور ماں، ماں ہی رہتی ہے اگر چہ اس کا شوہر نہ ہو، اور

یہ بھی ایک ایذاء اور اذیت ہے اس لئے اس کی اجازت نہیں ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿40﴾ (الاحزاب:40)

"اور محمد (ﷺ) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور تمام انبیاء کرام کے خاتم ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے"۔

رسول معظم ﷺ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، اس سے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی ابنیت کی نفی ہوگئی ہاں ایک خیال ضرور پیدا ہوا کہ جو شفقت و محبت آپ ﷺ فرماتے رہے تھے وہ تو باپ کی شفقت سے بھی بڑھ کر تھی اسی لئے تو جب حضرت زید رضی اللہ عنہ کے حقیقی والد تلاش کرتے کرتے آ گئے تھے تو آپ نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا، عملاً یہ ثابت ہو گیا تھا کہ آپ ﷺ کی شفقت باپ سے بڑھ کر تھی سوال یہ تھا کہ باپ نہیں ہیں تو پدرانہ شفقت کا یہ اعلیٰ نمونہ کیسے ظہور پذیر رہا جواب یہ تھا کہ یہ محبت باپ کی نہیں تھی نبوت کی تھی اور اس نبی ﷺ کی تھی جو نبی ہی نہیں آخری نبی ہیں آپ کے بعد رسالت و نبوت کا سلسلہ ہدایت مکمل ہوا کہ ہدایت تمام ہوئی، انعام پورا ہوا اور کامرانی و شادمانی کا اک مستقل حصار قائم ہوا۔

ختم نبوت، عقیدہ رسالت کا جزو لاینفک ہے کہ اس کے بغیر رسالت پر ایمان متحقق ہی نہیں ہوتا قرآن مجید کے ارشادات اور خود نبی اکرم ﷺ کے فرمودات اس یقین پر شاہد ہیں اس لئے کہ کسی اور پیغمبر کے آنے کا وہم بھی رسول عالمین ﷺ کی ہمہ گیر حیثیت پر الزام ہے عہد رسالت کے فوراً بعد بعض طالع آزما اس عظمت میں شراکت کا باطل خیال پالنے لگے مگر امت اسلامیہ کی مجموعی

قوت اس عقیدہ پر اس قدر مستحکم یقین رکھتی تھی کہ ایسے دعویداروں کو ایک لمحہ بھی برداشت نہ کرسکی ہر دور میں حماقتوں کے پیکر اس منصب بلند کی خواہش کرتے آرہے ہیں عصر حاضر بھی ایک ایسے فتنہ سے مضطرب رہا ہے دشمنان اسلام کی انگیخت ایسے کذّاب کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے مگر حقیقت یہی رہی کہ

تجھ سے پہلوں کا جو عالم تھا ہزاروں کا سی
اب سے تا حشر جو فردا ہے وہ تنہا تیرا

دعویٰ نبوت کا کھڑاک امّت مسلمہ میں افتراق پیدا کرنے کی کوشش ہے، یہ اتحاد ویگانگت میں رخنہ اندازی کی فتنہ طرازی ہے اور یہ اس قلب اطہر کو دُکھ دینے کی سازش بھی ہے جو بے مثل بھی ہے اور نورِ ایمان کا واحد مرکز بھی، صبیح رحمانی نے سچ کہا تھا۔

کسی وہم نے صدا دی کوئی آپ کا مماثل
تو یقین پکار اُٹھا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

یہ فریب خوردہ لوگ، یہ شیطانی وسوسوں سے بہکے ہوئے دعویدار نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان کس قدر شدید ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٥٧﴾ (الاحزاب 57)

بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کو ایذاء دیتے ہیں اُن پر دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے رسوا کن عذاب تیار کررکھا ہے''

دنیا اور آخرت میں رحمت الٰہی سے محرومی عذاب کا ہی پیش خیمہ ہے اور یہ

خمیازہ ہے اُس روّیے کا جو بدباطن لوگ رسالت کے حوالے سے اختیار کرتے ہیں منصب رسالت کی عظمت اور حتمیت کا تقاضا ہے کہ ہر تسلیم کرنے والا اطاعت وانقیاد کیلئے ہمہ وقت تیار ہو، حکم عدولی کا کوئی تصور کسی شکل میں ظاہر نہ ہو بلکہ نہاں خانہ دماغ میں کوئی ایسا وسوسہ پیدا نہ ہو تب ایمان مستحکم و متحقق ہوتا ہے وگرنہ نافرمانی کی سزا شدید بھی ہے اور بھیانک بھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ﴿٣٦﴾ (الاحزاب 36)

''کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اُس کا رسول (ﷺ) کسی معاملے کا فیصلہ کردیں تو ان کو کوئی اختیار رہے، اور جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کرتا ہے وہ تو کھلی گمراہی میں بہک گیا ہے''۔

واضح کردیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ معظم کا فیصلہ ہی حتمی ہے فیصلہ صادر ہو جائے تو پھر کسی کو اس سے اختلاف وانکار کی گنجائش نہیں رہتی، اسلامی تعلیمات کا غیر مبہم فیصلہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے احکام اور فیصلوں سے انکار دین اسلام میں رہتے ہوئے ممکن نہیں یہ صریحاً کفر ہے اور اس کے لئے عذاب ہی عذاب ہے یہ یاد رہے کہ یہ احکام ایک معاشرتی مسئلہ کے حوالے سے بیان کئے جارہے ہیں اس سے اس خیال فاسد کی نفی ہوگئی کہ احکامِ رسالت صرف خاص حدود میں نافذ ہوتے ہیں اور یہ کہ احکام کی تعبیر زمانی حدبندیوں میں محصور ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی رسالت آفاق کے لئے اور ابدالاباد تک

ہے، انسان کہیں بھی ہو اُسے آپ ﷺ کے ارشادات کو ہی اپنانا ہے حتکہ مر بھی جائے تو احکام کی ہمہ گیری ختم نہیں ہوتی۔ اس لئے فرمایا گیا۔

"لایومن احد کم حتیٰ یکون ھواو تبعاً لماجئت بہ"

(کنز العمال جلد اول ص: 217)

"تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی خواہشات بھی اتباع میں نہ آجائیں ان احکام کی جو میں لایا ہوں"

فوز فلاح صرف اور صرف اطاعت رسالت سے ہی ممکن ہے کہ خود پروردگار کا فیصلہ ہے

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۱﴾ (الاحزاب 71)

"اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے تو بے شک وہی ہے جو عظیم کامیابی پاتا ہے"

کامیابی، اطاعت کا حاصل ہے تو ناکامی، نافرمانی کا نتیجہ، جو جس قدر اطاعت میں پختہ ہے اسی قدر کامیاب و بامراد ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کامیابی آخرت کی ہے لیکن قرآن مجید کے واضح ارشادات اس کی نفی کرتے ہیں کامیابی کا کوئی رخ یا پہلو ہو اس کے لئے ایک ہی شاہراہ نجات ہے کہ ہر حال میں وجود مکرم ﷺ کو رہنمائے حیات بنایا جائے، اسی تناظر میں ارشاد ہوا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ (الاحزاب:21)

بیشک تمہارے لئے رسول (ﷺ) کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے اس کے لئے جو اللہ سے امید رکھتا ہے یوم آخر کو چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتا رہا۔

واضح کردیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کا ہر لمحہ، انسانی زندگی کے لئے ایسا راہنما ہے کہ اس سے بہتر راہنمائی ممکن نہیں، اس سے انکار نہیں کہ انسانی حیات کو سوارنے اور بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے بہت سے نمونے راہنمائی کے لئے لوگوں کی نظروں میں رہیں گے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس نمونے کو حسین تر اور جس راہنمائی کو حسن و جمال کا موید قرار دیا جاسکتا ہے وہ صرف ایک ہے پھر یہ بیان ہوا کہ اسوہ حسنہ کی تلاش کیوں ہے، اس لئے کہ انسان اپنی زندگی میں چند پسندیدہ نتائج حاصل کرنا چاہتا ہے، تاریخ انسانی کا بغور مطالعہ واضح کرتا ہے کہ انسان کی ساری تگ ودو اور خاص طور پر ایمان لانے والوں کی سعی و کاوش کا مطلوب یہی تین مقاصد ہوتے ہیں جن کا تذکرہ کردیا گیا۔

انسان اگر روحانیت کے اسی مقام پر ہے جہاں مقصود اس قدر بلند ہو کہ صرف اور صرف ذاتِ خالق ہی مطلوب ہو تو اس فکر کو لافانی اور روحانی کہا جاتا ہے، تلاش حق اور طلب ذاتِ واحد ہی فکر و نظر کی معراج ہے۔

انسان میں یہ خواہش بھی بڑی شدید رہی ہے کہ اس کا انجام بخیر ہو، رات دن کی محنت کا مطلوب آخری روز کی کامیابی ہوتا ہے، قیامت کا حساب و کتاب، اعمال کا محاسبہ اور باز پرس جنت و دوزخ کی خواہش اور خوف، یہ محرکات انسان کو پابند آداب بناتے ہیں اور کسی کامیاب وجود کی پیروی کی تحریک دیتے ہیں۔

تیسرا رد یہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو کہ ذکر و فکر میں راہ نجات تلاش کرتے ہیں، قرآن مجید ان تمام صورتوں میں ایک ہی حل بتاتا ہے، کہ تمھارا مطلوب ذاتِ حق ہو، آخرت کی نجات ہو یا محو ذکر رہنے کی تمنا ہو تو بس ایک ہی محفوظ طریق عمل ہے کہ

اس وجود گرامی کو راہنمائے حیات بنالیجے جس سے ہر کامیابی کا تعلق جڑا ہے، معلوم ہوا یا حق میں بھی اُسوہ رسول ﷺ ہی معتبر ہے، وحدت کی تلاش ہو، الستی مستی درکار ہو تو بے کار جھمیلوں میں نہ پڑو، راہ حق کے راہ یاب راہنما کا دامن تھام لو، اگر آخرت میں نجات چاہتے ہو، روز آخرت کی رسوائیوں سے بچنا چاہتے ہو تو اس رسول ﷺ کے نقوشِ قدم کو اپنا لو کہ یہی نشان منزل کو پالینے کی ضمانت ہیں ہاں اگر صرف ذکر حق سے ہی نفس کو ضربیں لگانا چاہتے ہو تو پھر بھی وہی طریقہ اپناؤ جو ہر دور اور ہر منزل میں کامیاب قرار پایا ہے۔

ایک سوال جو مضطرب ذہنوں میں خلجان پیدا کرسکتا ہے یہ ہے کہ مانا اسوہ حسنہ کا مرکز ایک ہی ذات ہے، کامرانیوں کے تمام پرت اسی اُسوہ کو اپنانے سے کھلتے ہیں مگر وہ وجود جس پر ساری عمارت استوار کی جارہی ہے اس کے اوصاف وشمائل کون سے ہیں جو اس ذمہ داری کی اہلیت عطا کرتے ہیں، قدرت شیطانی فریب کے تمام وسوسوں کو مٹا دینا چاہتی ہے اس لئے برملا اظہار کردیا کہ جس کا اتباع لازم کیا جارہا ہے وہ ایسے اوصاف کا حامل ہے جو محفوظ اُسوہ کی ضمانت ہے فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (الاحزاب :45۔46)

"اے نبی (محترم) بے شک آپ کو بھیجا شاہد بنا کر، بشارت دینے اور ڈر سنانے والا بنا کر اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والا اور روشن کرنے والا آفتاب بنا کر"۔

رسول بنا کر مبعوث فرمایا گیا مگر صرف پیغام بر ہی نہیں بنایا، ایسی صفات

سے متصف بھی فرمایا جو اس منصب کے لئے ضروری تھے، سوچیے صرف یہ کہنا کہ انہیں رسول بنایا گیا، مخاطبین کے اندر کئی سوالات اٹھا سکتا ہے ان کو یہ منصب کیوں عطا کیا گیا، اس منصب کی ذمہ داریاں نبھانے کے لئے صفات لازمہ کون سی ہیں، رسول کو کیا کرنا ہے؟ راہنمائی کے لئے کن صلاحیتوں کو ضرورت ہے ان سب اٹھنے والے سوالوں کا جواب مجملاً سہی مگر بڑی وضاحت سے دے دیا گیا، ایک ایک وصف پر غور کریں تو واضح ہو جائے گا۔

شاھد بنایا گیا کہ تسلیم کرنے والوں اور پیروی کرنے والوں کو یقین رہے وہ جس کی اتباع میں عافیت پانے کی تمنا رکھتے ہیں وہ بے خبر نہیں کہ نصیحت اور انجام نصیحت سے انجان رہا ہو فرمایا گیا وہ رسول معظم ﷺ جن کو تم تسلیم کرکے پیروی کررہے ہو وہ تم سے بھی اور تمہارے اعمال سے بھی باخبر ہے، راہنما کی دانائی پیش بینی انجام آشنائی اور دست گیری پر اعتماد ہو تو اتباع میں ولولوں کا سماں ہی اور ہوتا ہے اور اگر یہ بھی یقین ہو کہ محاسبے کے دورانیہ میں وہ موجود بھی ہوگا اور محاسبہ کے اجزاء سے باخبر بھی ہوگا تو اطاعت صرف تعمیل حکم نہیں رہتی قلبی وابستگی کا ذریعہ بھی ہوتی ہے

مبشّراً : بشارت دینے والا اُس انجام کی جو ہمہ خیر ہے، ان راہوں کی جو لامحالہ منزل آشنا ہیں اُن وسائل وذرائع کی جو ہر حال میں واصل الی الخیر ہیں۔

نذیراً : ڈرانے والا، متنبہ کرنے والا کہ ان راہوں پر نہ جانا ان کی منزل تباہ حال ہے ایسے طریقے نہ اپنانا جو بے توفیق ہیں اُن ذرائع پر بھروسہ نہ کرنا جو منزل آشنا نہیں یاد رہے مبشر کو کسی صورت نذیر بھی ہونا چاہیے تاکہ ترغیب تنبیہ کے حصار میں رہے وگرنہ حدود آشنائی کی صیانت قائم نہیں رہتی۔

داعیاً الی اللہ: اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والا، دعوت خالصۃ للہ، یہ رُخ کا وہ تعین ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو دعوت کبھی غرور کبھی ذاتی وقار اور کبھی مفادات کے گرداب میں اسیر ہو کر دعوت نہیں رہتی، خواہش طلبی ہو جاتی ہے۔ یہ چونکہ اندر کا معاملہ ہے اس لئے باذنِ اللہ کا حصار باندھا گیا تاکہ بے ترتیبی کا کوئی واہمہ جنم نہ لے۔

سراجاً منیراً: روشن آفتاب یعنی رسول گرامی کو ہدایت و رشد کا آفتاب ہونا چاہیے ایسا آفتاب جو جس جس پر اپنا نورانی فیض منتقل کرے روشن ہوتا جائے، اللہ اکبر کیا تاریخ کے اوراق گواہ نہیں؟ کہ آفتاب رسالت سے فیض پانے والے راہ یاب ہی نہیں ہوئے، خیر کے راستوں کے کواکب بھی بنے۔

یہ ہیں وہ صفات جو منصب نبوت و رسالت کا لازمہ ہیں کہ جو بے خبر ہو، جس کے ہاں نہ نیکی کی بشارت ہو اور نہ ہی بدی کی تنبیہ، جو ہدایت کے تقدس اور اس کی للھیت کا وسیلہ نہ ہو اور دل و دماغ کو روشن کرنے کی استعداد نہ رکھتا ہو، وہ رسالت کی ذمہ داری کیسے نبھائے گا۔

سورہ الاحزاب نے ایسے کرم فرما، نور بخش اور باخبر رسول کا تعارف کرایا، اب تو یہ ماننے والوں پر لازم ٹھہرا کہ وہ اعتراف بھی کریں، ایمان بھی لائیں اور مدح سرائی بھی رہیں، یہ مرحلہ بھی خود قرآن مجید نے آسان کر دیا اور ایک ایسا وظیفہ بتا دیا جو یہ کہ ہر لحظہ اعتراف عظمت کا ذریعہ ہوگا بلکہ ہر قدم اپنی نیازمندی کے اظہار کا وسیلہ بھی بنے گا اس لئے ہمہ خیر ہوگا اور ہمہ کارساز بھی۔ ارشاد ہوا۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٥٦﴾ (الاحزاب:56)

"بے شک اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی آپ ﷺ پر درود اور سلام کا حق ادا کرتے ہوئے سلام بھیجو"۔

حکم دینے سے پہلے ایک ایسی ترغیب دلائی جو بنفسہ تعمیل کے حکم کا مضبوط ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ رحمتیں نازل کر رہا ہے اس کے فرشتے عظمت شان کا اعتراف کر رہے ہیں، تو اے ایمان لانے والو، اس ملکوتی عمل میں تم کیوں شریک نہ ہو یہ تو خالق و مخلوق کا ایک عمل ہے، "صبغۃ اللہ" کے متلاشیو، تم بھی اس رنگ میں رنگے جاؤ ہاں ہاں رحمت کا مرحلہ ہے علو مرتبت کے اعتراف کا سلیقہ ہے، تم اپنی دعاؤں میں اس کو شامل کر لو، شاید اپنی کوتاہیاں، اس رفعت ذکر میں حائل ہوں تو اللہ تعالیٰ سے ہی التجا کر لو کہ وہ اپنی رحمتوں میں سے اس عجز طلب کو بھی شرف بخش دے۔ یہ بھی اضافہ کر لو کہ سلام کا حق بھی ادا کرو، درود کا حکم واضح ہے مگر سلام کے حکم کی تاکید بھی شامل ہے اس لئے کہ سلام صرف مومنوں کا خصوصی وظیفہ ہے۔ درود پاک کے بارے میں متعدد ارشادات احادیث میں موجود ہیں مثلا

جو کوئی ایک مرتبہ درود پڑھے تو پروردگار اُس پر دس مرتبہ رحمت نازل کرتا ہے۔

جو کوئی مجھ پر کثرت سے درود پڑھے گا وہ جنت میں مجھ سے قریب تر ہوگا

بخیل ہے جس کے ہاں میرا ذکر ہوا اور اُس نے مجھ پر درود نہ پڑھا۔

اس لئے درود پاک کو وردِ جاں بنانا چاہیے تاکہ رحمتیں حاصل ہوں، نجات نصیب ہو اور قبولیت کی منزل قریب آئے، اللہ تعالیٰ صفات شماری کا سلیقہ عطا فرمائے اور درود پاک کی کثرت کی توفیق بخشے آمین

قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اسلام دینِ توحید ہے اور نبی اکرم ﷺ توحید کے پیغام بر، حیاتِ انسانی کی حقیقتوں کا سراغ لگانے والے اسلامی تعلیمات کے توحیدی رویے سے بے خبر نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسانی وجود ایک اکائی ہے جسے نفس واحدہ کہا گیا ہے، قرآن مجید جب

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (البقرہ:213)

انسان ایک ہی امت تھے کہہ کر متعارف کراتا ہے تو اسی وحدت کی تعلیم دیتا ہے یہی فطرۃ اللہ ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، اس لئے پروردگارِ عالم کی رضا بھی یہی ہے کہ انسان اس سلکِ محبت و وحدت میں پروئے رہیں وہ چاہتا تو ایسا ہونا لازم قرار دے دیتا مگر اس طرح انسانی اختیار پر زد پڑتی اور وہ دیگر مظاہر کا سا ہو کر رہ جاتا۔ وحدت مقصود ہے مگر اس کا حصول انسان کا امتحان ہے، تاریخ انسانی گواہ ہے کہ متعدد بار بلکہ بار بار انسان کثرت کے فریب میں مبتلا ہوا اور احسن تقویم کی رفعتوں سے اسفل السافلین کے پاتال کی طرف اُترا، اس کا نتیجہ افتراق و انتشار کی صورت میں ظاہر ہوا، پھر کیا تھا، ظلم، جبر، بے انصافی، حقوق نا آشنائی اور انانیت شب خون مارنے لگے اور ''امۃ واحدۃ'' کی عظمتوں کا امین قبائل و شعوب کی پراگندگی کا اسیر ہو گیا۔

بعثت نبوی سے پہلے کے حالات کا جائزہ لیں تو آشکار ہو جائے گا کہ کس طرح انسانی شرف پامال ہوا، رومۃ الکبریٰ کا جبر ہو یا کسریٰ ایران کی ستم کوشیاں،

انسان ٹکڑوں میں بٹ گیا، جغرافیائی حد بندیاں انسان کے وجود کو تقسیم کرنے لگیں، نسلی تفاخر، اخلاقی و روحانی اقدار کو روندنے لگا، رنگ و روپ کا تفاوت وحدت نسل کے تصور کو پامال کرنے لگا، انسان، گروہی تنگ ناؤں کا شکار ہو کر ایک دوسرے کا دشمن بن گیا، مفادات کی کشمکش نے اسے حیوانی سطح پر لا کھڑا کیا، معاشرتی بُعد بڑھتا گیا اور معاشی عدم مساوات نے انسانی شرف کا ہر جوہر دھندلا دیا، روم، یونان، مصر و ایران، چین و ہندوستان سب کثرت پسندی کے وبال اور ذاتی اغراض کے گرداب میں غرق ہوئے، بھائی بھائی سے جدا ہوا۔ مفاد پرستی نے ظلم و جبر اور قتل و ہلاکت کی آبیاری کی، غرضیکہ انسان، انسان نہ رہا درندہ بن گیا، ایک دوسرے پر جھپٹنا اور اپنی خواہشات کے زیر اثر دوسروں سے حق انسانیت چھین لینا معمول بنا، کہا جاتا ہے کہ اس عمومیت میں عرب کو خصوصیت حاصل تھی، بیمار ساری دنیا تھی مگر عرب کا مریض دق میں مبتلا تھا، وحشت و بربریت، خودسری و خودنگری اور حقوق و فرائض سے بے خبری نے عرب کی سرزمین کو حیوانی مسکن بنا دیا تھا۔ اُن کا دعویٰ تو یہ تھا کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں مگر اصل حالت بقولِ حفیظ کچھ یوں تھی۔

یہ سارے خود کو اسماعیل کی اولاد کہتے ہیں
مگر ہم تو انہیں مادر پدر آزاد کہتے ہیں

اُن کی حالت کا نقشہ یوں تھا کہ

آدمیت محوِ حیرت نقش بر دیوار تھی
آدمیت کے گلے پر ظلم کی تلوار تھی

یہ تھی فضا اور یہ تھا ماحول جب رحمت عالمین ﷺ کی تشریف آوری ہوئی،

رحمت کے زمزمے بلند ہوئے، انسانی شرف کی بحالی کا اہتمام ہوا، کائنات کا ذرہ ذرہ جھوم رہا تھا کہ ظلم وستم کی حکمرانی اور غرور وفخر کے سب انداز ختم ہوئے، زمین سے آسمان تک شادمانی مچلنے لگی اور کائنات زبانِ حال سے پکار اٹھی۔

خبر جا کر سنا دو شش جہت کے زیر دستوں کو
زبردستی کی جرأت اب نہ ہوگی خود پرستوں کو

کیونکہ آج نسلِ انسانی کا محسن، کائنات کی رحمت اور خالق ارض وسماء کا آخری پیغام بر تشریف لے آیا تھا، ظلمتوں کے اتھاہ سمندروں میں روشنی کا مینار جو پوری انسانیت کے لئے محبت کی نوید بن کو جلوہ افراز ہوا۔ ظلمت پرستوں نے روشنی کا راستہ روکنا چاہا، مرض تند خو تھا اس لئے نسخۂ شفا کو قبول کرنے میں متامل بلکہ انکاری، مگر نیکی کا اپنا دبدبہ ہوتا ہے، روشنی کی ایک کرن بھی صدیوں کے اندھیروں کو پسپا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ مخالفت ہوئی، رویے بدلنے سے انکار ہوا مگر اب انقلاب فکر ونظر ماحول کا مقدر تھا، تصادم بھی ہوا جراحت کا سامان بھی کرنا پڑا کہ یہ بھی ضروری تھا، پاؤں میں اٹکا ہوا کانٹا نکالنے سے درد تو ہوتا ہے مگر مہربان ماں اس تکلیف کے خوف سے کانٹا اٹکا نہیں رہنے دیتی۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے کردار وعمل سے اپنے ماحول کو اس قدر متاثر کیا کہ بدقماش معاشرہ بھی اُنہیں امن کا سفیر، شرافت کا پیکر اور صداقت کا علمبردار سمجھنے لگا، حجر اسود کی تنصیب پر سونتی ہوئی تلواریں ہلاکت خیز نہ بن سکیں کہ وہ آ گیا تھا جس پر خون کے پیاسے بھی پکار اٹھے تھے۔

هذا الامين۔ قد رضينا۔ هذا محمد (سیرت ابن ہشام الجزء الاول ص 214)

یہ امن دہندہ آ گیا ہے، ہم اس کے فیصلے پر راضی ہوئے۔ یہ تو محمد ﷺ ہیں۔

غرورِ نسب پر اصرار کرنے والے حبش کے ایک غلام کو سیدنا بلال کہہ کر خطاب کرنے لگے، قوی برتری کے فریب میں مبتلا ماحول کو یوں برابری کی سطح پر لا کھڑا کیا کہ خاندان قریش کی معزز ومحترم خاتون ایک غلام اور وہ بھی زرخرید غلام کے نکاح میں دے دی گئی، تمیزِ بندہ آقا کو ایک ضرب سے مٹا ڈالا اس سے خودنمائی اور خودنگری کا خمار اُترا، اونچ نیچ کے بت ٹوٹے، رنگ ونسل کے گرداب سے رہائی ملی اور وحدتِ نسل انسانی کا سکہ رواں ہوا، آخری حج کے موقعہ پر تیرسیٹھ برس کی کاوشوں کا حاصل بیان ہوا۔ فرمایا۔

أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، كُلُّكُمْ لِآدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ، إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ، وَلَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ إِلَّا بِالتَّقْوَىٰ۔ (مسند احمد)

"اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تحقیق تمہارا باپ ایک ہے تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے، بے شک تم میں سے معزز وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے اور کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنیاد پر"۔

إِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، تحقیق تمہارا باپ ایک ہے، ایک مختصر حملہ ہے مگر اس نے انسانی سوچ کا رخ بدل دیا، تعلقاتِ نسل کو جناب ابوالبشر تک بلند کر کے پوری نسل انسانی کو دائرہ اخوت میں سمو دیا کہ مادی حوالہ ہی اگر معتبر ہے تو اُسے بھی بلند تر ہونا چاہیے۔ رب کی ربوبیت میں فاصلے حائل نہیں ہو سکتے۔ رب سے محبت کا دعویٰ اور اُس کی ربوبیت کے مظاہر سے نفرت مناسب نہیں، نبی رحمت ﷺ کا یہ اعلان، انسانیت کا چارٹر، اخلاق وآداب کا صحیفہ اور بین الاقوامی معاشرت کی خشت اول

ہے۔اسی کا نتیجہ تھا کہ دربار ایران میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے برملا کہا۔

إِنَّا مَعْشَرَ الْعَرَبِ لَا نَسْتَعْبِدُ بَعْضُنَا بَعْضًا

(الکامل فی التاریخ ج 2 ص: 313)

ہم عرب کے لوگ ایک دوسرے کے برابر ہیں ہم ایک دوسرے کو زیر دست نہیں بناتے۔

رسول اکرم ﷺ کا یہ اخوت کا پیغام تھا جس نے معاشرتی ناہمواری اور معاشی عدم توازن کو ختم کیا باہم دست وگریباں ،آپس میں بھائی بھائی بن گے، نفرت ومفاخرت کے رسیا شیر وشکر ہوگئے ،دشمنی پیار میں اور تفاخر انکسار میں بدل گیا، بے شک مومن بھائی بھائی ہیں کا ارشاد ربانی عملی پیکر میں ڈھلا تو مسلمان کے ہاتھ اور زبان سے کوئی خطرہ نہ رہا، نہ دست درازی ہوئی نہ زبان درازی، اخوت کی جلوہ گری، تعاون کی صورت گری میں ظاہر ہونے لگی، ہمدردی، محبت، پیار اور یگانگت کا درس ملا اور مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی پکار اٹھے۔

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کردیا

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا

قرآن مجید میں مختلف پیراؤں میں مقام رسالت کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔کبھی ضرورت نبوت پر دلائل مرتب کئے گئے، کبھی اتباع رسالت کی اہمیت واضح کی گئی اور کبھی کسی واقعہ سیرت کے حوالے سے ذاتِ رسولِ مقبول ﷺ کی رفعتِ شان کا تذکرہ کیا گیا، قرآن پاک کی اُن آیات کا شمار کیا جائے جو سیرت النبی ﷺ کی حکایت یا اُس کے اشارات پر روشنی ڈالتی ہیں تو سیرت پر عمدہ تالیف تیار ہوسکتی ہے۔بعض علماء نے ایسی کوششیں کی ہیں مگر زیادہ تر توجہ فضائل وخصائل کے تذکروں تک محدود رہی ہے۔قرآن کتاب ہدایت ہے اس میں حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں دائمی اور بے لاگ ضابطے ہیں جن کو اپنا کر انسانی زندگی کامیاب وکامران ٹھہرتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ نظریاتی تعلیم کو متحرک زندگی میں کیسے سمویا جائے یا بالفاظ دیگر یہ قرآنی ضابطے انسانی وجود پر نافذ کیسے کئے جائیں ظاہر ہے فکر اور عمل کے درمیان کئی مغالطے ابھر سکتے ہیں اور نظریہ کو وجود میں مشخص ہونے کے لئے بہت سی عملی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے قرآن انسانی فطرت کی اس مجبوری اور ذہن انسانی کی اس نارسائی کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اسے عملی حوالہ عطا کرتا ہے۔

قرآن کی تعلیمات کو بروئے عمل لانے میں جو ضروری واسطہ درکار تھا وہ ذات رسالت مآب ﷺ کے وجود میں موجود ہے،قرآن مجید کی بیشتر تعلیمات اوامر ونواہی کی صورت کے بجائے حکایاتی شکل یا بیانیہ انداز میں ہیں، قرآن، قرآن مجسم کی زندگی

کے واقعات کو بیان کر کے تعلیمات کو عملی حوالہ اور شخصی وجود عطا کرتا ہے، یہ طرز تعلیم اثر آفرین ہے کہ نظریہ ایک قالب میں ڈھلا ہوا ہے اور انسان فطرتاً مثال سے حقیقت تک پہنچتا ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (الفتح:1)

سورۂ فتح کی پہلی آیت ہے جس میں سیرت مطہرہ کے ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے، واقعہ پیش آچکا ہے مگر اُس کا ذکر مستقبل کے حوالے سے کیا گیا ہے کہ قاری فوراً غور وفکر کرنے لگے کہ بظاہر واقعے میں تو ایسی کسی فتح کا ذکر نہ تھا، یہ انداز حکایت اشارہ ہے کہ نبی کا عمل من جانب اللہ ہوتا ہے۔ عقل اس کی حکمتوں کو جلد نہ بھی سمجھے تو اس سے مستقبل کے اثرات کی نفی نہیں ہوتی۔ بہتر ہوگا کہ وہ اس تاریخی عمل کا جائزہ لے لیں تاکہ آیت کریمہ کی تفہیم میں دقت نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ کو مکہ مکرمہ چھوڑے چھ سال ہو چکے ہیں، کفار مکہ کی برملا دشمنی نے مجبور کر دیا تھا کہ مرکز تبلیغ کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے، یہ ضرور ذہن نشین رہے کہ یہ پسپائی کا عمل نہ تھا بلکہ عملی جدوجہد میں حالات کے مطابق مناسب تبدیلی تھی، مقصد نظر سے اوجھل نہ ہوا تھا بلکہ مرکزِ اسلام اور کعبۃ اللہ پر لگاتار نظریں جمی تھیں، داخلی انتشار سے بچتے ہوئے جب مرکز مقاومت بدل دیا گیا تو اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ فریقین کو اپنی پوری قوت مجتمع کرنے کا موقعہ ملا۔ اہلِ مکہ یہ سمجھ چکے تھے کہ مسلمان مکہ سے جان بچا کر نہیں بھاگے ہیں وہ تو مستقبل کے لئے عملی جدوجہد کا سامان کرنے کے لئے عافیت گاہ تلاش کر چکے ہیں اسی لئے تو مکہ والے بار بار اس مضبوط مرکز کو تزلزل آشنا کرنے کے لئے حملہ آور ہوتے رہے۔ ذرا سوچئے

انہیں اہل مدینہ کے ایمان کی اتنی فکر کیوں لاحق تھی وہاں تو پہلے ہی یہودیوں کی خاصی تعداد آباد تھی اُن پر تو انہوں نے کبھی حملہ نہ کیا تھا وجہ ظاہر ہے وہ اپنے دین پر پکے تو تھے مگر اُس کے ایسے مبلغ نہ تھے کہ دور دراز اُس کی خاطر جان خطرے میں ڈالتے پھریں، تاریخی واقعات کا تجزیہ واضح کرتا ہے کہ مدینہ پر حملے مدنی لوگوں کے مفاد کی خاطر نہیں اپنے مستقبل کے تاریک ہونے کے خوف سے کئے جا رہے تھے بہرکیف اہل مکہ نے مسلسل حملے کئے شب خون مارے، راستے کاٹے، معاشرتی معاشی ہر قسم کے جبر کی کوشش کی مگر اُن کی کوششیں پادر ہوا ثابت ہوئیں، غزوہ احزاب مکہ والوں کی فتنہ پردازی کا حرف آخر تھا، طاقت کا دھارا بدلا جا رہا تھا۔ مکہ سے حملوں میں ضعف آ گیا تھا اس لئے کہ خندق کے کناروں پر لڑی جانے والی جنگ فیصلہ کن ثابت ہوئی تھی۔ کفر کا زعم ٹوٹا۔ وہ اندھی چلی کہ اہل مکہ کی ہوا اکھڑ گئی، پسپائی مقدر بنی، حملے کے ارمان دم توڑ گئے، اب جو خطرہ وہ شروع سے محسوس کر رہے تھے اُسکی عملی صورت سامنے آ گئی تھی، قدرت فیصلہ دے چکی تھی اُن کا دور ختم ہو چلا تھا۔ اب مسلمانوں کی باری تھی۔ حملہ بھی ہو سکتا تھا مگر یہ تو پھر اُن کی روش ہی کا اتباع ہوتا، اسلام شائستگی کا دعویدار ہے۔ جنگ پسندی کا خوگر نہیں مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے حقوق حاصل کر لئے جائیں، بیت اللہ اہل مکہ کی جاگیر تو نہ تھی، جناب ابراہیم علیہ السلام کی یادگار اور ملت اسلامیہ کا قبلہ تھا۔ اس لئے مناسب تھا کہ اُس کی زیارت پر اصرار کیا جائے، حرم مکہ کے دیدار کی خواہش سب مسلمانوں کے دلوں میں مچل رہی تھی۔ چھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے دلوں کی تسکین کے لئے سفر کا ارادہ فرما لیا۔ چودہ سو صحابہ کی جماعت آنحضرت ﷺ کی قیادت میں روانہ ہوئی۔ نیک نیتی کا یہ عالم تھا

کہ دشمنوں کے ہاں جانا ہے مگر ہتھیار ساتھ نہ تھے صرف تلوار جو زیر نیام تھی۔ حدیبیہ پہنچے۔ اپنے ارادوں سے اہل مکہ کو آگاہ کرنے کے لئے پیغام بھجوایا۔ باطل ذہنی تحفظات کا شکار تھا اور پریشان خیالی میں مبتلا تھا۔ نیک ارادوں کے آگے بندھ باندھنے کی کوشش کی گئی، ادھر نورانی قافلہ تھا طاقت کا اظہار مقصد نہ تھا اس لئے مصالحت کی کوشش ہوتی رہی۔ حضرت عثمان ؓ کو سفیر رسول بننے کا شرف حاصل ہوا، آپ مکہ گئے اور اہلِ مکہ سے تمام صورت حالات پر گفتگو کی مگر وہ لوگ احساس کمتری کا شکار تھے کسی صورت راضی نہ ہوئے، حضرت عثمان ؓ سے کہنے لگے کہ آپ چاہیں تو طواف کرلیں مگر آپ نے رسول اللہ ﷺ کے بغیر طواف کعبہ سے انکار کر دیا، کفارِ مکہ حیران تھے کعبہ مسلمانوں کی تمناؤں کا مرکز اور عقیدت کا منبع تھا، حضرت عثمان ؓ نے انکار کر کے اُن پر ثابت کر دیا کہ مسلمان ذات رسول ﷺ کے بغیر یا اُن کی رضا حاصل کئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے، مسلمان کی زندگی کا محور اتباع رسالت ہے۔ یہ عملی تبلیغ تھی جو کفار کے دلوں پر نقش ہو کر رہ گئی، دوسری جانب مسلمان حضرت عثمان ؓ پر رشک کر رہے تھے کہ انہیں تو طواف کعبہ کی سعادت مل چکی ہوگی مگر رسول اللہ ﷺ کو اپنے جانثاروں کی عادات کی خبر تھی، فرمایا ایسا خیال نہ کرو۔ ماکان لیفعل" عثمان ؓ ایسا نہیں کریں گے، اس واقعے نے اسلامی مشن کے سربراہ کا جانثاروں پر اعتماد اور جانثاروں کی اطاعت شعاری کا خلوص واضح کر دیا۔ جب راعی اور رعایا، آقا اور غلام میں ایسے رشتے استوار ہو جائیں تو کامیابی مقدر ہو جاتی ہے پھر فتح مبین کے مژدے سنائی دینے لگتے ہیں مشن کی کامیابی ظاہری اعمال سے کہیں زیادہ باطنی رابطوں کی مرہون منت ہوا کرتی ہے اور جب دلوں کا باہمی تعلق اس نہج پر آجائے تو مشن کامران

اور جشن فتح قرب ہوا جایا کرتا ہے۔

مخلصانہ کوشش کے باوجود جب اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مستقبل کی فکر ہوئی، ابھی آئندہ اقدام کے بارے میں فیصلہ بھی نہ ہوا تھا کہ حضرت عثمان ؓ کی شہادت کی افواہ پھیلی، یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ افواہ ارادۃً پھیلائی گئی تاکہ مسلمانوں کا ردعمل واضح ہو جائے، یہ ایک امتحان تھا جس میں مسلمان فوج کامیاب ہوئی۔ اس وحشت خیز خبر نے اشتعال پیدا کر دیا، غیرت وحمیت کے ایوانوں میں زلزلہ بپا ہو گیا۔ چنانچہ حدیبیہ کے مقام پر چشم فلک نے ایک عجیب نظر دیکھا کہ ایک ببول تلے سرورِ کائنات ﷺ شہادت عثمانی، کے قصاص کی خاطر بیعت لے رہے ہیں۔ یہ بیعت الشجرۃ تھی جو بیعت الرضوان کے نام سے معروف ہوئی، افواہ غلط ثابت ہوئی مگر کفار مکہ نے مسلمانوں کے ردعمل کی شدت کا اندازہ کر لیا، یہ بڑی کامیابی تھی، یہ نفسیاتی جنگ تھی جس میں مسلمان کامیاب قرار پائے، قریش کو گفتگو پر مجبور کر دینا سفارتی فتح تھی۔ سہیل بن عمرو قریش کا نمائندہ بن کر شرائط صلح طے کرنے آیا۔ سہیل نے ابتداً جارحانہ انداز اختیار کیا۔ گفتگو میں ایسا انداز بھی نفسیاتی عمل ہوتا ہے۔ اُس نے تو مسلمانوں کے جانثارانہ کردار پر بھی تشکیک کے تیر برسائے جس پر حضرت ابوبکر ؓ نے اُسے برسر میدان ٹوکا، وہ تاڑ گیا کہ ایسا نرم دل عمر رسیدہ ساتھی جب اپنے اندر اس قدر آتش سوزاں رکھتا ہے تو جوانوں کا کیا حال ہوگا چنانچہ اُس کا یہ حربہ بھی ناکام رہا اور ایک مزید نفسیاتی فتح مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔ سہیل نے بسم اللہ الرحمن الرحیم سے لے کر فریقین کے اسماء تک اعتراضات کئے، وہ مسلمانوں کی قوت برداشت کا امتحان لیتا گیا اور معاندت کی ہر تدبیر آزماتا گیا مگر مسلمان کسی ہیجانی کیفیت میں مبتلا نہ تھے، اُن میں ایک ٹھہراؤ تھا، وقار تھا معاملات سلجھانے کی

بے پناہ صلاحیت تھی، بے صبری کفر کی سرشت ہے مسلمان تو وہ وقار ہوتا ہے شرائط میں حک و اضافے کے کئی مرحلے آئے، آنحضرت ﷺ اتمام حجت کرتے چلے گئے اور آخر دس سالوں کے لئے ایک صلحنامہ فریقین کے باہمی اتفاق سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس معاہدے کے مندرجات پر پریشان تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو برملا اظہار بھی کیا، مگر حضور اکرم ﷺ کی طرف سے صرف ایک جواب تھا "انی رسول اللہ" میں اللہ کا رسول ہوں، اس لئے اللہ کی رضا طلبی میری عادت ہے، سربراہ قوم کی اس سے بڑھ کر فتح اور کیا ہوگی کہ وہ دشمنوں کے ساتھ کسی معاہدہ تک پہنچے اور قوم اُس کے معاہدے کے احترام کو اپنے ایمان کا جزو خیال کرے، یہ قیادت کی کامیابی تھی اور تسخیرِ قلوب کی منزل تھی، شرائط طے پا گئیں۔

* قبائل عرب کو فریقین میں سے کسی کے ساتھ معاہدہ کرنے کا اختیار ہوگا۔

شرائط میں بظاہر اہل مکہ کو برتری حاصل تھی اس لئے مسلمانوں کی صفوں میں قدرے اضطراب تھا مگر جب آنحضرت ﷺ نے ان شرائط کو تسلیم کرلیا تو کسی کو انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ نگاہ نبوت دوربین بھی ہوتی ہے اور دوررس بھی، اُس نے ان بظاہر مخالف شرائط کے ورلے کئی برکات بھانپ لی تھیں۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں کو ایک سیاسی قوت اور فریق مقابل کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا تھا، یہ مسلمانوں کی سیاسی فتح تھی اس معاہدے کا ہر لفظ اہل مکہ کی بوکھلاہٹ اور مسلمانوں کے اعتماد کا مظہر تھا۔ اس سے جنگ کے بادل چھٹے، معاشرتی سکون نصیب ہوا۔ آپس کے تعلقات استوار ہوئے، آمدورفت شروع ہوئی۔ باہمی میل جول سے نفرت کی دیواریں گرنے لگیں اور دبی ہوئی نیکی ابھرنے لگی۔ انسان کی فطرت

ہے کہ وہ مخالف کی کسی خوبی کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ دشمنی کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اُسے مدمقابل میں سوائے نقائص کے کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ تناؤ کم ہو تو ذہنی تحفظات ٹوٹنے لگتے ہیں جس سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور جانچنے کا موقعہ ملتا ہے۔ معاہدہ حدیبیہ سے ایسی ہی فضا قائم ہوئی اس لئے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں یہ عرصہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔

معاہدہ حدیبیہ صرف ایک صلح نامہ تھا مگر اس کے اثرات اسقدر ہمہ پہلو تھے کہ اس نے فتح مکہ کی راہ ہموار کردی، یہ حقیقت ہے کہ اگر حدیبیہ کا معاہدہ نہ ہوتا تو مکہ کی فتح ہزاروں جانوں کا نذرانہ مانگتی، بلامزاحمت مکے کی سرزمین پر فاتحانہ داخلہ صلح حدیبیہ ہی کا نتیجہ ہے اسی لئے اسے دو سال پہلے ہی فتح مبین قرار دے دیا گیا۔ قرآن مجید نے حدیبیہ سے لوٹتے وقت ہی اعلان کردیا تھا کہ

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا

کہ بے شک صلح حدیبیہ کی صورت میں ہم نے آپ کو فتح مبین عطا فرمائی ہے، دشمن کا مرکزی شہر بلا مقابلہ ہتھیار پھینک دے تو اس سے بڑھ کر اور فتح کیا ہوسکتی ہے اس لئے تو حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔

اِنّکم تعُدّون الفتحَ فتحَ مکۃَ ونحن نعُدُّ الفتحَ صُلحَ حُدَیْبِیّۃ
(تفسیر ابن کثیر سورۃ الفتح)

کہ تم لوگ فتح مکہ کو فتح قرار دیتے ہو جبکہ ہم تو صلح حدیبیہ کو فتح سمجھتے تھے۔

ایسی ہی رائے کا اظہار حضرت جابر بن عبداللہ اور براء بن عازب رضی اللہ عنہما نے بھی فرمایا، حدیبیہ سے لوٹتے وقت جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایک صحابی پوچھنے لگے۔

أَيُّ رسولَ اللهِ أَوَفَتْحٌ هُوَ

اے اللہ کے رسول کیا یہ فتح ہے۔ فرمایا۔

أَيْ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ إِنَّهٗ لَفَتْحٌ (سنن ابی داود کتاب الجہاد)

ہاں اُس پروردگار کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے بے شک یہ فتح ہے۔

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ رسول اکرم ﷺ کے نزدیک یہ معاہدہ کسقدر دوررس نتائج کا حامل تھا اور تاریخ گواہ ہے کہ جو سرکار ابد اقرار ﷺ نے فرمایا تھا وہی سچ ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں فراستِ ایمانی کا جوہر پیدا فرمائے کہ وہ اپنے فیصلے جذبات کے بجائے عقل وشعور کی روشنی میں کرسکیں۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ

خالقِ ارض وسماء نے انسان کو اپنی تخلیق کا شہکار بنایا اور مظاہر قدرت کو اس کا تابع اور اس کی ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ بنایا، ''احسن تقدیم'' کا اعزاز بخشا اور احسن الخالقین کی احسن تخلیق کا مظہر قرار دیا، کائنات کی تمام نعمتوں کو اس کی خاطر تخلیق فرمایا۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (الرحمٰن:10)

اور زمین کو ہم نے انسانوں کے لئے پیدا فرمایا۔

زمین پر ہی کیا موقوف ہے آسمان بھی اسی کے لئے چھت بنائے گئے۔

اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً (البقرہ:22)

اور وہ ذات کہ جس نے اے بنی نوعِ انسان تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا۔

عمومی طور پر یہ کرم یہ نوازش تمام انسانوں پر ہوئی مگر بالفعل اس کے مصداق وہ نفوس قدسیہ ہیں جنہوں نے خالق کی رضا طلبی میں عطا کی ہوئی صلاحیتوں کو خرچ کیا یہ قدرت کا دائمی قانون ہے اس کا ذکر صحف ماسبق میں بھی اور قرآن مجید میں بھی۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿١٠٥﴾ (الانبیاء:125)

اور بے شک ہم نے پہلے ذکر کے بعد زبور میں بھی فیصلہ فرمادیا کہ زمین کی

وراثت ہمارے نیک بندوں کے لئے ہے۔

وہ افراد جو اللہ کے حضور سر جھکا کر اپنی عبودیت کا اعلان کرتے اور نیک اعمال پر مداومت کرتے ہیں اُن پر اللہ کا کرم دوسرے انسانوں کی نسبت سے فراواں ہوتا ہے۔ انبیاء کرام علیھم السلام بندگانِ خدا میں سے برگزیدہ مقام رکھتے ہیں اس لئے الٰہی نوازشات کے درجہ اتم کے مستحق قرار پائے ہیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ

(مریم:58)

اور وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا وہ حضرت آدم علیہ السلام کے اولاد میں سے انبیاء کرام ہیں۔

’’نبی‘‘ قوم کا سربراہ، انسانیت کا مرشد اور اللہ کا پیغام بر ہوتا ہے اس لئے اُس پر بخشش بے حساب اور کرم بے انتہا ہوتا ہے۔ سید العالمین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ انبیاء کے سرخیل اور تخلیق کے مظہر کامل ہیں، آپ کے اوصاف حسنہ اور خصائص جمیلہ تخلیق کے حسین پیکر اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کے مظہر اتم ہیں، آپ اللہ تعالیٰ کی صفت رحیمیت کا سب سے حسین اظہار ہیں۔ آپ مرکزِ کرم اور مہبطِ لطف وعنائت ہیں۔

وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (النساء:113)

اور آپ پر تو اللہ کا فضل عظیم ہے، اُس فضل کی انتہا کون پا سکے گا جس کو خود اللہ تعالیٰ نے عظیم فرمایا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات پر لطف وکرم کی انتہا ہوئی۔ کائنات کی تمام نعمتیں آپ کے وجود مقدس پر قربان کردی گئیں۔ نعمت کی تکمیلی صورت دیکھنا

مقصود ہو تو اُس نعمت کو آپ کی ذات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اسے ہی کاملیت ذات مصطفویٰ ﷺ کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید یوں تو سراپا ثناء مصطفیٰ ﷺ ہے یہ مدح رسالت کا وہ دائمی صحیفہ ہے کہ جس کی ہر آیت سے ذاتِ رسول ﷺ کی عظمت آشکار ہے۔ پیغام کی عظمت پیغام بر کی عظمتوں کی دلیل ہوتی ہے۔ اس عمومی مدحت سرائی سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر کلام ربانی کا مدحت نبوی ﷺ کے نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو متعدد آیات ایسی ملیں گے جو صراحۃً مقام مدح میں ہیں۔ ایسی تمام آیات کا احصاذات رسالت مآب ﷺ کے اوصاف حسنہ کی حسین دستاویز بن جائے گا۔ ایسی ہی آیات میں سے سورہ کوثر کی تین آیات بھی ہیں۔ ارشاد ہوا۔

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ (الکوثر:1)

بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا۔

حرف تاکید کے ساتھ اور ضمیر متکلم کے تکرار کے ذریعے مابعد بیان کی عظمت کا احساس دلایا اور یہ بھی واضح فرمادیا کہ اس بے پایاں کرم پر کسی کو حیرت نہ ہو کہ اس کا اجراء اُس ذات بے ہمتا سے ہے جو مبداء فیض ہے۔

سورہ الکوثر مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ ہجرت سے قبل کی مکی فضا سے تاریخ کے تمام طالب علم واقف ہیں کہ یہ دور تبلیغ دین کا جانگسل دور تھا، مکہ مکرمہ کی فضا پر مخالفت کا غبار طاری تھا۔ ہر آن اور ہر لحظہ ذاتِ ہادی اعظم ﷺ کو دکھ پہنچانے کی سعی میں اہل مکہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی تدبیریں کرتے تھے۔ جسمِ اطہر نشانہ ستم بنتا تو، ذہنی طور پر دکھ پہنچانے کے سامان بھی کئے جاتے۔ راستوں میں کانٹے بچھائے جاتے، جسم اقدس پر غلاظت ڈالی جاتی۔ گلا گھونٹ کر خاموش

بلکہ یہ تو ساری کائنات کے لئے ضابطہ حیات اور پوری انسانیت کے لئے راہِ نجات تھا اس لئے ایسے آفاقی دین کو ایک صاحبزادے کی وفات پر معلق کر دینا دین کی توہین اور تعلیمات اسلامیہ کی ہمہ گیریت سے انکار تھا، دکھ یہ تھا کہ قوم ابھی اپنی محدود سوچ کو بدل نہ سکی تھی، اُن کے ذہن ابھی تک اس بین الاقوامی دین اور کائنات ہست و بود کے نظام کی آفاقیت کا ادراک نہ کر سکے تھے، صاحب مشن کو جب یہ احساس ہو جائے کہ مشن کی تفہیم درست نہیں ہو رہی تو دکھ ہوتا ہے ایسا ہی کرب تھا جو آنحضرت ﷺ محسوس ہوا، یہ وہ لمحہ تھا جب الٰہی دستگیری اور الہامی راہنمائی کی ضرورت تھی، یہ بتانا اور واضح کر دینا ضروری تھا کہ یہ مشن ان مادی سہاروں سے بے نیاز ہے، اسے پھیلنا ہے اور اس کے پھیلاؤ میں عربوں کے محدود ذہنوں کے مادی حوالوں کی نفی مشن کے رُخ کو متعین کرنے کے لئے ضروری تھی تا کہ آئندہ بھی ایسے اشکال جنم نہ لے سکیں۔

اعتراض یہ تھا کہ نسل منقطع ہوگئی مگر جواب میں ''بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا'' کا ارشاد نازل ہوا، اس کی حکمت سمجھنے کے لئے ''کوثر'' کی لغوی توجیہ پیشِ نظر رہنی چاہیے، کوثر کثرت سے مبالغہ کا وزن ہے یعنی بے پناہ کثرت، بے انتہا اکثریت، اصطلاحی مفاہیم کے تعین میں متعدد اقوال روایت ہوئے ہیں۔ ایک معروف قول کہ اس سے مراد جنت کی ایک نہر یا حوض ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے یہ آیۃ مبارکہ تلاوت فرمائی تو استفسار فرمایا کہ کیا صحابہ کرام پر اس کا مفہوم واضح ہے صحابہ نے عرض کیا۔

''اللہ ورسولہ اعلم''

اللہ اور اس کا رسول محترم ہی بہتر جانتے ہیں اس پر وضاحت فرمائی۔

ھو نھرا عطانیہ ربی عزّوجلّ فی الجنّۃ علیہ خیر کثیر ترد علیہ اُمّتِی یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (مسند احمد)

کہ یہ ایک جنت کی نہر ہے جسے میرے پروردگار نے مجھے عطا فرمایا اس میں خیر کثیر ہے میری امت قیامت کے روز اس پر پانی پینے کے لئے آئے گی۔ یہ حدیث متعدد واسطوں اور مختلف طرق سے کئی کتب احادیث میں روایت ہوئی ہے۔ ترتیب الفاظ اور حوضِ کوثر کے بیان میں بعض کلمات کے اختلاف کے باوجود مرکزی مفہوم یہی ہے کہ یہ ایک نہر ہے جس سے امت مسلمہ قیامت کی ہولناک تپش میں سیراب ہوگی، پریشانی کے عالم میں جب دائمی زندگی کے حسن و قبح کا فیصلہ ہونے والا ہوگا العطش العطش کی پکار تمام انسانوں کی زبان پر ہوگی، ایسے میں چشمہ رحمت کا وجود اور راحت بخش اور روح پرور مشروب کا حاصل ہو جانا خیر کثیر ہی تو ہے اس لئے خیر کی ایک مجسم تصویر قیامت کی ہولناک گرمی میں حوض کوثر ہے۔ بعض روایات میں قیامت میں حوض کوثر کے وجود کو بے پناہ کثرت کا ایک حصہ قرار دیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کوثر کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ھو الخیر الذی اعطاہ اللہ ایاہ (تفسیر ابن کثیر۔ سورۃ الکوثر)

کوثر وہ خیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو عطا کی ہے۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ کیا یہ جنت کی نہر نہیں ہے؟ تو فرمایا۔

النھر الذی فی الجنۃ من الخیر الذی اعطاہ اللہ ایاہ

(تفسیر ابن کثیر سورۃ الکوثر)

کہ نہر کوثر جو جنت میں ہے اُسی خیر کا حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا

فرمایا ہے اس لئے کثیر صحابہ اور تابعین نے کوثر سے خیر کثیر ہی مراد لی ہے بلکہ

الخیر الکثیر فی الدنیا والاخرۃ (تفسیر ابن کثیر سورۃ الکوثر)

یعنی دنیا وآخرت میں خیر کثیر،

ان روایات سے مترشح ہے کہ کوثر سے مراد خیر کی بے انتہا کثرت ہے ایسی خیر جو دنیا میں بھی بے حد وحساب ہو اور آخرت میں بھی، بعض علماء نے اس سے رحمت کثیرہ، اور بعض نے ''امت کثیر'' مراد لی ہے، فضل کثیر، کی روایت بھی ملتی ہے،

تمام مختلف مفاہیم کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ آپ کو ہر وہ نعمت عطا کی گئی جس کی عطا ضروری تھی، دنیا وآخرت میں جو نعمت یا جو خیر کسی کو تفویض کی جاسکتی ہے وہ آپ کو عطا کردی گئی اور پھر اس عطا میں بخشش کی آخری حد تک آپ کو مشرف فرمایا گیا، نعمت ظاہرہ ہو یا باطنہ، خیر دنیا ہو یا خیر اخرت، نوازش وقتی ہو یا دائمی سب کی انتہائی شکل جس سے آگے کوئی اور نعمت متصور ہی نہ ہو آپ کو عنایت کی گئی امت ہر نبی کو ملی مگر کثرت امت کا شرف آپ کو عطا فرمایا، مسلم کی حدیث ہے کہ قیامت کے روز تمام انبیاء اپنی اپنی امتوں کے ساتھ دربار الٰہی میں آئیں گے تو کسی کے ساتھ چند لوگ، تو کسی کے ساتھ اس سے بھی کم حتیٰکہ بعض کے ساتھ صرف ایک مگر جب امت مسلمہ آئے گی تو یوں محسوس ہوگا کہ کہ قیامت کے میدان کی وسعت کم ہوگئی ہے، تب دنیا کثرت امت کا نظارہ کرے گی، دین یعنی طریق زندگی کے اصول وضوابط ہر ایک کو عطا کئے گئے مگر جو جامعیت اور جو فرامین کی کثرت آپ کو ملی اُس کا کوئی مثیل نہیں، پھر سب کو دین عطا ہوا اور وقت مقرر تک اُس کی خیر وبرکت سے لوگ متمتع ہوئے مگر ختمی مرتبت ﷺ کو ایسا دین عطا ہوا کہ جو دائمی رحمت اور لازوال خیر کا منبع ہے جس

کے ہوتے حسب ادیان منسوخ ہوئے اور جس کے بعد کسی اور نعمت کا تصور بھی باقی نہ رہا۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (ال عمران: 85)

اسلام یعنی دین مصطفویٰ ﷺ کے سوا جو شخص کوئی اور دین چاہیے تو اُس پر واضح رہنا چاہیے کہ غیر از اسلام کچھ قبول نہ کیا جائے گا۔ لوگ تو اولاد کی نسبت سے وقتی تسکین چاہتے ہیں مگر آپ کو ابدالاباد تک کا ثبات حاصل ہوا کہ جسے کبھی زوال نہیں، پیغام الٰہی ایک نعمت ہے، زبور، تورات، انجیل اللہ تعالیٰ کے کرم کے مظاہر تھے مگر قرآن کے نزول سے انسانیت کو ایک ایسی نعمت ملی، جو دائمی بھی ہے، ہمہ گیر بھی ہے اور بے مثل وبے عدیل بھی، جس کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داری خود پروردگار عالم نے اپنے ذمے لے لی ہے اور جس کے اندر باطل کا کوئی گزر نہیں۔

لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (فصلت: 42)

''جس کی زبان عربی مبین ہے اور جس کے اندر کائنات کے مجموعی علوم ودیعت کردیئے گئے۔

لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام: 59)

کہ ہر خشک وتر کا علم اس کتاب مبین میں ہے۔

شہر وہ ملا جوام القریٰ کہلایا، مسکن وہ بنا جس کے تقدس کی خود قرآن نے قسمیں کھائیں۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ (البلد: 201)

کہ ہم اس بلد مقدس کی قسم اٹھاتے ہیں اس لئے کہ آپ اس میں رہتے ہیں۔

معجزات کی نوازش ایک شرف ہے ہر نبی کو معجزات عطا ہوئے مگر نبی اکرم ﷺ

کے معجزات کا شمار مشکل، معراج معجزات میں سرفہرست ہے یہ وہ سربلندی ہے کہ جس کے آگے رفعت کا تصور محال ہے۔ ''مقام قرب'' سے بڑھ کر کونسی بھلائی ہے جو آپ کو ''قاب قوسین'' کے حوالے سے عطا ہوئی ہے، خاندان کی عظمت کہ پوری کائنات میں منتخب ہے۔ صلب طاہر اور رحم مطہر کی نجابت کا مثیل ناممکن ہے، ازواج وہ جن کا لاحقہ ہی مطہرات ہے جن کے بارے میں قرآن مجید کی گواہی ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (الاحزاب:32)

اے ازواج نبی ﷺ تم باقی عورتوں کی مثیل تو نہیں ہو۔

یہ تو متعلقات ذات کا جائزہ تھا خود ذات بابرکات منبع فیوض ہے، حسن صورت کہ

لَمْ أَرَ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ مِثْلَهُ (صحیح البخاری، کتاب اللباس عن انس رضی اللہ عنہ)

اُن جیسا نہ دیکھا گیا نہ دیکھے جانے کا امکان ہے۔

وَلَمْ تلد النساء قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ مِثْلَهُ (العقد الفرید الجزء الثالث ص581)

اُن جیسا نہ پیدا ہوا نہ کسی ماں سے ممکن کہ ایسا جنے۔

الغرض حسن صورت ہو کہ حسن سیرت، اوصاف ذاتی ہوں یا خصائص نبوی، کسی لحاظ سے بھی آپ کی ذات کو دیکھا جائے خیر و برکت اور نوازش و کرم کا وہ دمکتا منظر دکھائی دیتا ہے کہ دیکھنے والا کمالِ ذات کا دیوانہ اور سننے والا گفتار شیریں کا شیدا ہو جاتا ہے۔

اس قدر خیر بھلا کسے عطا ہوئی ہے، ''خاندان'' کی مجموعی کوشش بھی کسی فرد کو وہ عظمت نہیں دلا سکتی جو آپ کو عطا ہوئی تو پھر اولاد نہ ہونے کا طعنہ کیا ہے کہ

دیا جا رہا ہے اولاد تو خیر کا ایک کم تر روپ ہے۔ انسان کو اپنی ذات کے لئے یہ بیساکھی عطا ہوتی ہے مگر کیا یہی شرفِ انسانیت ہے کہ نسلی تسلسل پر انسانی عظمت کی بنیاد رکھ دی جائے، حضور اکرم ﷺ کے صاحبزادوں کا تا دیر زندہ نہ رہنا شاید اللہ تعالیٰ کی اُس حکمت کا حصہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی کامیابی و کامرانی کو کسی مادی واسطے سے متعین کرنے کی کوشش نہ کی جائے، سورہ الکوثر کی پہلی آیت نے خیر کا مفہوم مادیت سے اٹھا کر روحانی اقدار تک بلند کر دیا، دوسری آیت میں اس سربلندی پر خالق کائنات کے سامنے نیازمندی کا درس دیا گیا اور تیسری آیت میں اُس دریدہ دہن کو ابتر کے درست مفہوم سے آشنا کرنے کے لئے عبرت گاہ بنا دیا گیا۔ صاحبزادے کی وفات پر مسرت کا اظہار کرنے والوں کو بتا دیا کہ خیر کثیر کیسے عطا ہوتی ہے کہ زمین کا ہر گوشہ اُن کے ذکر سے عبارت ہے اور فلک پر اُن کی عظمت کے ترانے ہیں۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے خوب کہا تھا۔

وَشَقَّ لَهُ مِنِ اسْمِهِ لِيُجِلَّهُ
فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَهٰذَا مُحَمَّدٌ
وَضَمَّ الْاِلٰهُ اسْمَ النَّبِيِّ اِلَى اسْمِهٖ
اِذْ قَالَ فِي الْخَمْسِ الْمُؤَذِّنُ أَشْهَدُ

دیوان حسان رضی اللہ عنہ

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

(سورۃ القلم:4)

اسلام نظام اخلاق کی اُس پختگی اور استقامت کا داعی ہے جس کے نافذ ہونے سے انسان کی فطرتِ سلیم کی نشوونما ہوتی ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ اس میں خارجی احکامات سے کہیں زیادہ داخلی قوتوں پر اعتماد جاتا ہے۔ خُلق داخلی قوتوں کی ہیئتِ راسخہ کا نام ہے، جس سے تمام اعمال پابند آداب ہوجاتے ہیں۔ علماءِ لغت کے نزدیک خُلق اپنے بنیادی مفہوم میں خَلق کا مترادف ہے مگر اپنے ظہور میں قدرے متفاوت خصائص کا حامل ہے، خلق ظاہری پیکر کی ساخت ہے اور خُلق باطنی داعیات کی صورت گری کی قوتِ نافذہ ہے جس سے اعمال صالحہ بلاتکلف صادر ہوتے ہیں۔ خُلق شجرِ اعمال کی جڑ ہے اس کے بغیر اعمال وافعال کے تمام برگ وبار بے توفیق ہوجاتے ہیں۔ انسان کے کردار وسیرت کی راستی اسی کے حوالے سے متعین ہوتی ہے جو جتنا بلند خُلق ہوگا اسی قدر اس کے کردار میں پختگی آجائے گی اور جسے اخلاق کی ہر بلندی کا حوالہ اور خُلق کی عظمت کا استعارہ بننا تھا اسے صاحب خُلق عظیم کا منصب بلند عطا ہوا۔ قرآن جو کتابِ حکمت بھی ہے اور مصدرِ اخلاق بھی، اعلان کرتا ہے کہ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کہ بے شک آپ عظیم خُلق کے مالک ہیں، آنحضرت ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کا اظہار آپ کے تمام اعمال میں ہوا۔ حیاتِ طیبہ کا ایک لمحہ بھی ایسا نہ رہا جس میں خُلق کی عظمت اپنا اثر نہ دکھا رہی

ہو۔ داخل اس قدر قوی تھا کہ خارج کی ہر جنبش پر اُس کی حکمرانی تھی، عموماً ایسا نہیں ہوتا اس لئے کہ ہر داعیٔ خُلق کسی پہلو یا کسی رخ کے حوالے سے ہی صاحب خُلق ہوتا ہے اور بعض دیگر گوشے اس دعویٔ خُلق کے مطابق نہیں ہوتے مگر ایک وجودِ مقدس ایسا بھی ہے جس نے اپنی ساری زندگی کو بنی نوعِ انسان کے سامنے پیش کردیا اور پھر بھی یہ دعویٰ کیا کہ میں نے تمہارے درمیان ایک عمر گزاری ہے۔ کیا تم لوگ بالکل بے بصیرت ہوگئے ہو کہ اپنی ہی بصارت پر اعتماد نہیں کرتے۔ اپنی ظالمانہ تنقید اور بے رحمانہ تحقیق کا ہر حربہ آزماؤ اور پھر بھی یہ وجود اپنے اعمال وافعال میں اپنی سیرت وکردار میں اپنے میلانات ورجحانات میں اور اپنی پسند وناپسند میں ایک منفرد اور بے مثل وجود دکھائی دے تو اعترافِ عظمت میں بخیل نہ بنو بلکہ اپنے خالق کے ارشادات کے عینی گواہ بن کر پکار اٹھو کہ بیشک یہ ذات گرامی خُلق عظیم کی حامل ہے۔ قرآن نصاب خُلق ہے تو صاحبِ قرآن معیارِ خُلق، جو قرآن کا منشا تھا وہ اس ذات پر پورا ہوا اور جو اس الہام کی مراد تھی وہ اس ملہم صادق میں بامراد ہوئی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پیکرِ خلق ﷺ کے شاہد ہیں، انہوں نے معاشرت ومعیشت میں ذات واجتماع میں اور عمل وردِ عمل میں مشاہدہ کیا۔ ہر رویہ اور ہر میلان اخلاقِ عالیہ کا امین تھا، خَلق میں غیرت شمس وقمر تو خُلق میں نازش ابنِ آدم وجود کے بارے میں صحابی رضی اللہ عنہ پکار اُٹھے۔

اَحْسَنُ النَّاسِ وَجْهًا وَّاَحْنَهُمْ خُلُقًا (بخاری کتاب المناقب)

کہ صورت میں سب سے حسین اور خُلق میں سب سے جمیل، لہجے میں صداقت شعار، وفا میں بے عدیل، حسنِ سلوک میں بے مثیل، گفتگو میں دل پذیر،

خاموشی میں پر وقار، کان حیا، بہادری میں یکتا، قناعت پسند، بلا کے سخی، الغرض ہر لحاظ سے بے مثال وعدیم النظیر ۔ ان جیسا نہ دیکھا گیا نہ دیکھے جانے کا امکان، جدھر سے دیکھیئے اور جس حالت میں پایئے مرقعِ حسن و جمال اور صاحبِ اوصافِ جمیل، میدان میں جرأت کا نشان مگر پیکرِ عفو و کرم، دوست کے لئے سراپا بخشش وسخاوت اور دشمن کے لئے ہمہ تن مہر و محبت، ہر لحاظ سے کامل، ہر انداز سے قابلِ تقلید اور ہر پہلو سے صاحب خلقِ عظیم، فرشتے ان کے ثناخوان اور قرآن ان کے اخلاق عالیہ کا مدح خوان الغرض

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

کا کامل نمونہ اور حسین پیکر کہ مخلوق ہو کر بھی خالق کا ممدوح

"عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ"

(التوبۃ:128)

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تشکیل میں ایک جوہر ودیعت کیا جسے جوہرِ محبت کہا جاتا ہے، یہی وہ اساس ہے جو ہر ذرے میں کشش کے فطری رجحان کا باعث ہے، زمین اپنی طرف کھینچتی ہے تو دیگر اجرام میں بھی جذب وانجذاب کی قوت کارفرما ہے۔ کائنات کے مختلف مظاہر کے ربط اور توافق کی بنیاد یہی ہے، یہ شعوری ہو یا غیر شعوری مگر قوت بہر حال ہے، انسان اشرفِ خلق ہے اس لئے اس میں یہ قوت کہیں بڑھ کر ہے، انسان کے ضمیر میں محبت، موانست اور معاشرت کی حس موجود ہے انسان معاشرہ میں رہنا چاہتا ہے، تعلقاتِ باہمی کا خواہاں ہوتا ہے اور روابط کی شائستگی اُسے اچھی لگتی ہے، محبت اُس کے اندر انشراح اور نفرت کبیدگی پیدا کرتی ہے، یہ حس اس قدر بنیادی حیثیت کی حامل ہے کہ ایک بے شعور بچہ بھی اس کا واضح احساس رکھتا ہے، اُسے محبت کی نظر اور نفرت کی نگاہ کا فرق معلوم ہے، ایک شیرخوار بچے کا یہ رویہ ہی دلیل ہے کہ محبت کی زبان آفاقی ہے، ہر انسان کو اس کا شعور بھی ہے اور وہ اس کا طلب گار بھی ہے، محبت کے مظاہر مختلف ہو سکتے ہیں مگر جذبہ اور جوہر ایک سا ہے، ماں کی محبت مثالی ہے، دوسری محبتیں اس کے حوالے سے جانچی جاتی ہیں مگر اپنی جان سے محبت اس سے بھی فزوں تر ہے، ہر انسان کو اپنے وجود سے پیار اور اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے وہ اس کی حفاظت اور مناسب نمو کے لئے تگ ودو کرتا ہے آرام کی

طلب اسی کا مظہر ہے سکون کی تلاش کا مقصود بھی یہی ہے کوئی مرنا نہیں چاہتا کہ وجود کی نفی کا خوف ہے بعض اوقات یہ محبت شدید تر شکل میں خودنگری بن جاتی ہے جسے خود پسندی یا نرگیست بھی کہتے ہیں، اس صورت میں یہ صحت مند جذبہ کا غیر صحت مندانہ اظہار ہوتا ہے، حفاظت وصیانتِ نفس ایک مستحسن اور فطری جذبہ ہے مگر کسی اور کے عدم تحفظ کی قیمت پر نہیں، ان محبتوں میں توازن پیدا کرنے کی ضرورت انسانی اعمال وکردار کی سلامتی کے لئے ضروری ہے، سوال یہ ہے کہ ایسی میزان کون مہیا کرے؟ ظاہر ہے وہی ایسا کر سکے گا جو سب سے محبت کرنے والا ہوگا اور کسی سے نفرت نہ کرتا ہو دو بھائیوں کے مفادات ٹکرا جائیں تو شفیق باپ ہی رفعِ تصادم کا وسیلہ بن سکتا ہے کہ اُس کی نظر میں دونوں کے لئے محبت ہے، انسان اپنے فکر کو جس قدر آفاقیت آشنا کرے گا قرب بڑھے گا اور بُعد کی دیواریں گریں گی، رحیم وکریم رب نے انسان کو اس اساسِ وحدت کا شعور دیا ہے اور ایک وجود ایسا بھی تخلیق کیا ہے جو سب کے لئے یکساں پیار کرنے والا ہے تا کہ اُس کا ہر رویہ تصور محبت کو جلا بخشے، نبی کا وجود ہمہ جہتی فلاح کا ضامن ہوتا ہے کہ وہ معاشرتی راہنمائی بھی مہیا کرتا ہے اور تحفظ ذات اور محبت خویش کے آداب بھی سکھاتا ہے وہ خود عزیز تر ہوتا ہے اس لئے سب کی محبتوں کا مرکزی وجود اُسی کی ذات ہوتی ہے، سب اُس سے محبت کے مکلف ہیں کہ محبت کو ایسی بلند نظری درکار ہے جس میں پریشان نظری کا داغ نہ ہو، سب ایک کو مرکزِ محبت بنائیں کہ وہ ایک سب کے لئے سراپا محبت ہے اس طرح محبت اپنے ارفع اظہار میں وحدت آشنا ہوتی ہے، کہا جاتا ہے کہ محبت شراکت پسند نہیں کرتی اس لئے کہ وہ اپنے جوہر میں غیر منقسم ہے اور یہی ایمان ہے وگرنہ ہر دعویٰ صرف زبانی جمع

خرچ ہے۔ اسی کی جانب اشارہ کیا گیا کہ

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ)

"تم میں سے کوئی بھی اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اُس کی اولاد، اُس کے والد اور تمام انسانوں سے بڑھ کر اُسے محبوب نہ ہوجاؤں۔

جب یہ یک سوئی حاصل ہوتی ہے تو نفسانی خواہشات بھی پامال ہوجاتی ہیں اسی لئے فرمایا گیا۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ۔

(کنز العمال جلد اول ص:217)

"تم میں سے کوئی اُس وقت تک مومن نہ ہوسکے گا جب تک اُس کی خواہشات میرے لائے ہوئے احکام کے تابع نہ ہوجائیں۔

خواہش پر ہی کیا موقوف جان تک اُن سے عزیز تر نہیں، وہ ذات اپنے وجود سے بڑھ کر محبوب ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض دیا تھا کہ آپ اُن کی جان کے سوا سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ ایمان مکمل نہیں ہوا جس پر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جان تک سے عزیز تر ہونے کا اعتراف کیا تو فرمایا اے فاروق اب ایمان کامل ٹھہرا۔

(صحیح البخاری کتاب الایمان والنذر)

قرآن مجید نے نہایت وضاحت سے فرمایا۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (الاحزاب:6)

"نبی مومنوں کی جانوں سے زیادہ محبوب ہیں۔

معلوم ہوا کہ نبی رحمت ﷺ سب مومنوں کے ایسے محبوب ہیں کہ اُن سے قریب تر اُن کی اپنی جانیں بھی نہیں، ذات سے قریب تر اور وجود سے بڑھ کر لائق محبت، یہ تقاضائے ایمان بھی ہے اور شرفِ انسانی کی شناخت بھی، آفاقی مرکز محبت ہی کا مقام ہے کہ وہ رحمتِ عالمین ہو، کہ محبت یک طرفہ عمل نہیں، سب اُن کو چاہیں اور وہ سب کو، سیرت رسول ﷺ کا ہر قاری جانتا ہے کہ اس مرکز مہر ووفا کو انسانیت سے کس قدر تعلق اور محبت تھی، رشتۂ محبت کی استواری اور استحکام کا اندازہ لگانا ہو تو غاروں کی تنہائیوں سے لے کر عرشِ اعظم کی خلوتوں تک کا سفر کرنا ہوگا، محبت کا نقش ہر کہیں فروزاں نظر آئے گا۔

محبت کیا ہے؟ ایک قلبی تعلق جس کے مظاہر ہر دیکھنے والی آنکھ کے سامنے جلوہ فشاں ہوں، حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاؤں میں کانٹے کا چھبنا بھی اُنہیں گوارا نہیں اور پھر جان دے کر پرچم محبت کو سربلند رکھنا اس تعلق کی زندہ مثال ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر غم والم کے پہاڑ ٹوٹے جن کا بھلا مقصود تھا وہ سنگ زنی کرتے رہے، جن سے پیار کیا تھا وہ رگِ حیات کاٹنے کی سازشیں کرنے لگے مگر محبت کا رشتہ نہیں ٹوٹا، لاتعلقی کا اظہار نہیں ہوا عذاب کی خواہش لئے ہوئے ہاتھ بلند نہیں ہوئے وہ رحمت کائنات بھولنے والوں کو بھی نہ بھولا اور اُس رحیم وکریم آقا نے دکھ دینے والوں کو بھی نظر انداز نہ کیا، اپنوں کو چاہا تو دشمنوں کو بھی گلے لگایا اور اگر کہیں مفادِ عام اور اصلاح حال کے لئے آپریشن بھی کیا تو دُکھی دل کے ساتھ، مخاصمت کا خنجر کبھی نہ چلایا۔ تعمیر کا نشتر ضرور استعمال کیا، پاؤں میں اٹکے ہوئے کانٹے کو نکالتے وقت تکلیف ہوتی ہے مگر مہربان ماں اس تکلیف پر کانٹا

اٹکا ہوا نہیں چھوڑتی، اُسے خود دکھ کا احساس ہو رہا ہوتا ہے مگر وہ لمحوں کو صدیوں پر قربان کر دیتی ہے نبی اکرم ﷺ کی محبت تو اس مامتا سے بھی بڑھ کر ہے، آپ نے دن رات مجموعی مفاد کی خاطر محنت کی، اصلاحِ احوال کا اہتمام کیا اور بہر طور نورِ محبت کو عام کیا، ہاں کبھی تلوار اٹھائی تو مقصود اصلاح ہی تھی، غلط کاری کی فصل کاٹنے کا اہتمام شجرِ ثمر دار کی پرورش ہی تھا، کسان جب ناکارہ اور الجھی ہوئی شاخیں کاٹتا ہے تو مقصد شجرِ سایہ دار کی تہذیب اور حفاظت ہی ہوتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٨﴾ (سبا:28)

’’اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر مبعوث کیا۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔‘‘

رسولِ عالمین کی حیثیت سے آپ کے مخاطب پوری نوعِ انسانی ہے، آپ سب کے لئے بشارت لے کر آئے، ہاں اگر کوئی شرفِ انسانی سے بغاوت کرے تو اُس کے لئے متنبہ کرنے والے اور ڈرانے والے ہیں تاکہ وہ بغاوت سے باز آئے اور بشارت کا مستحق ٹھہرے۔ بشارت دینا یا ڈرانا جب ایک ہی وجود کے خصائص ہوں تو محبت کے مظہر ہوتے ہیں کہ خوف ورجاء ہی انسان کے لئے جادۂ مستقیم کی نوید ہے۔ رسول عالمین ﷺ رحمت عالمین ﷺ بھی ہیں ارشاد ہوا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء:170)

’’ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔‘‘

رسالت دراصل مجسم رحمت ہے کہ یہ انسانیت کی بھلائی، بہتری اور سلامتی کے لئے کوشاں رہنے کی ارفع ترکیفیت ہے، رحیم وکریم کی دعوت تو فلاح کا پیغام ہے مگر انسان مجموعہ اضداد ہے وہ بسا اوقات محسنین کی قدر نہیں کرتا اور کج روی سے اپنا بھلا چاہنے والوں کے خلاف نبرد آزما ہوجاتا ہے۔ کذب منہ زور ہو تو صداقت کے منہ آنے لگتا ہے، برائی خود سر ہوجائے تو نیکی کو چیلنج کرنے لگتی ہے۔ اندھیروں کے پرستار نور ہدایت کو بجھانے کے درپے ہوتے ہیں۔ یہ کم نظری کا شاخسانہ اور ظلمت پسندی کا مظاہرہ ہوتا ہے ایسے حالات مصلحین کے لئے امتحان ہوتے ہیں کہ مخالفت کی لہرائی ہوئی آندھی اُنہیں کیسے ردعمل پر ابھارتی ہے، دنیا میں کئی مثالیں موجود ہیں کہ اصلاحِ احوال کے مدعی بادِ مخالف کی تندی سے گھبرا کر خود اُسی سطح پر اُتر آتے ہیں، کرب کی انتہائی صورت میں قاسم رحمت کا کردار برقرار رکھنا صرف انبیاء کرام علیہم السلام کا شیوہ ہے اور اس کا بلند ترین مقام نبی رحمت ﷺ کو حاصل ہے کہ دشمنی کی یلغار اور مخالفت کی بھیانک فضا میں بھی رحمت کا علم بلند رکھا، دشمن کا دکھ بھی محسوس کیا اور محبت کے پھول بھی بکھیرے، سب کا دکھ وہی محسوس کرسکتا ہے جس کی نسبت سب سے ہو اور جس کا حوالہ رحمت ہو، حدیث مبارک میں اس کا اظہار یوں فرمایا کہ لوگ دوزخ میں گرنے کا سامان کر رہے ہیں مگر آپ کمر سے تھام تھام کر دوزخ سے بچانے کا اہتمام کر رہے ہیں ظاہر ہے دوزخ میں تو بدعمل جارہے ہیں مگر رسولِ رحمت ﷺ اُن کے لئے بھی بے چین ہیں اسے رحمتِ تمام کہتے ہیں اور یہی وہ سرافرازی کا نقطہ کمال ہے جس کی جانب قرآن مجید اشارہ کر رہا ہے۔ ارشاد ہوا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ

عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢٨﴾ (التوبہ:128)

"بے شک تمہارے پاس رسول رحمت تشریف لائے جو تم میں سے ہیں اور جن پر تمہاری تکلیف شاق ہے وہ تمہارے لئے (کامیابی ونجات) کے خواہش مند ہیں اور مومنوں کے لئے مہربان اور رحم کرنے والے ہیں"۔

عَنَت، مشقت اور شدت کو کہتے ہیں، آیت کریمہ میں صفاتِ حضور ﷺ کو تین حصوں میں بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ اے بنی نوعِ انسان تمہاری ہر تکلیف اور تمہارا ہر دکھ آپ کو گراں گزرتا ہے۔ ما کی عمومیت بتا رہی ہے کہ دکھ کسی قسم کا ہو، کسی طریق سے پہنچے اور جیسے بھی لاحق ہو آپ پر شاق ہے، کوئی تکلیف دے تو بھی اور تم خود ہی تباہی کا سامان کرو تب بھی، دل رحمت پر اضطراب کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اللہ اللہ، ایسا رحیم وکریم نبی کہ پریشانیاں ہم خود سمیٹیں مگر دھڑکن وہاں پیدا ہو، بداعمالیوں کے ذریعے اپنا مستقبل ہم تاریک کریں مگر اجالنے کے سامان وہاں ہوں، یہ ہے بے پایاں رحمت، پھر یہی نہیں کہ دکھ کا احساس ہے اور بس، نہیں نہیں بھلائی کا ارمان بھی ہے اور فراہمی آسائش بھی مقصود ہے، دکھ پر کرب ہے کہ ختم ہو اور سکھ کی خواہش ہے کہ حاصل ہو، مگر کیا یہ احساسِ کرب اور خواہشِ رحمت کافی ہے؟ نہیں، نبی رحمت کی جولاں گاہ اسی قدر نہیں، آپ کی خواہش تو عمل کے قالب میں ڈھلتی ہے کہ آپ نشانِ رحمت ہی نہیں قاسم رحمت بھی ہیں، یہ تو رحمت کے وصول کرنے والوں کا ظرف ہے کہ کون اس رحمت سے فیض یاب ہوتا ہے، بادِ نسیم کی جانفزا مہک عام ہے مگر اس سے لطف وہی اٹھاتے ہیں جنہیں لمس اور شامہ کی قوتیں حاصل ہوتی ہیں سورج کی

ضیا پاشیاں تو سب کے لئے ہیں مگر اندھے کی محرومی اُس کی بے بصارتی کا نتیجہ ہے اسی طرح رحمتیں بانٹنے والے رسولِ محبت ﷺ کی رحمت عام ہے مگر بدعقیدگی کی خودسری اور بدعملی کی بے راہ روی اس چشمۂ فیض سے محروم کرنے کا سبب بنتی ہیں۔

''مَا عَنِتُّمْ''میں ہر دکھ شامل ہے، دنیا کی مصیبتیں، معاشرتی الجھنیں، معاشی ناہمواریاں، اخلاقی وعملی بدکرداریاں اور روحانی پستیاں حتکہ اُخروی عذاب وسزا، حضور اکرم ﷺ نے ان سب پریشانیوں سے نجات کا پیغام دیا آپ نے سب کے لئے بچاؤ کے راستے متعین کئے، دین کی کاملیت، رحمتِ کامل ہی کا مظہر ہے، جہاں جہاں بھٹکنے کا خدشہ ہوسکتا تھا وہیں کامل راہنمائی عطا کردی تاکہ دکھ کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ فضائل اعمال کا ہر انداز بتایا کہ دنیا وآخرت کا سکون مقدر بنے، بعض مفسرین نے آیت کریمہ کے مدلول کو آخرت کی جزاوسزا تک محدود کیا ہے اور کہا ہے کہ:

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ اَنْ تَدْخُلُوا النَّارَ وَحَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ

(تفسیر قرطبی)

''کہ آپ پر یہ شاق ہے کہ تم دوزخ میں جاؤ اور آپ کو خواہش ہے کہ تم جنت میں داخل ہو''۔

یہ مفہوم نتائج کے آخری مرحلے کی خبر دے رہا ہے کہ سب تگ ودو اسی نقطہ پر مرکوز ہے مگر یہ مفہوم کی آخری کڑی ہے جس کے بے شمار پہلو اس سے پہلے بھی موجود ہیں آپ پر شاق ہے کہ کوئی بدعملی کا مرتکب ہو، آپ پر گراں ہے کہ کوئی راہ راست

سے بھٹکے کہ بدعملی اور بے راہ روی، بالآخر دوزخ کا سزاوار بناتی ہے جس کی نظر انجام پر ہو وہ عمل کے ہر اقدام میں انجام کی جھلک محسوس کرتا ہے اس لئے وہ نتیجہ تک جانے سے پہلے اس کا درد محسوس کرلیتا ہے، زہر کا گھونٹ نہ جانے کب انجام تک لے جائے مگر دانا اس کے ابتدائی عمل ہی میں انجام دیکھ لیتے ہیں، نبی اکرم ﷺ کی نظر آخرت کے ثواب وعذاب پر ہے اس لئے آپ انسانی اعمال وکردار کو اسی حوالے سے دیکھتے ہیں اور جو عمل عذاب کی طرف بڑھ رہا ہو اُس سے بچنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

رحمت عالمین ﷺ مائل رحمت وجود رکھتے ہیں، قاسم رحمت آپ کا منصب اور رحمت تمام آپ کا اعزاز ہے، ضرورت صرف یہ ہے کہ اس رحمت کی دہائی دی جائے حضورِ رحمت، نجات دائمی کی تمنا لئے حاضر ہوا جائے اور یقین رکھا جائے کہ

سرکار کے اشارہ آبرو کی دیر ہے
اُمت کھڑی ہے دفترِ عصیاں لئے ہوئے

اور رویہ یہ رہے کہ ہر دکھ درد میں اُن کی بارگاہ کی جانب نظر اٹھے کہ اُن کا وجود طالب رحمت کا متلاشی رہتا ہے کسی نے خوب کہا تھا۔

مصیبتوں میں گھرا دیکھتا ہوں جب دل کو
پکارا اپنے نبی کو پکار کہتا ہوں

اللہ کرے یہ پکار نجات کا پیغام بنے اور سب رحمت حضور ﷺ سے فیض یاب ہونے کی توفیق پائیں۔ آمین

سِرَاجًا مُّنِيرًا

محبت کا تقاضا ہے کہ محبوب کو خوبصورت ناموں اور حسین القاب سے یاد کیا جائے، آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی، کائنات کی محبوب ترین ذات ہے اس لئے ہر عقیدت مند اپنی محبت کے اظہار کے لئے نئے سے نئے اور حسین سے حسین تر ناموں سے آپ کو یاد کرتا ہے۔ قرآن مجید کے اسلوبِ خطاب نے اس شوق کی آبیاری کی ہے، قرآن وحدیث میں اسماء رسول ﷺ کی ایک طویل فہرست موجود ہے، ان اسماء سے نبی اکرم ﷺ کی بیمثال شخصیت اور آپ کی بے عیب سیرت کے کئی رخ نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ صفاتی نام قاری وسامع کو آپ ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کے مشن کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ سورہ احزاب میں ایک آیت کریمہ میں متعدد ناموں کا ذکر ہے جن سے آپ ﷺ کے منصب کی عظمت، ہمہ جہتی اور اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اے نبی بیشک ہم نے آپ کو گواہی دینے والا۔ بشارت دینے والا، ڈرانے والا، اللہ کے اذن سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے"۔ آیت میں خطاب نبی کی حیثیت سے ہوا اور بحیثیت رسول تشریف لانے کے تذکرے میں اس رسالت کی عظمتوں کا حوالہ دیا گیا کہ آنے والا شاہد ہے کہ حق وباطل کی نشاندہی پر سراپا شہادت ہے، مبشر ہے کہ اطاعت گزاروں کو روشن مستقبل کی بشارت دیتا ہے، نذیر ہے کہ سرکشوں کے بھیانک انجام کی وعید سناتا ہے داعی الی الحق ہے کہ اب دعوت وارشاد کا مرکزی وجود وہی ہے، ان

صفات کاملہ سے متصف وجود اس قدر محترم ہے کہ حق کی روشنی کا ابدی نشان وہی ہے اس لئے اب کسی ابہام یا غلط فہمی کی شکایت نہ کی جا سکے گی۔

سراج، چراغ بھی ہے کہ گھر گھر اُس کی روشنی ہے اور سورج بھی ہے کہ کُل جہاں اُسی سے منور ہے، سراج تو روشن ہے ہی منیر نے اُس کی روشنی عطا کرنے والی حیثیت کو بھی نمایاں کر دیا ہے، سراج منیر کی نسبت حضور اکرم ﷺ کی ذات کی طرف ہے اس سے یہ حقیقت واضح کی جا رہی ہے کہ رسول محترم، ہدایت وراہنمائی کی کاملیت کا مظہر ہیں نورِ ہدایت پہلے بھی تھا مگر تاریکی کسی نہ کسی بہانے اور زاویئے سے شب خون مارتی رہی ہے جس سے حیلہ جو انسان فرار کی راہیں تلاش کرتے رہے ہیں کبھی نامکمل ہدایت کا گلہ کیا گیا تو کبھی غیر واضح راہنمائی کے شکوے ہوئے، بعثت رسول ﷺ کے ساتھ ہدایت اپنے کمال کو پہنچی تعلیمات مکمل ہوئیں اور سلسلہ نبوت منقطع ہوا اس لئے اب ابہام باقی نہ رہے گا، اندھیرے چھٹ جائیں گے اور ظلمت کسی طور حملہ آور نہ ہو سکے گی ارشاد ہوا کہ رسول معظم ﷺ آسمانِ ہدایت کے آفتاب ہیں، اب پوری روشنی ہے، اب کوئی عذر کہ ہدایت واضح نہ ہوئی ہے قابلِ قبول نہ ہوگا فرمایا آپ ﷺ سراج ہیں کہ اب گھر گھر انہی کا نور ہوگا، خود سراپا نور ہیں کہ شخصیت کی جلا سے اپنے اور بیگانے سبھی فیض یاب ہو رہے ہیں تعلیمات میں کوئی اندھیرا نہیں ہمہ نور ہیں اور یہ منور تعلیمات، نورِ رسالت کی اثر آفرینی سے ہر قلبِ تاریک کو جہانِ نور بنا رہی ہیں، یہ ہدایت کا سورج ہے جو خود روشن ہے اور روشن کرنے والا بھی ہے، اس وجودِ نورانی کی جلوہ نمائی پر عالم انسانیت یوں دمک اٹھا ہے جیسے سورج طلوع ہونے پر کائنات چمک اٹھتی ہے۔

سراج منیر سے باطن کی روشنی، ایمان کا نور اور یقین کی ضیاء مراد ہے تو مفہوم یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی تعلیمات قابل فہم واضح اور غیر مبہم ہیں اور یہ بھی کہ وہ ذاتِ اقدس اپنے کردار کی جلا اور شخصیت کی مہک کے اعتبار سے بہر پہلو منور ہے، اس آفتاب کا کوئی پہلو تاریک نہیں یہ بہر جانب نور بکھیرنے والا وجود ہے یہ روشنی آپ ﷺ کی ذات کا حصہ بھی ہے اور پیغام کا بھی، اس سے ہدایت کی روشنی بھی مراد ہے اور وجودِ مقدس کی ظاہری نورانیت بھی، بے عیب وجود حسین وجمیل پیکر اور منبع نور چہرہ انور بھی قرآن مجید کی آیت کا مصداق ہے اس نورانیت کی جھلک دیکھنا ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھئے کہ وہ چہرہ انور کیا تھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے حسین تر کسی کو نہیں دیکھا، یوں لگتا جیسے سورج آپ کے چہرہ اقدس میں متحرک ہے''۔ (جامع الترمذی ابواب المناقب) حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ''آپ ﷺ جب بھی مسرت کا اظہار فرماتے تو چہرہ یوں دمک اٹھتا جیسے چاند کا ٹکڑا ہو'' (صحیح البخاری کتاب المناقب) کسی نے سورج کہا تو کسی نے چاند، حق تو پھر بھی ادا نہ ہوا کہ وہ روئے زیبا بے مثل ہے، قاضی عبدالمقتدر تھانیسری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ ﷺ کے حسن وجمال کا یہ عالم ہے کہ جب بھی سورج آپ ﷺ کی جانب نظر کرتا ہے تو پکار اٹھتا ہے کہ کاش یہ نور مجھے حاصل ہوا ہوتا'' (نزھۃ الخواطر الجلد الثانی ص: 75) ایسا کیوں نہ ہو کہ آپ ﷺ باطن کے آفتاب تھے دلوں کو نورِ ایمان سے منور فرما رہے تھے اور حسن وجمال کے خورشید پیکر تھے کہ نظروں کو خیرہ کر رہے تھے۔ ظاہر وباطن میں سراپا نور وجود ہی قرآنی لقب ''سراج منیر'' کا مستحق ہے۔

الکریم

حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی اخلاق وشمائل کی اُس بلندی کی حامل ہے جس سے ورٰی کسی عظمت ورفعت کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے قرآن مجید میں خود کائنات جن وبشر کے خالق نے واضح فرمایا کہ آپ کا مرتبہ ومقام یہ ہے کہ

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ (سورۃ القلم:4)

بے شک آپ صاحب خلق عظیم ہیں۔

اخلاق عالیہ کی ہر عظمت پر آپ کی سطوت قائم ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے خود ارشاد فرمایا کہ۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ اَنْ اُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (مسند احمد)

میری بعثت کا مقصد ہی محاسنِ اخلاق کی تکمیل ہے۔

انسانی سرشت میں جو خوبی ودیعت ہے اور جس کا وجود ممکن ہے وہ سب خوبیاں اس وجود مقدس میں جلوہ گر ہیں بلکہ اب کسی اچھائی یا خوبی کا معیار یہ ہے کہ وہ آپ کی ذات میں ہے اس سے بڑھ کر بشری وجود میں کوئی حسن نہ متوقع ہے نہ ممکن۔

اسماء النبی ﷺ درحقیقت انہیں محاسن کے نام ہیں تاکہ تفہیم کے لئے اوصاف وکمالات کو متعین نام دے دیا جائے اور اُس کے حوالے سے ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے کسبِ فیض کی سعی کو آسان بنایا جائے، آپ کے متعدد اسماء قرآن مجید، احادیث

اور کتب سیر میں روایت ہوئے ہیں ہر اسم ذات کے کسی خاص پہلو اور متعین حسن کی نمائندگی کرتا ہے ان میں بعض اسماء آپ کے منصب رسالت کی توضیح کے حوالے سے ہیں۔ بعض روحانی عظمت اور مقام کی رفعت کے حوالے سے اور بعض دیگر معاشرتی تعلقات اور سماجی منزلت کی نشاندہی کے طور پر استعمال ہوئے ہیں ''رحیم'' آپ کا وصفی اسم اُس رحمت بے پایاں کو واضح کر رہا ہے جس کا صدور دنیا و آخرت میں یکساں ہے، یہ قلبی کیفیت اور اُس کے خارج میں ظہور کے اطراف کو محیط ہے لیکن ''الکریم'' کا تعلق آپ کے اُن محاسنِ اعمال سے ہے، جن کا وقوع خارج کی دنیا میں ہوا ہے۔

''الکریم'' آپ کے اسماء میں سماجی مظہر کا آئینہ دار ہے۔ یہ ''کرم'' سے مشتق ہے اور کرم انسانی فطرت کے حوالے سے اُس اخلاقی قوت کا نام ہے جس میں معاشرتی بہبود اور اصلاحِ افراد و اجتماع کے لئے افعال سرزد ہوتے ہیں اس صفت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کسی معاوضے کے طور پر ظاہر نہیں ہوتی بلکہ یہ صاحبِ کرم کے داخل کا طبعی میلان اور فطری جھکاؤ ہے جو ایسے افعال پر مجبور کرتا ہے جس سے دوسروں کو آرام، سکون اور راحت نصیب ہوتی ہے یہ دراصل وہ قوت ہے جس سے انسان انسان کے قریب آتا ہے اور اُنس، یگانگت اور اپنائت کا احساس جنم لیتا ہے جب یہ کلمہ ذات باری کی طرف منسوب ہے تو اُس سے احسان اور انعام خداوندی مراد ہوتے ہیں مگر جب یہ انسان کی صفت یا اسم کے طور پر استعمال کیا جائے تو اُن اخلاق و افعال کی نشاندہی کرتا ہے جو سر بسر محمود ہیں اور جن کا ظہور ہو رہا ہے کرم معاشرتی اظہار چاہتا ہے اس لئے بعض اوقات اس میں داخلیت کا عنصر نمایاں نہیں ہوتا۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ اعمال و افعال کا ظاہر کرم شمار کیا جائے مگر انسان کا باطن اُس

میں فعال کردار ادا نہ کر رہا ہو حدیث مبارک میں مہمان کی تکریم کا حکم ہے اگرچہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو تو اس سے خالصتہً معاشرتی پہلو ہی مراد ہے لیکن عموماً کرم رحم کا ظاہر ہے، دل میں رحمت کا جذبہ جب اپنی شدت میں اظہار کا طالب ہوتا ہے تو کرم کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔ کرم ایک مستحسن وصف ہے اور جن میں یہ وصف اپنی پوری قوت اور حسن کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے وہ اللہ کے فرماں بردار بندے ہیں جنہیں قرآن مجید عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ یعنی مکرم بندے کہہ کر تعریف کرتا ہے۔ قرآنی ارشادات کے مطابق اکرم وہی جو اتقیٰ یعنی زیادہ پرہیز گار ہو۔ تقویٰ کے مدارج میں اعلیٰ ترین مرتبہ جناب رسالت مآب ﷺ کو حاصل ہے اس لئے اکرمیت کا وصف بھی سب سے زیادہ آپ ہی کو سزاوار ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ ظاہرہ کا ہر لمحہ مطلع کرم بن کر نمودار ہوا ہے۔ پوری زندگی گواہ ہے کہ ہر موقع پر طبیعت کی فیاضی کا ظہور ہوا گنا گار کو سزا دینا عدل ہے مگر اہل مکہ کے گناہوں کی طویل فہرست کے باوجود عام معافی کا اعلان کرم ہے۔ سب سے بڑے دشمن پر اُن کا کرم اور بڑھ جاتا ہے کہ کرم منصب کے مطابق اور قابلِ احساس حد تک ہونا ہی مناسب ہے۔ ''الکریم'' کی ذات میں کرم فرمائیوں کی مختلف جہتیں مجتمع ہوگئی تھیں، فیاضی، بردباری، عنائت بخشش، عفو، درگزر، احسان اور نوازش کی کوئی صورت نظر انداز نہ ہوئی کہ یہ بخشش اور یہ کرم گستریاں مجبوری نہ تھیں اور نہ ہی مقابل کی ضرورت کے طور پر تھیں بلکہ یہ تو اپنی سرشت اور مزاج کا اثر تھا۔ اسی لئے تو اُن پر بھی کرم ہوتا رہا جو بظاہر مستحق نہ تھے کہ یہ فیض بخشی اپنے ظرف کے

مطابق تھی مالِ غنیمت کا ڈھیر ہو تو بھی فیاض طبیعت سب کچھ لٹانے کا فیصلہ کرتی ہے اور جان کے دشمن سرخمیدہ سامنے ہوں تو بھی عفو وکرم کی نوید ہی سنائی جاتی ہے۔ پتھر مارنے والوں پر دعاؤں کی بارش رحیم وکریم ذات کی عظمت کا مظہر ہی تھا اور آج تک بے راہ روی اور بدکرداری کے باوجود اللہ کے عذاب سے محفوظ رہنا بھی اُسی کریم کے صدقے سے ہے۔ ''اَنْتَ فِیْھِمْ'' تو ان میں ہے اسلئے ایسے کریم کے ہوتے ہوئے عذاب کیسے نازل کیا جاسکتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی صفت کریمیت آپ کے صحابہ کرام میں منعکس ہوئی تو اُن سے کرم کا بے پناہ صدور ہوا یہ رحمت آج تک بٹ رہی ہے خوش قسمت ہیں وہ افراد جو شانِ کرم کی خیرات پاتے ہیں اور انسانیت کا اعلیٰ معیار قائم کرتے ہیں اللہ کرے ایسی توفیق ہم سب کو حاصل ہو۔ آمین

اکمل الناس

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی تمام مخلوق سے افضل بنایا، احسن تقویم کا اعزاز بخشا اور

''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ'' (الاسراء:70)

یعنی بے شک ہم نے نسل آدم کو تکریم عطا کی کا شرف تفویض کیا، اعضاء وجوارح میں حسن تناسب سے سرفراز فرمایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس اشرفِ خلق کو عقل وشعور کی عظمت عطا کی یہ گہوارہ عالم اسی کی تگ ودو کا مسکن بنایا یہ اعلان تو دنیا پر آباد کرنے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا کہ

''وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ'' (البقرۃ:36)

اور تمہارے لئے اس سرزمین پر ٹھہرانے کا مقام یعنی قرارگاہ بھی ہے اور قیامت تک کے لئے سامان زیست بھی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس اہتمام کے ساتھ انسان کو زمین کا باسی بنایا گیا یہ تو انسان کی عمومی پزیرائی تھی، پھر ان میں انسانی عظمت کے حامل ایسے افراد بھی پیدا فرمائے جن کی منزلتوں کو خصوصی حوالہ عطا ہوا، اسی امتیازی حیثیت نے اس بلند مرتبت گروہ کو قافلہ انسانیت کا راہنما بنایا تاریخی تناظر واضح کرتا ہے کہ انسانی زندگی کے طویل سفر کے دوران میں ایسے برگزیدہ وجود بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیت اور عبقری صفات کی بنا پر قافلہ انسانیت کی راہبری کی اور نوع بشر کے خدوخال سنوارے، انبیاء کرام علیہم السلام ایسے ہی راہنما تھے جن کو فرستادہ خالق اور رضائے رب کا نمائندہ ہونے کا اعزاز

حاصل تھا، اس قافلہ احسان کے قائد، انسانی عظمتوں کے نقیب اور کاملیت کے پیکر حسین ہونے کا لقب پانے والے وہ نبی امی ﷺ ہیں جو پیغام بر اعظم، محسن کامل، سید البشر، خیر الرّسل اور رحمتِ عالمین ہیں آپ کے وجود اقدس نے ہر انسانی حوالے کو رفعتیں عطا کئیں، آپ ﷺ کا دائرہ اثر پوری انسانیت کو محیط ہے، انسان اپنی زندگی کے ہر نشیب وفراز میں آپ کی ذات گرامی سے نہ صرف یہ کہ حوصلہ پاتا ہے بلکہ عروج وارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے۔ پیکر انسانی کا تجزیاتی مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ہر انسان کسی وصف وعظمت کے حوالے سے پہچانا گیا ہے، کسی کے ہاں جسم وبدن کی راعنائی حد کمال کو چھو رہی ہے تو کسی کے رویوں کا حسن نمایاں ہے، مادی توانائی کسی کے لئے باعث شرف ہے تو کسی کے لئے زہد وتقویٰ کا اعزاز ہے، مخصوص حوالے، رخ کردار کو متعین کرنے میں نمایاں رہے ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف ایک وجود ہر جانب کا جامع نہیں رہا، دولت ہے تو انفاق کا حوصلہ نہیں، گفتگو عمدہ ہے تو کردار لائق التفات نہیں جسم توانا ہے تو روح سمٹی ہوئی ہے علم ہے تو عمل کی تائید حاصل نہیں، اپنوں سے حسن سلوک ہے تو غیروں کے لئے رحم کے جذبات نہیں، باپ کی حیثیت سے مشار الیہ ہے تو بیٹے کی حثیت سے لائق نفرت، غرضیکہ ایک پہلو قابل فخر ہے تو دوسرا لائق اجتناب، یہی عمومی زندگی کا حاصل ہے مگر ہم جس وجود مکرم ﷺ کا تذکرہ کر رہے ہیں اُس کا ہر پہلو حسین، ہر رخ مرکز محبت اور ہر رویہ عظمت کا نشان ہے جسم سے روح تک، ذات سے صفات تک، رشتہ داروں سے ہمسایوں تک، مالی معالات سے انسانی روابط تک جس جس حوالے کو بھی موضوع سخن بنائیں وہی رفعتوں کا اسوہ حسنہ ہے اسی لئے یہ رائے ہر کہیں معتبر رہی ہے کہ آپ ﷺ کا وجود ہی اکمل

الناس ہے انسان کو کاملیت اور اکملیت کی جس منزل کی بھی تلاش ہوگی اُسے اسی دربار گہربار پر حاضر ہونا ہوگا کہ عظمتوں کی خیرات یہیں سے حاصل ہوتی ہے۔

آیئے جسد انور کے ظاہری رخ کا جائزہ لیں تا کہ یقین آجائے کہ حسن بشر کو معراج حُسن کہاں سے حاصل ہوتی ہے، حضور اکرم ﷺ کی ولادت سے اُس آخری لمحے تک کا شمار کیجئے جب آپ اپنے خالق کے ہاں تشریف لے گئے، عالم معصومیت، بچپن، لڑکپن، اٹھتی جوانی، مرکز نگاہ وجود، مکہ مکرمہ کے بازاروں میں، مخالفت کی آندھیوں میں، محبت کے جلوں میں، شعب ابی طالب میں، مصائب کی یلغار میں، ہجرت کے جانگداز مراحل میں، مدینہ منورہ کی استقبالی فضا میں، ریشہ دوانیوں کے حصار میں، غزوات میں، سفر وحضر میں، گھروں میں اور میدان میں، غرضیکہ تریسٹھ سالہ حیات ظاہرہ کے ایک ایک لمحے میں نقد ونظر کے سارے نشتر آزما لیجئے، کیا حسن تمام کبھی پریشانیوں کے جھرمٹ میں ماند پڑا، جہاد وقتال کے دوران میں تو چہرے سراپا ہیبت بن جایا کرتے ہیں مگر یہ کون ساوجود ہے جس کا ہر لمحہ حسین ہر نظر دید کے قابل اور ہر موڑ لائق التفات وتحسین ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں ایک مثال تو تلاش کیجئے جو اس کاملیت واحسنیت کی نظیر بن سکے۔ پیدا ہوئے تو ماں کو نور ہویدا ہوتا ہوا محسوس ہوا معصوم وجود کے ساتھ روشنیوں کا طلوع ہوا، دادا نے لائق مدح وجود کی تمنا کی، فرمایا۔

"اردت ان یحمدہ اللہ فی السّماء ویحمدہ الناس فی الارض"۔

(الخصائص الکبریٰ)

میرا ارادہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر اس کی تعریف کرے اور لوگ زمین پراس کی مدح کریں" مطلوب یہ تھا کہ در یتیم، انسانوں کا ممدوح ہے یہ اسی صورت

ممکن تھا کہ یہ وجود سب سے اعلیٰ و اکمل ہو، خواہش کی تکمیل ان کلماتِ مدح سے عیاں ہے جو ہر دیکھنے والے کی زبان کا وظیفہ بنا حضرت براء رضی اللہ عنہ نے اس رخِ انور کو چاند کہا حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے اس چہرہ میں سورج تیرتا ہوا محسوس کیا کسی نے تابانی رخ کو چاند کا ٹکڑا کہا تو کسی نے قرآن کا ورق قرار دیا دیکھنے والوں نے تکلم کا وقار پایا تو کلام کرنے کا لمحہ روشنیوں کا نقیب سمجھا، ہاتھوں کو حریر و دیباج سے نرم محسوس کیا گیا تو پسینے کے قطروں کو لولوئے بے بہا پایا، کوئی لفظوں کو موتی کہتا رہا تو کوئی جسد اطہر کی مہک کو مشک و عنبر سے فزوں گردانتا رہا، خاموشی میں وقار کی نمود ہوئی تو تکلم میں حسن و رعنائی کا منظر سامنے آیا، اجمل الناس بھی کہا گیا اور احسن الناس بھی آپ کے ہر لمحے کی صداقت کی گواہی دی گئی اور آپ کے عہد کی پختگی کا اعلان کیا گیا اس قدر حسن و جمال کہ حسن کے تمام مراکز اور جمال کے تمام استعارے شرمانے لگیں بلا کے سخی کہ ہر خاص و عام پر ہر آن کرم ہوا مگر خود جو کی روٹی بھی شکم بھرنے کو دستیاب نہ رہی، کسی سوال کرنے والے کا سوال نہ ٹالنے والا وجود خود بھوکا رہا مگر کسی سے حاجت طلبی کا ارادہ بھی نہ کیا، دنیا کی دولت کے ڈھیر قدموں پر لگے رہے مگر خود فاقہ کشی کو شعار بنایا۔

الغرض ہر لحاظ سے بے مثل، عدیم النظیر اور اکمل الناس“۔ معاشرتی زندگی میں بڑی بوقلمونی ہے، دشمنوں کے معاشرے میں بھی دن گزارے اور وفا شعاروں کی معیت میں بھی زندگی بسر کی، سوچئے مخالفت نے کردار کو آلودہ کیا؟ انسان تو مشکل کے لمحوں میں مایوسیوں کی بے مروتی اوڑھ لیتا ہے مگر مکہ مکرمہ کی تیرہ سالہ زندگی گواہ ہے کہ ہزار مشکلات کے باوجود کردار کا حسن اور رخ زیبا کی رعنائی برقرار رہی، نہ دشمنی

نے تنگ دل کیا اور نہ عقیدت مندوں کی سپاس گزاری نے رعونت پیدا کی، اشرف انسانیت کی کاملیت کا اس سے بڑھ کر کیا نمونہ ہوگا کہ شعب ابی طالب کی آزمائش بھی جھول پیدا نہ کرسکی، وہ مسکراتا چہرہ اور وہی فیض بخش وجود، جنگ میں کہا جاتا ہے آداب پامال ہوجاتے ہیں کہنے والوں نے تو حالتِ جنگ میں ہر برائی کو جواز عطا کیا ہے مگر اس اکمل الناس وجود کا کردار دیکھئے، اسلام کی کفر سے پہلی جنگ جس میں مستقبل کی تعمیر کی صورت گری ہونا ہے اس سے بڑھ کر نازک لمحہ کب آیا ہوگا، چند افراد اور وہ بھی خالی ہاتھ، سامنے پوری طرح لیس دشمن اور کثیر تعداد، ایسے میں اگر اخلاق نظر انداز ہوتے تو کوئی مورخ انگلی نہ اٹھاتا مگر انسانیت کو منزل کمال تک لے جانے والا سراپا رحمت وجود اس حال میں بھی مسلمان بیٹے کو کافر باپ کے سامنے جانے کی اجازت نہیں دیتا کہ حالات کی نزاکت کا تقاضا کچھ بھی ہو، نسلوں کے لئے انسانی وقار و شرف کو تکمیل بخشنے والے وجود مکرم سے ایسا نہیں ہوسکتا تھا، کیا تاریخ عالم اس قدر رفعت و عظمت کی مثال لاسکتی ہے۔

انسانی معاشرے میں امیر و غریب کی تقسیم ہر دور میں رہی امیر سرفراز رہے اور غریب حاضر باش خادم مگر یہ دربار رسالت ہے جہاں لتھڑے ہوؤں، پسے ہوؤں اور معاشرے سے نکالے ہوؤں کو دامن رحمت حاصل ہوتا ہے وہ کون ہے جس نے گرم پتھروں اور جلتی ریت پر کراہنے والوں کو اس سنگ زنی سے نجات دی اور مقدس گھر کے ان پتھروں پر کھڑا کردیا جو بوسہ گاہ عالم تھے، وہ کون سا وجود اکمل ہے جس نے اپنے ہاتھ سے جوتے مرمت کئے اور لباس کو پیوند لگائے، یہ محنت کش کون ہے جس نے محنت کو عظمت میں بدل دیا، تلوار تھامے، سر میں دشمنی کا ناسور پالنے والوں کو لائق

عفو قرار دیا، یہ وہ نمونے ہیں جو انسانیت کو سربلند کر گئے اور رفعتوں کے لائق بنا گئے۔

یہ تو تاریخی حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ امی تھے، انسان مانتا ہے کہ اُمّی خود دوسروں کے سامنے علم کا سوالی ہوتا ہے مگر اس اُمّی لقب ﷺ کی یکتائی دیکھئے کہ علم وحکمت کے شناوروں نے اسی کے دربار سے خیرات مانگی کہا گیا کہ۔

الذی ردّت الیہ الشمس وانشق القمر

کان امیاً ولکن عندہ اُمّ الکتاب

صاحب ام الکتاب کی وسعت دیکھئے کہ خود دینے والے علام الغیوب نے فرمایا ”وعلمك مالم تكن تعلم“ (النساء:113) اور آپ کو وہ تمام علم سکھا دیا گیا جو آپ نہ جانتے تھے، احاطہ علم کا حساب لگائیے کہ جو بھی نہ جانا تھا جان لیا گیا، علم کی معراج نے عمل کی ایک ایسی دنیا آباد کی کہ جو کہا وہ کیا جو جانا اسکو محسوس کرایا اور جو تعلیم دی اس کا عملی نمونہ خود پیش کیا، علم وعمل کی یہ ہم آہنگی کاملیت کا نشان ہے کہ اس ہم آہنگی کے حامل چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو نہیں ملتے، رات بھر عبادت کا انہماک کہ پاؤں پرورم ہوگئے مگر زبان یہی کہتی رہے کہ کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں، منعم کی ایسی شکرگزاری کی مثال کہاں ملے گی۔

عبادت کا خشوع بڑھ جائے تو طبیعتوں میں ترک دنیا کا خیال انگڑائی لینے لگتا ہے عابدوں زاہدوں کو غاروں اور زاویوں کی خلوتیں پسند ہوتی ہیں اور یہ خلوتیں اس قدر واضح ہو جاتی ہیں کہ ایسے لوگ جلوتوں کے قابل نہیں رہتے مگر ایک وجود کامل ایسا بھی ہے جو خلوتوں کو بھی آباد رکھتا ہے اور جلوتوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہے، علامہ اقبال نے خوب کہا تھا۔

بوریا مسند نشیں راحت است
تاج کسریٰ زیر پائے امتش
وقت ھیجا تیغ او آہن گداز
دیدہ او اشکبار اندر نماز

سرور عالم ﷺ نے انسانی سماج کو اس درجہ مستحکم کر دیا کہ ہمیشہ کے لئے مصنوعی عظمتوں کا قلع قمع ہو گیا، آخری حج کے موقعہ پر عظیم تر اور کامل تر وجود مکرم ﷺ نے فرمایا: اے لوگو، بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی، بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے یاد رکھو کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضلیت نہیں وجہ شرف صرف تقویٰ ہے“ تمہارا باپ ایک فرما کر عصبیتوں کے تمام بت توڑ دیئے اور تمہارا رب ایک ہے فرما کر دربدر کی رسوائی سے محفوظ فرما دیا۔

نبی اکرم ﷺ کا وجود مکرم اپنے ہر ہر اظہار میں کاملیت کا پیکر ہے حتکہ وجود سے پھوٹنے والا انقلاب بھی بے مثال ہے کیونکہ دوسرے انقلاب کی طرح نہ جز وقتی ہے اور نہ محدود یہ نہ صنعتی انقلاب ہے کہ انسان کو مشین کا پرزہ بنا دے اور اس سے شرف آدمیت چھین لے اور نہ یہ معاشی انقلاب ہے کہ روٹی مقصود زندگی قرار پائے، یہ درحقیقت مادہ سے روح تک کا انقلاب ہے، علم سے عمل تک کی تگ ودو ہے جو قانون سے اخلاق تک وسیع ہے۔ تاریخ عالم کا طالب علم ماضی کے دبیز پردوں کو ہٹا کر شخصیات اور ان کے اثرات کا ہمہ پہلو جائزہ لے تو وہ بالاستیعاب مطالعہ کے بعد پکار اٹھے گا کہ انسانی وجود میں ایک ہی وجود ایسا ہے جو ہر دور کا امام بھی ہے اور ہر عہد کا چارہ ساز بھی، نبی رحمت ﷺ کی سیرت کا حرف حرف پکار رہا ہے کہ آپ احسن الناس بھی ہیں اشجع الناس بھی ہیں اور اکمل الناس بھی، اللہ تعالیٰ ہم ناقصوں کو اس کاملیت کبریٰ سے کسب فیض کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

العقل اُصل دینی

(کتاب الشفاء)

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق فرمائی تو اس میں قوی اور صلاحیت کے حوالے سے مراتب کا فرق بھی متعین فرمایا، انسان کو کائنات میں شرف وعظمت سے نوازا کہ اس کو ان صلاحیتوں کا کمال ودیعت فرمایا گیا، انسانی شرف کے مختلف مظاہر میں عقل وہ صلاحیت ہے جو اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی اس کی شناخت اور یہی اس کا مابہ الامتیاز وصف ہے۔ عقل کیا ہے انسانی علوم کے ماہرین اسے 'حواس' کا خلاصہ اور متضاد قوتوں کا توازن قرار دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مختلف حواس سے مسلح کیا ہے کہ وہ کارزارِ حیات میں ان دفاعی ہتھیاروں سے لیس ہو کر جہانِ آب وگل میں اپنا وجود برقرار رکھ سکے عموماً ان حواس کو پانچ ظاہری حواس سے یاد کیا جاتا ہے اگرچہ جدید علمائے نفسیات کچھ حشوی اور عضلاتی حواس کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہر حس ایک دریچہ ہے جس کے ذریعے باہر کی معلومات انسان کے اندر داخل ہوتی ہیں۔ ان متنوع معلومات کو ایک قوت ترتیب دیتی ہے اور مجرد حواس سے سابقہ معلومات کو ہم آہنگ کر کے نتائج اخذ کرتی ہے اس کو مدرکہ نفس یا عقل کہتے ہیں اور یہی قوت انسان کو عناصر کا حکمران بناتی ہے۔ ''عقل'' حس کی معراج اور انسانی صلاحیتوں کا نقطہ کمال ہے اسلئے اسی کے حوالے سے انسان کی قدر وقیمت کا تعین ہوتا ہے کہ یہی حیوان اور انسان میں حدّ فاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جوہر جس پر انسانی شرف کا مدار ہو

یا وہ قوت جو انسان کی عظمت کا حوالہ ہو دین فطرت یعنی دینِ اسلام میں باعث فخر ہی نہیں دین کی پہنچان قرار پائے گی۔ ہر وہ نظریہ حیات جو انسان کے افعال واعمال کو وجہ کرامت قرار دے گا ''عقل'' کی عظمت کا معترف ہوگا۔

''عقل'' کو مینارِ نور تسلیم کرنے کے باوصف بسا اوقات عقلی مغالطوں سے انسان راہ راست سے بھٹکتا رہا ہے اس لئے عقل پر اعتماد کے باوجود الہامی راہنمائی کی ضرورت کا احساس ہر معاشرے میں رہا ہے۔ الہامی تعلیمات بسا اوقات دستبردِ زمانہ کی بنا پر اپنا اصلی تشخص کھو بیٹھتی ہیں تو انسان یا تو ان سے انکار کر کے عقل پرست ہونے کا داعی بنتا ہے یا محرف تعلیمات کو ہی راہ نجات سمجھ کر عقل دشمنی کا علم اٹھا لیتا ہے۔ یہ دو انتہائیں ہیں جن میں انسان بھٹکتا رہتا ہے۔ اس خود فریبی میں مبتلا انسان یہ غلط دعویٰ کرنے میں تسکین پاتے ہیں کہ عقل اور الہام کا آپس میں کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ متضاد ذرائع علم ہیں جن کے حقائق میں کوئی وجہ مطابقت ممکن نہیں ہے اس سے ''عقل پرست'' اور ''نقل پرست'' کے دو فریق پیدا ہوئے، معقول اور منقول کی آپس میں ٹھن گئی اور ہر دو فریق اپنے اپنے حق میں دلائل کا انبار لگانے لگے۔

اسلام دین فطرت ہے اس لئے اسلامی تعلیمات فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہیں۔ اسلام انسان کو بحیثیت مجموعی دعوتِ ایمان دیتا ہے وہ انسان جو حواس کا مرکب بھی ہے اور ''عقل'' کا حامل بھی، اسلامی تعلیمات عقلِ انسانی کی ضد نہیں اُن کی راہ نما ہیں، اسلام اُس قوت کا انکار کیسے کر سکتا ہے جس پر انسان کے شرف کا انحصار ہے اور جو خالق کی نمایاں ترین رحمت ہے اس لئے اسلام ''عقل'' کی نفی نہیں کرتا بلکہ ''عقل'' کی غفلت مٹانا چاہتا ہے تاکہ یہ قوت معلومات کی تنگ نائے

میں اسیر ہوکر اپنے اُس فرض منصبی کو بھول نہ جائے جو بحیثیت انسانِ ناطق، اس کے ذمے ہیں۔قرآنی ارشادات ہوں یا نبوی تعلیمات ''عقل'' کی مخالفت کا کوئی شائبہ تک موجود نہیں ہے بلکہ قدم قدم پر اس عطیہ ربانی سے مستفیض ہونے اور اس کی روشنی سے ظلمت کدہ حیات کو منور کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔قرآنی احکامات کے اختتامی کلمات عموماً یعقلون ،تتفکرون، یفھمون، یتدبرون ، جیسے الفاظ ہیں جن میں عقل وفکر اور فہم وتدبیر کی واضح ہدایت دی گئی ہے۔انفس وآفاق پر غور وفکر فضائے بسیط کے لاتعداد سیارگان کے بارے میں تجسس، قوموں کے عروج وزوال کی داستانوں سے عبرت پذیری اور عناصر قدرت کی نفع بخشی کی سراغ رسانی اُن چند واضح احکامات میں سے ہیں جن میں عقلی صلاحیت کو بروئے کار لانے کا مشورہ ہی نہیں حکم دیا گیا ہے۔بلکہ قرآن کا عمومی انداز بیان تلاش وجستجو کی ترغیب دیتا ہے اور تفکر وتدبر کی دعوت دیتا ہے۔یہی تعلیمات اسلامیہ کا عمومی مزاج ہے جس کی بنا پر ملت اسلامیہ نے تدوین علم اور ترویج حکمت کا وہ کارنامہ انجام دیا جس پر ہر ذی عقل سراپا سپاس ہے۔

آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی ''اسوۂ حسنہ'' کے اُس منصب جلیل پر فائز ہے کہ جہاں سے بہر نوع کسبِ فیض کی تا ابد ضرورت رہے گی اس لئے آپ کے اعمال اور رویوں کے ساتھ ساتھ آپ کے الفاظ وکلمات بھی اس بلند مقام کے حامل ہیں کہ ان کو راہبر حیات بنایا جائے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے جب طریقِ عمل کی وضاحت چاہی تو آپ نے ایک مفصل اور جامع حدیث میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی فرمائی، اس طویل ارشاد میں آپ نے ''عقل'' کی حیثیت کا تعین بھی فرمایا۔ارشاد فرمایا۔ ''العقل اصل دینی'' (کتاب الشفاء قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ جلد اول ص:146) عقل میرے دین

کی بنیاد ہے۔اس ایک جملے نے کئی ابہام دور فرمائے اور متعدد اصول بھی متعین فرمادیئے۔

''دین'' سے مراد اسلام ہے کہ دین کے تمام لغوی مفاہیم اسلام کے حوالے سے ہی متحقق ہوتے ہیں، ''اصل'' جڑ یا بنیاد ہے۔فرمایا ''عقل'' میرے دین یعنی اسلام کی جڑ ہے یہ شجر اسلام جو اس قدر بارآور اور ثمر دار ہے اس لئے ہے کہ یہ ''عقل'' کی بنیاد پر کھڑا ہے۔عقل پر اس کا قیام ہے کہ اس کی آبیاری فیض عقل سے ہو رہی ہے، اس کا ثبات عقل پر اور اس کی نشوونما عقل کے سہارے پر ہے۔یہ نہ فرمایا کہ ''عقل'' بھی میرے دین کے لئے باعث تقویت ہے یا یہ شجر مراد عقل سے بھی مستفیض ہے بلکہ دین کی اساس ،اسلام کی بنیاد عقل کو فرمایا کہ عقل ایک واسطہ نہیں بنیاد اصلی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے نزدیک ''عقل'' کی اہمیت کیا ہے آپ نے کسقدر بلیغ استعارے سے ثابت فرمایا کہ اسلام سراپا عقل ہے۔بے عقلی اسلام نہیں ہوسکتی۔عقل دین اور دین عقل ہے۔دین کا کوئی حکم ہو یا کوئی توجیہ اس میں ''عقل'' کے تقاضوں کی نفی نہیں ہے جو حکم ''عقل'' کے معیار پر نہ ہو حکم نہیں ہے ہاں یہ ضرور خیال رہے کہ دین کی کسوٹی عقلِ رسا ہے عقل نارسا نہیں۔اگر کوئی انسان اپنی عقل کے سہارے کسی حکم یا تعلیم کے کسی گوشے کو خلاف عقل قرار دیتا ہے تو سب سے پہلے اُس کے عقلی معیار، کا اندازہ کرنا ہوگا شپرہ چشم سورج کی روشنی نہ دیکھ سکے تو اُسے اپنی بے بضاعتی کا ماتم کرنا چاہیے سورج کی تابناکیوں سے انکار نہ کرنا جائے۔اسلام عقل وشعور کا مربی اور حکمت ودانش کا مبلّغ ہے قرآنی تعلیمات قدم قدم پر تدبر کی دعوت دیتی ہیں کہ کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں اور کوئی

مطالبہ بے سوچے سمجھے نہیں ۔قرآن وہ روشن کتاب ہے جس کا ہر کلمہ روشنی کا مینار اور جس کا ہر حکم ہدایت کا نور ہے۔اسی لئے قرآن بار بار اپنے لئے حکمت ،نور، ہدایت اور فرقان کے صفاتی اسماء استعمال کرتا ہے۔

غور کیجئے جو دین اپنے لانے والے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں یہ دعویٰ رکھے کہ

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النساء:113)

آپ کو تیرے پروردگار نے وہ سب کچھ تعلیم کیا جو آپ نہ جانتے تھے اور یہ بھی کہ سنقرئك فلا تنسىٰ (سورۃ الاعلیٰ:6) کہ ہم آپ کو ایسا پڑھائیں گے کہ آپ کبھی نہ بھولیں گے اور مزید یہ کہ الرحمٰن علم القرآن (سورۃ الرحمٰن:2) کہ رحمٰن نے قرآن کا علم سکھایا ہے وہ قرآن کہ خشک وتر میں سے کچھ نہیں ہے جو اس سے باہر ہے ،بھلا عقل سلیم کی کسی روش کا مخالف ہو سکتا ہے؟ عقل تو راہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے اور جب تک عقل یہ فریضہ انجام دے گی دین کی اساس ہوگی ہاں اگر عقل کے نام پر بے عقلی، حکمت کے نام پر جہالت قبضہ جمانے لگے تو یہ عقل نہ ہوگی عقل کے نام پر فریب کاری ہوگی جو مردود قرار پائے گی۔آنکھ ہو مگر دیکھ نہ سکے۔کان ہو مگر سننے کی صلاحیت سے عاری ہو تو کون ہے جو ان پر اِترائے گا۔یہی حال عقل کا ہے،عقل کی سلامتی کا راز اس مطابقت میں ہے جو اسے تعلیمات اسلامیہ سے حاصل ہوگی کہ یہ تعلیمات اُس ذات کی عطا کردہ ہیں جو خالقِ عقل ہے اور خالق کے دو مظہر متضاد نہیں موافق ہوتے ہیں۔

حدیث مبارک کے اس جملے سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ دین حق اور نظام باطل

کی پہچان بھی اسی حوالے سے ہوگی ہر وہ نظام جو ماورانیت کا اسیر اور عقلی استدلال سے عاری ہوگا دین نہیں کہلا سکے گا۔اس طرح ہر عبادت جو عقل صریح کے خلاف ہو قابلِ اخذ نہ رہے گی خواہ اس کی نسبت کتنی مستحکم ہو کیونکہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔علمائے فن حدیث نے متن حدیث کے اخذ ورد کے جو اصول مرتب فرمائے ہیں اُن میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ہر وہ حدیث جو قرآن سے یا حدیث متواتر سے یا عقل صریح سے ٹکرائے وہ لائق اخذ نہیں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے حضور اکرم ﷺ نے اس مجمل جملے یعنی العقل اصل دینی میں عقل کی اہمیت، دین کا عقل کے بارے میں رویہ، دین کی اساس میں عقل کی کارفرمائی، تعلیمات اسلامیہ میں مطابقتِ عقل کی حیثیت واضح کرتے ہوئے عقل ودین، کے باہمی رابطے کی نشاندہی فرما دی ہے کہ دین خلاف عقل نہیں۔اور خلافِ دین کوئی عقل نہیں، دونوں میں تضاد فریب نظری ہے درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔اس مختصر جملے نے اسلامی تعلیمات میں عقل کی حیثیت متعین کر دی ہے اور قوم کو عقل کے استعمال اور دین کی تفہیم کے لئے اس ضرورت کا احساس دلایا ہے۔

اللہ کرے کہ ہم اس ارشاد نبوی کی روشنی میں عقلی توانائیوں کو قرآن فہمی کے لئے بروئے کار لائیں تا کہ یہ احکامات اسلامیہ خارج کے بجائے داخل سے نافذ ہوں آمین

ذکر اللہ انیسی

(کتاب الشفاء)

رحمتِ عالمین ﷺ نے انسان کی راہنمائی کا فریضہ یوں انجام دیا ہے کہ آپ کی حیاتِ مبارکہ کا ہر گوشہ اور آپ کے کردار و سیرت کا ہر پہلو ہدایت ہی ہدایت ہے، گفتگو کا ہر قرینہ اور عمل کا ہر انداز کامیاب زندگی کے لئے ہر دور اور ہر نسل کے لئے مینارہ نور ہے جو جب چاہیے اور جہاں چاہیے اپنی زندگی کو کرامتوں سے ہم کنار کرنے کی صلاحیت پاتا ہے آپ ﷺ کی زبان سے ادا ہونے والے جملے ہوں یا معاشرتی روابط کے رویے انسان کی فلاح انہی کے حوالے سے متعین ہوتی ہے آپ ﷺ نے کبھی عمل کا معیار لفظوں میں بیان کر دیا تو کبھی اپنی حیاتِ طیبہ کی عملاً مثال ہے حقائق آشکار کئے، احادیث میں متعدد ایسے جملے موجود ہیں جن میں آپ نے اپنی حیات کے حوالے سے عمل کی اساس متعین فرمائی اور لوگوں کو ایسے اعمال کی ترغیب دی، وہ ہدایت جس میں ہادی کی اپنی ذات شامل ہو جائے زیادہ اثر انگیز ہوتی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت ہوئی ہے جس میں آپ نے اپنے رویوں اور اپنی عادتِ مبارکہ کا تذکرہ فرمایا اور قاری کو سوچنے کی دعوت دی اور عمل کی ترغیب بھی، آپ نے عقل کو دین کی اساس علم کو اپنا سامانِ مبارزت فرمایا اور اللہ کے ذکر کو اپنا انیس وہمدم قرار دیا۔

''اللہ کا ذکر'' زبان سے سے اعترافِ عبدیت ہے اور عمل سے اطاعتِ الٰہی

ہے۔ انسان، جس کی تخلیق میں عبادت گزاری کا جوہر ودیعت ہے اپنی تکمیل کے لئے اپنے معبود کا متلاشی رہتا ہے۔ وجود خالق کا ہر لحہ احساس، انسان کے کردار کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتا ہے، یہ دراصل اس کے اپنے وجود کا اعتراف ہے کہ خالق پر ایمان کے بغیر مخلوق کا وجود ثابت ہی نہیں ہوتا، وہ جو کچھ ہے اُس کے حوالے سے ہے، یہی اُس کی شناخت ہے اس لئے مقصد حیات کو پانے کے لئے اور مقاصدِ حیات کی تکمیل کے لئے اُسے ہر لحہ اس رابط کو استوار رکھنا ہے ظاہر ہے کہ جس عمل کو فطرتِ انسانی سے قرب کا ذریعہ بننا ہے اُسے ہر رویے میں آشکار ہونا چاہیے، ہر عمل اس حقیقت کا اظہار بنے اور ہر گفتگو اس اعتراف کی دلیل بنے کہ اس کی بغیر یہ مقصد حیات حاصل نہ ہوگا اور نہ اطمینانِ قلب، اسی لئے تو ارشادِ باری ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿الرعد: ۲۸﴾

آگاہ رہو کہ دل اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان پاتے ہیں کہ یہی اُن کی غذا ہے اور یہی اُن کی نشوونما کا ذریعہ انسان کا دل اللہ کے ذکر کے بغیر سکون واطمینان نہیں پاتا تو انسانیت کی معراج اور تخلیق کی حاصل ذات حضور اکرم ﷺ کے دل کا اطمینان اس کے بغیر کیسے ممکن ہوگا۔ قلب مطمئن ''اللہ کا ذکر'' سے سرشار رہتا ہے اسی لئے قلبِ نبوت ذکر کا مرکز اور یادِ الٰہی کا سرچشمہ ہے۔ اللہ کا ذکر ہر وقت زبان کا وظیفہ ہے اور اس مانوسیت نے ذکر الٰہی کو ذاتِ سرکار ابد قرار ﷺ کا انیس وہمدم بنا دیا ہے۔ تنہائیوں کے لمحے ہوں یا مجلسوں کی رونقیں، عبادت کے اوقات ہوں یا تعمیر سیرت کے مواقع آپ ہر وقت اور ہر لحہ ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ اللہ کی یاد ہر آن رفیق وانیس تھی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے دعا کے انداز میں اسی

کیفیت کا اظہار فرمایا۔اپنے خالق و مالک کے حضور استدعا کی کہ میری گفتگو کو ذکر اور میری خاموشی کو فکر بنادے ۔غور کیا جائے تو ذکر اور فکر ایک ہی کیفیت کے دو رخ ہیں۔یہ دراصل خالق کے وجود پر یقین کی آخری منزل ہے کہ تدبر و تفکر کا موضوع وہی ذات ہو اور گفتگو بھی اُس ذات کے بارے میں ہی ہو۔دل کی دنیا میں حکمرانی اُسی ذات کی رہے۔سوچ اُس کے لئے اور زبان اُس کے ذکر کے لئے ، یہ مقام حاصل ہوجائے تو انسان کی پوری زندگی خالق کی پناہ میں آجاتی ہے یہ حضوری کے مرحلے ہیں۔

''ذکر'' کے دو پہلو ہیں ایک جس میں صرف زبان شریک ہوا اور ایک جس میں پورا وجود شریک ہوجائے ایسا ہوجائے تو پھر یہ زبان کا وظیفہ ہی نہیں رہتا خاموشی بھی ذکر بن جاتی ہے قرآن ایسے ذکر کی ہی دعوت دیتا ہے۔''قرآن کو ذکر کے لئے ہم نے آسان کردیا ہے تو کیا کوئی ذکر کرنے والا ہے۔''اس آیت کریمہ میں دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے زبان سے ورد کرنا چاہو تو قرآن کا اسلوب ، جملوں کی ساخت اور لفظوں کا انتخاب روح پرور ہو پڑھتے جاؤ اور سماعت میں رس گھولتے رہو، قاری بھی وجد میں ہے اور سامع بھی اور اگر اس کے معانی اور اس کی تعلیمات پر غور کرو تو بھی یہ آسان اور فہم سے قریب تر ہے۔حدیث مبارک میں آپ ﷺ نے ذکر اللہ کو اپنا انیس قرار دے کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میری تو ساری زندگی اللہ کے ذکر سے عبارت ہے بولتا ہوں تو اُسی کی حمد کے ترانے سناتا ہوں اور خاموش رہتا ہوں تو اُس کی کائنات پر تدبر کرتا ہوں یہ ذکر میرے وجود کا ساتھی اور میری زندگی کا رفیق و مونس ہے اس سے یہ بھی اشارہ دیا کہ کسی اور کو اپنا ہمدم و ہمدرد نہ بناؤ اللہ کا ذکر ہر مصیبت میں مددگار بھی ہے اور ہر مشکل میں راحتِ جان بھی ، یہ انیس ہے محبت بھرا

ساتھی ہے اسی سے دل لگاؤ اور اسی سے اپنی زندگی کو غموں سے آزاد بنانے کی سعی کرو۔

''ذکر اللہ'' قرآن مجید کو بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے ہر لفظ سے خالق کے کرم کا احساس ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہے کہ اُس کا کلام انسان کی زبان سے ادا ہو رہا ہے ۔قرآن مجید کو انیس اور ساتھی بنالینا نجات کا ذریعہ ہے اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے ''ذکر اللہ'' کو اپنا انیس قرار دیا کہ صاحب کتاب سے زیادہ کتاب کا قرب کسے حاصل ہوسکتا ہے۔قرآن ضابطہ حیات ہے اور حضور اکرم ﷺ کی ذات میں اس کی عملی تعبیر سامنے آئی ہے۔قرآن ناطق، ہروقت قرآن سناتا بھی ہے اور قرآن کی مراد سمجھاتا بھی ہے قرآن اُن کی ذات کا حصہ ہے کہ اس خاموش قرآن نے آپ کی ذات میں بولنے کا سلیقہ پایا ہے۔قرآن صاحب قرآن کا انیس بھی ہے وظیفہ حیات بھی اور عمل کی اساس بھی آپ اسی کو اپنی امت کا انیس، وظیفہ حیات اور ضابطہ عمل بنانے کا فرمار ہے ہیں۔

اللہ کرے اللہ کا ذکر ہم سب کا مونس و ہمدم بنے تا کہ ہماری زندگیاں قرآنی تعلیمات کی سچی تصویر بن جائیں۔آمین

الصدق شفیقی

(کتاب الشفہ)

اسلامی تعلیمات میں اخلاقیات کو اہم ترین مقام حاصل ہے بلکہ یہی تمام اعمال کے صالح یا غیر صالح ہونے کا معیار ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ تم میں سے کامل تر مومن وہ ہے جو تم سے اخلاق میں برتر ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب خلق رسول ﷺ کے بارے میں سوال کیا گیا تو جواباً فرمایا کہ آپ کا خلق تو قرآن ہے۔ (صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل)

معلوم ہوا کہ قرآن کے تمام احکام کی بنیاد خُلق پر ہے کہ اسلام کا نقطہ نظریہ ہے کہ حکم خارج کا عمل نہ بنے بلکہ انسانی فطرت کا اظہار ہو اور وہ عمل جس سے انسانی شرف میں اضافہ ہو اور وہ انسان کو تخلیق کے مقاصد سے قریب تر کر دے اخلاقی تقاضا ہے ان تقاضوں کی فہرست طویل بھی ہو سکتی ہے کہ پوری زندگی کو محیط ہونا ہے لیکن اگر ان اخلاقی اقدار کو مجملاً بیان کیا جائے اور انہیں ایک نقطہ پر مجتمع کر دیا جائے تو وہ اخلاقی تقاضا ''صدق'' ہے صداقت شعاری انسان کا جوہر ہے اور بنیادی وصف ہے اس میں پختگی اور اعتماد سے ساری زندگی نیکیوں کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اگر اس میں کوتاہی یا بے یقینی در آئے تو بد عملی کی نمو ہونے لگتی ہے۔ صدق وہ وصف ہے جو انسان کی کاملیت کا ضامن ہے۔ اسی لئے ہر صالح انسان صداقت شعار ہوتا ہے

انبیاء کرام انسانی وجود میں انسانیت کے امام ہیں اس لئے اُن کے شمائل میں صدق کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے قرآن مجید نے گذشتہ انبیاء کرام کے حالات کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے اور اُن کی تبلیغی مساعی کا تذکرہ کیا ہے غور کیا جائے تو ان واقعات میں صدق کا حوالہ ضرور ملے گا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری پر اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ واقعات دوہرائے جا رہے ہیں۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے بیان میں ارشاد ہوا۔

اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿مریم: ۵۶﴾

اور یہی جملہ حضرت ابراہیم کے لئے ارشاد ہوا حضرت یوسف علیہ السلام کو یوسف۔

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ ﴿یوسف: ۴۶﴾

اے یوسف سچے یوسف۔

کسی کو صادق کہہ کر ذکر ہوا اور اُن کی فطرت کا بیان ہوا۔ کسی کو زمرۂ اصدقیاء میں ذکر کیا کسی کی والدہ کو صدیقہ کہا غرضیکہ کسی نہ کسی حوالے سے صدق کا ذکر ہوا۔ حضور اکرم ﷺ کے ذکر میں تو اس کا اظہار مختلف انداز میں ہوا۔ کبھی قبل اظہار نبوت کی زندگی کا حوالہ دیا گیا کبھی حاملِ صداقت کہہ کر تعارف کرایا گیا اور کبھی آپ کے اعمال و افعال کی صداقت کا حوالہ دیا گیا۔

سرور کائنات ﷺ کی حیات مبارکہ کا ہر گوشہ صدق کا مبلغ ہے آپ نے ہر مرحلے پر سچائی کی عظمت کا اعلان کیا اور تو اور اپنی شناخت اسی حیثیت سے کرائی اعلان نبوت پر جب مکہ کے لوگ ہر ممکن مخالفت پر اُتر آئے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر طعن کرنے لگے اور جھٹلانے پر کمربستہ ہوئے تو

آپ نے انہیں کسی معجزے یا خارق عادت کے حوالے سے اپنی نبوت کا یقین نہیں دلایا بلکہ اُن کے اپنے رویے اور سابقہ علم کو حجت کے طور پر پیش کیا، کیا یہ حقیقت نہ تھی کہ وہ لوگ آپ کو صادق وامین کا لقب دے چکے تھے مکہ کی فضا میں ابن عبداللہ کی صداقت کسی پر مخفی نہ تھی ہر لمحے سچ بولنے والا، ہر کسی سے صداقت کی بنیاد پر معاملہ کرنے والا، بات کا سچا، عمل کا کھرا اور باہمی تعلقات میں بے لوث وجود کفار سے بھی اپنی اخلاقی عظمت کا اعتراف کرا چکا تھا۔ تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ پیدائش سے دم واپس تک بڑے سے بڑا دشمن بھی کردار کے کسی پہلو پر انگشت نمائی نہ کر سکا۔ صداقت اُن کا وجود کا حصہ تھی جو ہر ہر موڑ پر آپ کی ساتھی رہی، ایسے ہی افضل البشر کو یہ کہنا زیب دیتا ہے کہ صداقت میرا شفیق ہے۔ صدق میرا ساتھی ہے ایسا ساتھی جو جیون ساتھی تھا جو خوشحالی ہو یا پریشانی، صلح کی حالت ہو یا جنگ کی دوست سے معاملہ ہو یا دشمن سے، ذاتی تعلقات ہوں یا قومی، ہر موڑ پر اور ہر طور پر آپ کا ساتھی تھا، پوری زندگی صداقت کی رفاقت رہی۔ اس لئے آپ نے اپنی زندگی کے مختلف رویوں کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی فرمایا۔ ''الصدق شفیقی'' سچائی میری رفیق ہے۔ شفیق وہ رفیق ہے جس کی رفاقت دل پسند بھی ہو اور تقویتِ جان بھی ہو، آپ نے صرف ساتھی نہ کہا شفیق کہہ کر ''صدق'' کے اُن پہلوؤں کی طرف اشارہ بھی کیا جو سکون عطا کرتے ہیں۔ شوق دلاتے ہیں اور ہر مصیبت میں معاون اور ومساز ہوتے ہیں، حقیقت ہی ہے جب ''صدق'' شفیق بن جائے تو اس کے لئے ہر قسم کی قربانی راحتِ جان ہوتی ہے۔

اللہ کرے ہم اس ارشاد نبوی کی روشنی میں صدق کو اپنا ساتھی بنائیں تا کہ ہمیں بھی اس کی برکات سے فیض یاب ہونے کا موقع ملے۔

الرضاء غنیمتی

(کتاب الشفاء)

آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ کا ہر رُخ اور آپ کی تعلیمات کا ہر پہلو انسان کے لئے ہدایت و راہنمائی کا بیش بہا خزانہ ہے، آپ کے اعمال وافعال دستگیری کرتے ہیں تو آپ کے اقوال وارشادات راہ حیات کے نشیب وفراز میں روشنی کا مینار ہیں، راہنمائی آپ ہی کی ذات سے حاصل ہوتی ہے اور راہبری آپ ہی کا استحقاق ہے آپ کا ہر عمل دعوتِ فکر ونظر ہے اور آپ کا ہر ارشاد لائق اتباع، اسی لئے آپ کی ذات اقدس کو وہ اعزاز حاصل ہے جو کسی راہنما یا پیشوا کو حاصل نہیں کہ آپ کی پوری زندگی کا ہر لمحہ محفوظ ہوا، قرآن کی حفاظت کے ساتھ حاملِ قرآن کا اسوہ بھی الٰہی پناہ میں تھا کہ اسے تا ابد انسانیت کے لئے مینارہ ہدایت بننے کا شرف نصیب تھا، آپ نے تعلیم امت کے لئے بعض احکامات نافذ فرمائے تو بسا اوقات بیانیہ جملوں میں ان احکامات کو اپنی ذات کا حوالہ عطا کر کے اُن کی ابدیت کا اظہار فرمایا۔ ذاتی حوالے نے حکم میں محبت کا عنصر نمایاں کر دیا جس سے یہ واردات میں ڈھل گیا الرضاء غنیمتی (الشفاء قاضی عاض رحمۃ اللہ علیہ جلد اول ص: 147) یعنی رضامندی میری غنیمت ہے میں بھی یہی پیرایہ وبیان اختیار کیا گیا ہے۔ غنیمت وہ خوش کن نتیجہ ہے جو کسی تگ و دو کا حاصل ہے، بالفعل قتال، دشمن سے نبرد آزمائی جان کا خطرہ، دفاعِ امت وحفاظت عقیدہ کی کاوش کا ثمر تو اعلائے حق ہے۔ کامیابی وکامرانی حاصل

ہوجائے تو اطمینان قلب، راحتِ جسم اور افزدئی آسائش کے ثمرات بھی نصیب ہوتے ہیں، یہی غنیمت ہیں، غنیمت میں دشمن سے ستیزہ کاری اور احساس کامرانی کے عناصر شامل ہوتے ہیں ارشاد نبوی ہے کہ رضا میری غنیمت ہے یعنی اس کارزارِ حیات میں باطل قوتوں سے پنجہ آزمائی کا ثمر یہ ہے کہ رضا حاصل ہوجائے ۔ یہ نتیجہ ہے تمام کاوشوں اور ہر قسم کی کوششوں کا، مقصدِ اعمال یہ ہے اور ساری محنت مقام رضا کے حصول کے لئے ہے، معلوم ہوا کہ رضا حاصل زندگی ہے لیکن رضا کیا ہے اور اس مقامِ رضا کو پانے کے ذرائع کیا ہیں۔ یہی سوال ہے جو زندگی کے اصول وضوابط کو متعین کرتا ہے سارے قوانین اسی تک پہنچنے کے وسائل ہیں۔

قرآن مجید نے بندگانِ رضا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ (المائدہ:119)

اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اُس سے راضی ہوئے، یہ باہمی رضا عظیم کامیابی ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ رضا دوطرفہ عمل ہے، اللہ کی رضا مقدم ہے جس کے حصول کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندے اپنے خالق سے کیفیت رضا محسوس کرتے ہیں اور جب یہ منزل حاصل ہوجائے تو زندگی کامیاب ٹھہرتی ہے۔ بیعت رضوان میں جانثارانِ رسول ﷺ کی وفاشعاری کا منظر تاریخ کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہے یہ محبتِ وخلوص کا مظہر خالقِ کائنات کو اس قدر پسند آیا کہ ارشاد ہوا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

(الفتح:18)

بے شک اللہ مؤمنوں سے راضی ہوگیا جب کہ وہ درخت کے نیچے آپ کی

بیعت کررہے تھے۔ مشقت برداشت کرنے اور حق پر قائم رہنے کا عہد رضا الٰہی کا سبب ٹھہرا۔ رضائے الٰہی کا مقام بلند صرف اُسے ہی حاصل ہوتا ہے جس کے بارے میں خود قرآن گواہی دے رہا ہے کہ

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۔ (البینۃ:8)

کہ یہ مرتبہ صرف خوفِ خدا کے ذریعے ہی نصیب ہوتا ہے، ایک دوسری آیت میں ایسے بندگان رضا کو

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ (المجادلۃ:22)

کہ یہ لوگ حزب اللہ ہیں کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سورہ توبہ میں تلاش احسن کے لئے سرگرم گروہ کو بھی مقام رضا کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں ''رضا'' کو مومن کی زندگی کی معراج اور اعمال صالحہ کا ماحصل قرار دیا گیا ہے۔ حدیث مبارک میں ہے جسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ اُس شخص نے ایمان کی لذت پائی ہے جو اللہ تعالیٰ پر راضی ہوا ہے۔ (صحیح مسلم باب الیل علی ان من رحمتہ) اللہ تعالیٰ پر راضی ہونے سے مراد یہ ہے کہ اُن اوامر ونواہی کو خوشدلی سے تسلیم کرے جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں اور ہر حال میں خواہ وہ ''خوشدلی'' کا مظہر ہو یا رنج وغم کا اسیر، اُس ذات بے ہمتا سے شکوہ نہ کرے بلکہ ہر حال کو عطاء رب سمجھتے ہوئے قبول کرے اور دل میں کوئی میل نہ لائے۔ قضائے الٰہی پر راضی رہنا ایمان کی دلیل ہے ہر حکم ماننا اور ہر فیصلے کو تسلیم کرلینا ''عبد'' کی عبدیت کا تقاضا ہے، قدرت کے فیصلوں سے تو مفر نہیں ہے قانونِ فطرت بے لاگ اور اٹل ہوتے ہیں۔ طوعاً یا کرھاً انہیں ماننا ہوتا ہے ''مومن'' کی شان یہ ہے کہ وہ تعمیل احکام میں ''دلی مسرت'' شامل کرلیتا ہے، کبھی مصائب پر صبر کی صورت میں تو کبھی

"رضا طلبی" کی خواہش میں یہی وہ خط امتیاز ہے جو "مومن و کافر" کو جداگانہ مقام عطا کرتا ہے۔ "حکم" ماننا ہے اور اگر اس قبول حکم میں اللہ کی رضا کا جوہر شامل ہو جائے تو یہ "داخل" کا اقتضاء بن جاتا ہے اس سے خوشدلی کی فضا اور اطاعت شعاری کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا نے فرمایا تھا کہ بندہ راضی برضا تب ہوتا ہے جبکہ وہ مصیبت میں ویسے ہی خوش ہو جیسا کہ نعمت پانے پر خوش ہوتا ہے مراد یہ ہے کہ نعمت ہو یا مصیبت اُسے خالق کے ساتھ تعلق میں حائل نہیں ہونا چاہیے بلکہ مقامِ بندگی یہ ہے کہ ہر حکم ہر وقت تسلیم کیا جائے، حدیث مبارک میں ہے کہ "الرضاء بالقضاء باب الله الاعظم" (تفسیر مفاتیح الغیب المعروف تفسیر الرازی) اللہ کے فیصلوں پر راضی ہونا اللہ تعالیٰ کے بڑے دروازوں میں سے ہے یعنی قضا الٰہی پر رضا طلبی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بابِ عظیم ہے۔ تکلیف پر صبر کرنے، نعمت پر شکر کرنے اور احکامات الٰہیہ پر گردنیں جھکانے والوں کو آنحضرت ﷺ نے "عالم" کہا ہے کہ علم نافع رضا طلبی کے لئے ترغیب دیتا ہے اور صبر و شکر کے جوہر پیدا کرتا ہے۔ عربوں کے ہاں لڑکی کی پیدائش پر غم و اندوہ کا اظہار کیا جاتا تھا اور اسے قدرت کی ستم ظریفی سمجھا جاتا ہے قرآن مجید میں اس رویے کی مذمت کی گئی کہ یہ عدم اعتماد کا غماز ہے ارشاد ہوا۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٨﴾

(النحل:58)

کہ جب اُن میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جاتی ہے تو فرطِ غم سے اُس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غمگین ہوتا ہے۔

حدیث قدسی میں ارشاد ربانی ہے "میں خدائے واحد ہوں، میرے سوا کوئی

خدا نہیں۔ اگر تم میری طرف سے آئی ہوئی مصیبتوں پر صبر اور نعمتوں پر شکر اور میرے فیصلوں پر راضی نہ رہ سکو تو کوئی دوسرا رب تلاش کر لو"، (شعب الایمان امام البیہقی) الفاظ کی ترتیب اور حکم کی شدت، رضا الٰہی کی اہمیت واضح کر رہی ہے کہ جب خالق اور رب مان لیا ہے تو اب مناسب نہیں کہ اپنے خالق و پروردگار کی رضا کو مقدم نہ سمجھا جائے۔

رضا طلبی اسلامی تصوف کا مقصود ہے، تعلیمات و مسلسل تربیت سے انسان کے قلب و نظر کو رضا کا مقام تعلیم کیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اطاعت شعاری میں ایسی پختگی اور اس قدر استقامت آجائے کہ شکوہ یا گلہ پیدا ہی نہ ہو اور ہر آن نظریں اُس ذات اقدس پر مرکوز رہیں۔ یہ وہ مرتبہ ہے جہاں اطاعت، محبت میں بدل جاتی ہے اور خارج کا حکم داخلی حوالے سے طبعی رجحان کی شکل لے لیتا ہے۔ یہ انسانیت کی معراج اور عبدیت کا نقطہ کمال ہے۔ پھر سجدوں میں لذت اور قرب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

"رضا" کے بارے میں دو مختلف قسم کے نظریات پیش کئے جاتے ہیں، ایک دوں ہمتی کا مظہر ہے تو دوسرا اعتماد کی غلط تعبیر کا شاخسانہ ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی خواہشات مرغوب ہوتی ہیں اس لئے خواہشات کو دبانے اور اُن کی مخالفت میں رضا نہیں ہو سکتی زیادہ سے زیادہ صبر کیا جا سکتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نظریے کو حد اعتدال سے روگرانی کا مصداق قرار دیا ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی کا مشاہدہ ہے کہ خواہشات کے علی الرغم عمل دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ خواہشات ٹوٹنے کا غم ہو مگر رضائے محبوب یا مقصدِ عظیم کی خاطر اُس غم کو دبا لیا جائے یہ صبر ہے اور یہ عام انسان کی زندگی میں بھی جاری رہتا ہے اور اس پر قیاس کرکے رضا کے عدم حصول کا فتویٰ لگایا گیا ہے حالانکہ یہ عمومی معیار ہے اس سے بڑھ کر بھی ایک

کیفیت ہے جوخواص پر طاری ہوتی ہے کہ مقصد اسقدر عظیم ہو اور طلب مقصد اتنی قوی ہو کہ غم واندوہ کے تمام اثرات بے اثر ہو کر رہ جائیں یہ کامل سپردگی کی منزل اور شوقِ فراواں اور وارفتگی کا مقام ہے جو بعض اوقات عشق مجازی میں بھی جلوے دکھاتا ہے۔ زنانِ مصر کا حضرت یوسف علیہ السلام کے دیدار سے انگلیاں کاٹ لینا اور اُف تک نہ کرنا بلکہ اس کا احساس تک نہ ہونا قرآن مجید میں مذکور ہے رضا الٰہی جب وظیفہ بدن بن جاتی ہے اور خیالات واحساسات جب اس کے زیر سایہ پنپنے لگتے ہیں تو کوئی قوت بھی مزاحم نہیں ہوتی اس لئے خواہشات دم توڑ دیتی ہیں اور رضا تکمیل خواہش کا حاصل بن جاتی ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ رضا کا تقاضا ہے کہ کوئی کیفیت ہو اسکے ازالے کی خواہش نہ کی جائے، دکھ ہو تو ازالہ دکھ کی دعا نہ ہو، مصائب میں نہ جی برداشتہ ہو جائے اور نہ مصیبت سے رہائی کی طلب کی جائے۔ بظاہر تو یہ نظریہ رضا کو مرکز نظر اور محور خیال بنانے کا داعی ہے لیکن اس میں بندگی کے تقاضوں کی نفی ہوگئی ہے۔ دعا رضا کے مسلک کے خلاف نہیں اُس کی پختگی کا باعث ہے۔ بھوکا انسان۔ رزق کی تلاش کرے تو یہ بے صبری نہیں اور نہ ہی عدم رضا کا اظہار بلکہ یہ تو خاصہ بشریت ہے اس لئے عیب نہیں۔ گناہ سے نفرت بھی تو رضا ہی کا حصہ ہے، ظلم سے نفرت، امتحان سے بچنے کی آرزو دراصل رضا ہی کی مختلف شاخیں ہیں کہ ان رویوں سے عجز کا اظہار اور خالق کی عظمت کا اعتراف ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے بندگانِ رضا ہی کی زبان سے دعا کہلوائی ہے کہ۔

رَبَّنَآ اَخۡرِجۡنَا مِنۡ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ الظَّالِمِ اَهۡلُهَا ۚ (النساء:75)

کہ اے ہمارے رب ہمیں اس قریہ سے نکال لے جہاں کے رہنے والے ظالم ہیں، یہ دعا مقام محمود میں ہے اس لئے ازالہ مصائب کی دعا رضا کی نفی نہیں ہے۔

الغرض رضا سے مراد بندے کا اپنے خالق ومالک کے سامنے ہمہ تن سپرانداز ہونا ہے یہ قلبی انقیاد اور بدنی اطاعت ہے۔ اللہ کرے یہ مقام رضا ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد بنے آمین۔

قُرَّةُ عَيۡنِيۡ فِي الصَّلٰوةِ

(کتاب الشفاء)

اسلامی عبادات کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی ادائیگی سے فرائض کی بجا آوری کے اطمینان کے ساتھ انسانی روح ایک کیف بھی محسوس کرتی ہیں۔ فرض خارج سے عائد کیا ہوا حکم ہے جسے بہر طور اُس انسان کو پورا کرنا ہے جسے اُس کا مکلف بنایا گیا ہے لیکن اسلامی تصور عبادت میں یہ احکامات بتدریج یوں اثر پذیر ہوتے ہیں کہ خارج کا حکم بلآخر داخل کا تقاضا بن جاتا ہے، یہی وہ منزل ہے جہاں فرائض میں سرشاری کا عنصر نمایاں ہوتا ہے، انسان جو فرائض کو ادا کرنے میں ایک بوجھ محسوس کرتا تھا اب اُسے اس کے بغیر کسی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے، یہ تو واضح ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ خالقِ کائنات کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور ہے، شمس وقمر ہوں یا شجر وحجر سب کی جبین اُس آستانِ صمدیت پر جھکی ہوئی ہے مگر فرض کی بجا آوری کا حسن یہ ہے کہ فرض طبیعت کا اقتضاء بن جائے، فطرتِ انسانی خود بخود اس کی ادائیگی کا تقاضا کرے اور اس سے لطف اندوز ہو، قرآن مجید اس خودسپردگی اور اطاعت شعاری کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ جب زمین وآسمان کو بارگاہِ جلال میں جھکنے کا حکم دیا جائے گا کہ طوعاً یا کرھاً اسے بجالاؤ تو وہ پکار اٹھیں گے۔ ''اتینا طائعین'' (سورۃ حٰمٓ السجدۃ:11) کہ اے پروردگارِ عالم ہم تو اطاعت شعار بن کر حاضر ہیں کہ اس حاضری میں ناپسندیدگی کا کوئی عنصر موجود نہیں ہے۔ عبادت جب انسان کے

اپنے وجود کا مظہر بن جاتی ہے اور وہ اسے اپنے شرفِ انسانیت کا جزو لازم سمجھ کر اپنی تخلیق کے مقاصد میں شمار کرنے لگتا ہے تو یہ قلب ونظر کو تسخیر کر لیتی ہے اور انسان، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی حکمت کو پالیتا ہے کہ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات:56)

''اور ہم نے جن وانسان کو صرف عبادت کے لئے تخلیق کیا ہے۔ عبادت حاصلِ زندگی ہے اور اس میں تسکین مقصدِ تخلیق کی بجا آوری ہے۔

عبادات کی ظاہری اشکال کے اختلاف کی بنا پر ان کے اسماء متعدد ہیں۔ کسی خاص ہیت کی عبادت کو نماز کیا گیا تو دوسری کو روزہ، اسی طرح زکوٰۃ وحج کی عبادات اپنے مشتملات کے حوالوں سے مختلف قرار پائیں مگر ان سب کی روح ایک ہے اور وہ ہے خالق کے احکامات کو بجالانا اور اُس کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنا، جو خالق کہے اُس پر عمل کرنا اور جس سے روکے اُس سے باز آجانا، تعمیل ارشاد اور اطاعتِ غیر مشروط عبادات کی اساس ہے، ان عبادات میں نماز ایک ایسی عبادت ہے جو سنِ شعور سے تادم مرگ ہر ذی ہوش انسان پر فرض ہے۔ یہ ایک مسلسل عبادت ہے جس میں کہیں انقطاع نہیں اور اگر کہیں انسانی مجبوری حائل بھی ہو جائے تو اس کی قضا اس کے تسلسل کی علامت کے طور پر موجود ہے، نماز زندگی بھر کا عمل ہے۔ چند لمحے اپنی مصروف زندگی سے نکالنے اور اپنے خالق کے حضور حاضر ہونے میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ دنیاوی اعمال کو نماز کے وقفوں میں بانٹ دیا جائے تا کہ حاضری دربار کا خیال ہر عمل میں دامنگیر رہے، نماز کو دن کے اوقات میں یوں ترتیب دیا گیا ہے کہ محاسبہ نفس کا عمل لگاتار جاری رہے اور دنیا ودین کی ہم رکابی سے زندگی کا عمومی رویہ

صالح ہو جائے، یہ مسلسل تکرار ابتداء ایک بوجھ محسوس ہوتی ہے مگر استقامت سے اس میں لذت آشنائی کے جوہر نمو پانے لگتے ہیں اور آخر وہ منزل آتی ہے کہ خواہشِ نماز ہر لمحے بے چین کئے رکھتی ہے اور دنیا کے معاملات میں الجھا ہوا انسانی احساس نماز کے اوقات کو شمار کرنے میں حظ اٹھاتا ہے۔ اُسے نماز سکون کے لمحات اور خود شناسی کے مواقع مہیا کرتی ہے، یہی وہ کیفیت ہے جسے آنحضرت ﷺ نے قرۃ عینی فی الصلوٰۃ کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے کہہ کر واضح فرمایا ہے۔

عرب محاورہ کے مطابق قرۃ عینی یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک سے مراد وہ عمل ہے جس میں سکون نصیب ہوا، جو طبیعت کو بھلا لگے اور جس کی بجا آوری میں راحت وفرحت کا احساس ابھرے، ہر دل پسند عمل آنکھ کی ٹھنڈک ہوتا ہے، اگر صرف عرب کے عمومی لسانی ضابطوں کا خیال پیش نظر رہے تو حضور اکرم ﷺ کے ارشاد میں نماز کی محبوبیت کا تذکرہ ہے لیکن یہ حقیقت بھی لائق توجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں نماز کو مرکز عبادات اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس میں ''عبد'' کا اپنے معبود سے رابطہ استوار ہوتا ہے۔ سرِ تسلیم خم کرنا اور اپنی انا کے بت کو توڑ کر ناصیہ فرسائی کے تذلّل تک اُتر آنا شانِ عبدیت کا عملی اظہار ہے اس سے نخوت کافور ہوتی ہے اور پندار کا صنم کدہ ویران ہوتا ہے۔ یہ بظاہر بے بسی، بے چارگی اور درماندگی کی حالت ہے، انسان تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھا کر کانوں کو چھو کر عملاً یہ واضح کر رہا ہوتا ہے کہ اُس نے اس بے مصرف اور بے کار زندگی سے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور کان پکڑ کر یہ اعلان کر رہا ہے کہ وہ اپنے اعمال بد سے تائب ہو کر حاضر دربار ہوا ہے، رکوع اُس کی عاجزی اور سجود اُس کی بے سہارگی کا مظہر ہے، وہ مودب ہے۔ سب کو چھوڑ کر اپنے خالق

کے حضور مناجات اور استغاثوں کے کشکول لئے حاضر ہے، نظرِ کرم کا متمنی اور رحمت کا طلب گار ہے، دنیائے فانی کا نمائندہ اپنے خالق کے حضور جب اپنی شکستگی کا عملی اظہار کرتا ہے اور یہ عمل جب اُس کے خلوص کا عکس بن جاتا ہے تو دریائے رحمت جوش میں آتا ہے اور بندہ اپنے معبود کی رحمتوں سے سرشار ہو جاتا ہے یہ حضوری کا لمحہ ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ کہ بندہ سجدے کی حالت میں اپنے خالق سے قریب تر ہوتا ہے کہ یہ عبدیت کا نقطہ کمال ہے اور یہی معراجِ انسانیت ہے۔ حدیث مبارک میں آنحضرت ﷺ نے اسی نقطے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا ''الصلوٰۃ معراج المومنین'' (تفسیر المظہری سورۃ النور) نماز مومنوں کی معراج ہے، معراج کیا ہے؟ عبد کا اپنے معبود کے حضور حاضر ہونا اس طرح کہ کوئی پردہ حائل نہ رہے، سرتاجِ انبیاء ﷺ کی معراج یہ تھی کہ آپ حدودِ مادیت سے بہت آگے عرشِ الٰہی سے ماوراء خالقِ کل کے حضور یوں حاضر تھے کہ فاصلے سمٹ گئے اور قرآنی محاورے میں دو کمانوں کا فاصلہ بھی نہ رہا، یہ وصال کے لمحات فخرِ رُسل ﷺ کا شرف ہے۔ ایک مومن کے لئے معراج وہ سجدہ ہے جس میں قرب کا احساس ابھرے اور سجدہ گزار اپنے آپ کو مسجود کے حضور محسوس کرے، یہ عبادت کا حسن ہے جسے حدیثِ جبرئیل میں احسان کہا گیا ہے۔ فرمایا یوں عبادت کرو کہ تم اپنے معبود کو دیکھ رہے ہو اور اگر ابھی وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا تو کم از کم یہ احساس ضرور رہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے یہی حضوری ہے کہ حاضر دربار ہونے کا احساس ہو جائے کہ میں اپنے آقا کے حضور کھڑا ہوں اور میری حرکات وسکنات اُس کی نظروں میں ہیں۔ محروم وصال عاشق اور دل گرفتہ محب کا ارمان یہ ہوتا ہے کہ محبوب کی نظر کرم اُس

پر ہو، نماز میں یہ تصور بہر طور موجود ہے۔ مگر نماز کا حسن یہ ہے کہ محبت کی نظر بھی وصال آشنا ہو جائے اور مدت سے سرگرداں بصارت اور متلاشی نظر کو سکون حاصل ہو جائے، اسی کیفیت کو حضور اکرم ﷺ نے ''قرۃ عینی'' یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔ انوار الٰہیہ اور تجلیات ربانیہ کا نزول ہونے لگے اور رحمت کی آبشار ''عبد'' کو اپنے ہالے میں لینے لگے تو قلب حزین کو سکون اور بے تاب نظر کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ نماز، بندے اور خالق کے درمیان قرب کا زینہ ہے اور وصال کا ذریعہ ہے، اس لئے نماز کو دین کا حاصل، دین کا ستون اور آخرت کی اولین پرستش قرار دیا گیا ہے رسول اکرم ﷺ کا اندازِ تبلیغ ایسا منفرد ہے کہ ایک ایک جملے میں معانی کے دریا سمو دیئے گئے ہیں، آپ نے اپنی ذات کے حوالے سے اپنی پسند کا اظہار فرمایا اور نماز کو قرۃ العین قرار دیا اس سے امت کے لئے اشارہ تھا کہ وہ ذات جس کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے جو معصوم عن الخطاء ہے جس کی زندگی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصار میں ہے اور جسے ہر لمحہ الہامی روشنی حاصل ہے اُس بے عیب، پاک اور معصوم ذات کے نزدیک نماز کی یہ قدر و منزلت ہے کہ وہ صاحبِ معراج ہوتے ہوئے بھی ''قربِ خالق'' کے اس لمحے کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیتے ہیں تو امت کا عمل کیا ہونا چاہیے، کیا یہ خوشگوار لمحات اور وصال کی یہ ساعتیں ہر مسلمان کی زندگی کا حاصل نہیں ہونا چاہیں، اپنی ذات کے حوالے سے امت کو تعلیم دی کہ محبت وخلوص کے دعوے اطاعت و اتباع کا تقاضا کرتے ہیں۔ محبوب کا عمل محبوب ہونا چاہیے اس لئے اپنی زندگیوں کو نماز کی سعادت سے بہرہ مند کرنا ہے تا کہ نماز کی روحانی برکات جس کا منتہیٰ معراجِ انسانیت ہے حاصل ہو جائیں۔

حضور اکرم ﷺ کو نماز کی ادائیگی اور اس کی پابندی کا اس قدر خیال تھا کہ اس جہانِ فانی سے دار بقا کی طرف رحلت کے لمحات میں بھی جن اہم امور کی نشاندہی فرمائی ان میں نماز شامل تھی، اہلِ نظر کا کہنا ہے کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جو پوری زندگی کو محیط ہے۔ اس کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کے کان میں اذان و اقامت کی آواز آتی ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ اذان ہو چکی، اقامت کہی گئی اب اے نو وارِد جہاں فانی تیری نماز باقی ہے۔ اس پر مداومت کرنا ہر لمحہ اس کا خیال رکھنا جب وہ انسان اپنی بھرپور زندگی گزار کر اس دارِ فانی سے رخصت ہوتا ہے تو اُس پر جنازہ کی نماز بلا اذان و اقامت ادا کی جاتی ہے اس سے مترشح ہے کہ ابتداء اذان و اقامت سے تھی انتہاء نماز پر اس طرح ایک مومن کی زندگی ایک نماز کے کل میں ضم ہو جاتی ہے۔ نماز زندگی کا حاصل ہے اور عبادات میں سب سے بڑی عبادت، اس لئے اس کی بار بار تاکید فرمائی گئی، کبھی حکم کی زبان میں تو کبھی حکایت کے انداز میں مقصد ایک ہی تھا کہ نماز کو حاصل زندگی بنایا جائے۔

اللہ کرے کہ رسول ﷺ کے ارشادات کے مطابق نماز ہر مومن کے لئے آنکھ کی ٹھنڈک بنے اور اسے اس کی ادائیگی میں معراج زندگی نصیب ہو۔ آمین

مسجد القبلتین

مسجد اسلامی عبادات گاہ ہے جہاں اجتماعی طور پر صف بستہ ہو کر ایک امام کے پیچھے ایک سمتِ خاص کا تعین کر کے نماز ادا کی جاتی ہے، ''سمت مقررہ'' کا تصور ہر دین و مذہب میں رہا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی آمد سے قبل دیگر انبیاء کرام کی تعلیمات میں بھی صحت قبلہ کا حکم دیا گیا تھا۔ نبوت کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تو بیت المعمور کی مرکزیت کا تعین رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی معاونت سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں پتھروں کا ایک گھر تعمیر کیا اور لوگوں کو اس کے حج کی دعوت دی اور یہی آل اسماعیل علیہ السلام کا قبلہ قرار پایا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں کثیر تعداد میں انبیاء تشریف لائے۔ بیت المقدس تعمیر ہوا۔ ہیکل سلیمانی مرکز توجہ بنا اور انبیاء بنی اسرائیل اسی کی طرف منہ کر کے عباداتِ الٰہیہ انجام دیتے رہے، حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو نماز میں بیت المقدس قبلہ تھا روایات کے معمولی اختلافات کے باوجود یہ ثابت ہے کہ آپ نے مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرمائی، دین حنیف کے داعی اور ملت ابراہیم علیہ السلام کے برگزیدہ رسول ہونے کے ناطے آپ کی خواہش تھی کہ قبلہ خانہ کعبہ قرار پائے۔ یہ قلبی تمنا تھی جو دل ہی دل میں مچل رہی تھی اور اس نے لفظوں کا حرفی لباس نہ اوڑھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کی اس خواہش کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا،

قرآن کی آیت مبارکہ اس اچٹتی نظر کے دلفریب منظر کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر گئی ارشاد ہوا۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ (البقرہ:144)

بے شک ہم نے آپ کا آسمان کی جانب اٹھتا ہوا چہرہ دیکھ لیا ہے پس آپ اُسی قبلہ کی طرف رخ کر لیں جسے آپ پسند کرتے ہیں پس آپ اپنا چہرہ مسجد الحرام کی طرف پھیر لیں۔ تمنا ابھی پیش نہ کی گئی تھی کہ دل کی مراد بھر آئی تحویل قبلہ کا معیار رضائے حبیب ﷺ کو قرار دے دیا گیا رضا کیا تھی، یہی کہ مسجد حرام مرکز عبادت بن جائے چنانچہ اسی کی جانب سجدہ ریز ہونے کا حکم آ گیا، یہ تحویل قبلہ کئی حکمتوں کا امین اور بہت سی آزمائشوں کا باعث بنا، خانہ کعبہ مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا اور ہمیشہ کے لئے حکم دے دیا گیا کہ مسلمان جہاں بھی ہوں اسی کی طرف منہ کریں، سمت قبلہ کا تعین علمی ریسرچ کا موضوع بنا اور عبادت کی قبولیت کی شرط قرار دیا گیا۔

تعجب انگیز اطمینان کا باعث یہ واقعہ ایک نماز کے دوران میں پیش آیا، روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ بنو سلمہ کی ایک خاتون اُم بشر جس کا نام سلافہ تھا کے ہاں ایک دعوت میں شریک تھے، کھانا تناول فرما رہے تھے اور بعض مسائل پر گفتگو بھی ہو رہی تھی کہ نماز ظہر کا وقت ہوا۔ آپ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بنو سلمہ کے علاقے میں ایک مسجد میں نماز ظہر کی امامت کرائی۔ اکثر علماء اس کو بنو حرام کی مسجد سمجھتے ہیں مگر تحقیق سے ثابت ہے کہ یہ دو مختلف مسجدیں ہیں اگرچہ ایک ہی علاقے میں ہیں یہ جگہ مسجد فتح سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ہے اس کے قرب ہی مشہور کنواں بئر رومہ ہے اور یہ وادی عقیق سے بھی قریب جگہ ہے۔ مدینہ منورہ سے یہ

مقام پیدل سفر کرنے والوں کے لئے پون گھنٹہ کے فاصلے پر ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز ظہر ادا فرما رہے تھے رُخ بیت المقدس کی جانب تھا اور نظر بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی کہ تحویل قبلہ کا حکم آیا آپ دو رکعت پڑھ چکے تھے کہ رُخ بیت المقدس سے مسجد حرام کی جانب پھیر لیا، صحابہ نے دیکھا تو اقتداء کی۔مرد عورتوں کی صف میں ہٹ گیا اور عورتیں مردوں کی صف میں آئیں کہ رُخ بالکل دوسری جانب ہو چکا تھا۔ چنانچہ باقی دو رکعتیں آپ نے بیت اللہ کی طرف منہ کر کے ادا کئیں۔اس طرح ایک نماز دو حصوں میں بٹ گئی اور ایک ہی جماعت میں دو قبلوں کی طرف رُخ کیا گیا۔اس عظیم واقعہ کی وجہ سے اُس مسجد کو مسجد قبلتین یعنی دو قبلوں والی مسجد کہنے لگے۔ یہ نام اس قدر معروف ہوا کہ چودہ سو سالوں سے اس مسجد کا یہی نام ہے۔تحویل کعبہ کی خبر تیزی سے پورے مدینے میں پھیل گئی، جہاں خبر پہنچی قبلہ تبدیل ہوتا گیا۔ مسجد قبا میں فجر کی نماز میں اطلاع ملی تو شام کی طرف رخ تھا مگر فوراً کعبہ کی طرف کر لیا گیا۔ یہ واقعہ 15 رجب ہجرت کے سترہ ماہ بعد سوموار کے روز پیش آیا۔ یہ مختصر سی مسجد ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دونوں اطراف میں محراب کے نشان تھے مگر اب موجود نہیں ہیں کیونکہ متعدد بار اس مسجد کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہ مسجد زائرین مدینہ کی توجہ کا مرکز ہے، نوافل ادا کرنے والوں کی کثیر تعداد وہاں ہر وقت موجود رہتی ہے، سادہ سی مسجد میں تاریخ انسانیت کا عظیم واقعہ محفوظ ہے اور وہاں حاضری پر رضائے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت اور ملت ابراہیم علیہ السلام سے امت مسلمہ کی وابستگی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ یہ مسجد قبلہ نما ہے اور ہر مسلمان کو امت کو انفرادیت اور مرکزیت کا درس دیتی ہے۔ چشمِ تصور یہاں صدیوں کی تاریخ کو مشاہدہ کرتی ہے۔ تلاش حقیقت کی تڑپ رکھنے والے کے لئے ہدایت کا سامان ان پتھروں میں ودیعت ہے اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دے۔ آمین

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلسلہ نبوت کے خاتم ہیں اور منصب رسالت کے تاجدار ہیں اس لئے آپ کی نبوت سلسلہ انبیاء کی معراج ہے، انسانی فلاح کا سارا اہتمام اپنے عروج پر ہے اب صرف اور صرف ایک وجود ہے جو پیغام رسانی کی تکمیل کا نشان بھی ہے اور عروج آدم خاکی کا آخری اور لازمی وسیلہ بھی، اسی لئے اب سلسلہ نبوت ختم ہوگیا کہ نبوت آخری حد تک آگئی، اب کسی اور کی تلاش نہ ہوگی کہ دربدری ختم ہوئی ایک امام ایک راہنما ایک اسوہ اور سب سے بڑھ کر ایک نجات دہندہ اب سب کی ضرورت بھی آپ ہیں اور سب کے لئے دارین میں کامرانیوں کا ذریعہ بھی آپ ہیں علامہ مرحوم ہی سے سنتے ہیں۔

پس خدا برما شریعت ختم کرد ‏ ‏ ‏ بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را ‏ ‏ ‏ او رُسل راختم وما اقوام را
لانبی بعدی زاحسان خدا است ‏ ‏ ‏ پرورده ناموسِ دیں مصطفی است